سندھ میں اُردو

ڈاکٹر شاھدہ بیگم

اُردو اکیڈمی سندھ
کراچی

سندھ میں اُردو

سندھ کی تہذیب قدیم ترین ہے۔ اس کا شاندار ماضی گرد آلود دھندلکوں میں چھپا ہوا ہے۔ گو وادئ مہران کی تہذیب و تمدّن اور ثقافت پر خاصا کام ہو چکا ہے تاہم ابھی بہت کچھ ہونا باقی ہے۔ سندھ سے اُردو کا تعلق بعض حلقوں میں متنازعہ فیہ مسئلہ بنا کر پیش کیا جاتا رہا ہے۔

اس موضوع پر ابھی تک کوئی قابلِ ذکر تحقیقی کام نہیں ہوا تھا ضرورت اس امر کی تھی کہ وادئ مہران میں اُردو کی نشوونما اور اس کے ارتقاء پر سے پردہ اٹھایا جائے۔

زیرِ نظر مقالہ اسی موضوع پر ایک کامیاب کوشش ہے۔ سندھ میں عہدِ قدیم سے دَورِ حاضر تک اُردو نظم و نثر کی بتدریج ترقی کو اس کتاب میں ڈاکٹر شاہدہ بیگم نے اس طرح سمیٹا ہے کہ ہر دَور کی تصویر کشی معلوم ہوتی ہے۔

دَورِ جدید کے سائنٹفک انداز میں اس موضوع پر یہ واحد کتاب ہے جو اُردو ادب کے طالب علموں کو خاصا تحقیقی مواد فراہم بھی کرتی ہے اور اُردو کے تربیتی گہواروں میں سندھ کی جگہ کا تعین بھی کرتی ہے اور اُردو زبان کے ارتقا کے ساتھ ساتھ اس علاقہ میں مسلم تہذیب و تمدّن کے مختلف اَدوار کی عکاسی بھی کرتی ہے۔

سندھ
میں
اردو

سندھ میں اردو

ڈاکٹر شاہدہ بیگم

اردو اکیڈمی سندھ
بہادر شاہ مارکیٹ۔ ایم اے جناح روڈ۔ کراچی

Scanned with CamScanner

مقالہ زیر ہدایت ڈاکٹر فرمان فتح پوری مکمل ہوا
اس پر جامعہ کراچی نے مصنفہ کو پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی ۔

کتابت ـــــــ خالد محمود صدیقی ۔ رشید شاہد

تاریخ اشاعت ـــــــ جون ۱۹۸۰ء

تعداد ـــــــ ایک ہزار

مطبوعہ ـــــــ باب الاسلام پرنٹنگ پریس ۔ کراچی

قیمت

انتساب

آغا حسن عابدی
کے نام
جن کا علمی پس منظر
میرے ماضی
کا سرمایہ ہے

شاہدہ

فہرست

✿

یہی وہ شعور ہے جس نے اس مقالے کو دوسرے مقالوں سے مختلف بنا دیا
ہے۔ اس مقالے کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس میں شروع سے آخر تک
ایک نقطۂ نظر ملتا ہے جو عام طور پر تحقیقی مقالوں میں ڈھونڈے سے بھی
نہیں ملتا۔ اس مقالے کی تیسری خوبی یہ ہے کہ ڈاکٹر شاہدہ بیگم نے
عام بول چال کی زبان کو ادبی سطح پر استعمال کیا ہے اور کیونکہ انھیں
اپنے موضوع پر عبور حاصل ہے اس لیے اسلوب بھی صاف ستھرا اور
سادہ ہے۔ اس مقالے میں ابتدا سے لے کر عہد حاضر تک
سندھ میں نظم اور نثر کے ارتقا کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے
یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کے مطالعے سے سندھ میں اردو کے ارتقا
کی ایک واضح تصویر سامنے آ جاتی ہے۔ میں ڈاکٹر شاہدہ بیگم کو اس
مقالے کی تصنیف پر مبارکباد دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ان کی یہ
پہلی کتاب آخری کتاب ثابت نہیں ہوگی۔

جمیل جالبی
۱۶ مئی ۸۰ء

ابتدائیہ

ڈاکٹر شاہدہ بیگم ایک مشرقی خاتون ہیں اور بدلتے ہوئے ماحول کے ساتھ انھوں نے روایت و درایت کا پاس رکھا ہے۔ وہ ایک کالج میں استاد کے فرائض انجام دے رہی ہیں اور اپنے شاگردوں میں مشفق سمجھی جاتی ہیں۔

زیرِ نظر مقالہ میں ڈاکٹر شاھدہ نے بڑے سلیقہ سے وادیٔ مہران میں اُردو کے ارتقاء کا جائزہ لیا ہے۔ بڑی محنت اور لگن سے سندھ کے ریگ زاروں میں چھپے ہوئے جواہر پاروں کو کھوج کر نکالا ہے اور اُسے سائنٹفک انداز میں تحقیق کے اصولوں پر پرکھ کر یکجا کیا ہے۔ عہدِ قدیم سے دَورِ حاضر تک وادیٔ مہران کے ثقافتی، علمی، ادبی

اور تمدنی ہر گوشہ پر گہری نظر ڈالی ہے اور ہر پہلو پر منطقی غور کرنے کے بعد اس کتاب میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر صاحبہ کے انداز بیان اور طرز نگارش میں زباندانی کی شگفتگی اور اہل زبان کا نکھار شامل ہے جو بزرگوں کی صحبت اور ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنے پر ہی حاصل ہوتا ہے۔

زیر نظر تصنیف اپنی علمی اور ادبی خوبیوں کی وجہ سے پاکستانی ادب میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ یہاں اُردو کے ارتقاء پر جو کچھ بھی کام ہوا ہے اس کا حصہ سندھ کی حد تک قابل ذکر نہ تھا درانحالیکہ سندھ میں صدیوں سے مسلم ثقافت کی جڑیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی رہیں تاہم یہاں جو بھی کام ہوا تھا وہ بکھرا ہوا تھا۔ وقت کی اہم ضرورت یہ بھی تھی کہ کوئی آگے بڑھے اور مستقل مزاجی سے کام کرے۔ ڈاکٹر شاہدہ نے وقت کے اس چیلنج کو قبول کیا اور محنت شاقہ سے اُردو ادب کے اس زرین باب کی تدوین کی جو ہمیشہ ان کے نام

سے منسوب رہے گا۔

اِس تحقیقی مقالے میں مصنفہ نے نقاد کی حیثیت سے موقع اور محل کی مطابقت سے احتساب کی چھلنی میں چھان پھٹک کر ایسے گوشوں پر سے پردہ اٹھایا ہے جو اب تک اندھیرے میں تھے۔

تہذیب و تمدن کے صدیوں پر محیط اثرات ادبی تاریخ پر مرتب ہوتے رہتے ہیں اور زمانہ ہر اُفتاد اور ہر تغیر سے بے پرواسب کچھ اپنے دامن میں سمیٹے آگے ہی کی طرف بڑھتا رہتا ہے، یہ کتاب اردو کے ایسے ہی عظیم الشان سفر کا جائزہ پیش کرتی ہے جس پر جامعہ کراچی نے شاھدہ بیگم کو ڈاکٹر شاہدہ بنا دیا۔

میرے لیے پیش لفظ کے چند الفاظ لکھنے اس لیے کٹھن تھے کہ کل کی ہونہار بچی نے جسے ان کے والد محترم کے توسط سے جانتا پہچانتا تھا، اب اپنی محنت، کوشش اور تجسس سے اردو ادب میں ایک ایسا مقام حاصل

کرلیا ہے جب سے اس کا تشخص قائم ہوگیا ہے اور
وہ بزرگوں کی صف میں داخل ہوگئی ہے۔ خوشی
کے اظہار کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔

خدا کرے ان کے قلم میں اور زور پیدا ہو
اور اُردو کی خدمت کے لیے انکی عمر دراز ہو

آمین

دُعاگو

صلاح الدین ۸۱

سرنامہ

"سندھ میں اردو کا ارتقاء" اس سلسلۂ تحقیق کی ایک کڑی ہے جس کے تحت "پنجاب میں اردو"، "بہار میں اردو"، "میسور میں اردو"، "بمبئی میں اردو" "دکن میں اردو"، "بنگال میں اردو"، "گجرات میں اردو" اور "بلوچستان میں اردو" جیسی کتابیں لکھی گئیں۔

"دلّی کا دبستان شاعری" اور "لکھنو کا دبستان شاعری" بھی کم و بیش اسی نوع کی تصانیف ہیں اور بعض دوسری کتب بھی اسی طرح کی معرض وجود میں آئی ہیں، جن میں اردو کے علاقائی ادب کا جائزہ لیا گیا ہے اور جغرافیائی حدود کے تعین کے ساتھ اردو کی تدریجی ترقی کو پیش کیا گیا ہے۔ سندھ کی حد تک یہ پہلی اجمالی یا مکمل کوشش ہے۔ بلاشبہ اس سے قبل بعض کتب لکھی جا چکی ہیں، جن میں اردو نظم و نثر کا سرمایہ علیحدہ علیحدہ یکجا کیا گیا ہے لیکن میرا مقالہ سارے صوبہ سندھ کی نثر و نظم کا پورا احاطہ کرتا ہے۔

سندھ سے اردو کا قدیمی تعلق ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہے لہٰذا لسانی جائزے میں تہذیب و ثقافت کا لپیٹ میں آجانا ناگزیر تھا اور عربوں کی آمد سے اِس وقت تک کے تاریخی اور سیاسی انقلابات کا تجزیہ تحقیق کا ایک اہم ترین تقاضا تھا۔ میں نے اس کو محسوس کیا اور سب سے پہلے جغرافیائی اور تاریخی پس منظر میں لسانی

تغیرات کی بساط پر اُردو کے نقوش اَوّلیں کو تلاش کرنے کی کوشش کی جو مقالے کا ابتدائیہ ہے۔

تہذیبوں اور قوموں کی باہمی آمیزش کا نتیجہ ہر دور اور ہر خطّے میں یکساں برآمد ہوا ہے اور مروجہ زبانوں میں نئے نئے الفاظ بنتے رہے ہیں چنانچہ سندھ میں بھی ایسا ہی کچھ ظہور پذیر ہوا اور عربی، فارسی اور مقامی بولیوں کے اختلاط سے بعض الفاظ وجود میں آئے جو عام و خاص سب کے لئے قابلِ فہم تھے۔ ایسی ہی کچھ صورت حال آگے چل کر پنجاب میں پیش آئی پھر ان الفاظ کا دائرہ استعمال وسیع سے وسیع تر ہوتا رہا اور اس کی حدود ایک طرف دکن، دوسری طرف گنگا جمنا کے دو آبے سے گومتی کے کناروں تک پھیل گئیں۔

مماثل اور غیر مماثل الفاظ کی تحقیق ایک بنیادی کام تھا جس کے بعد ان کے ادوار اور احاطۂ استعمال پر نظر ڈالی گئی اور سندھ اور پنجاب وغیرہ کے ماضی میں اردو کی جڑوں کو کریدا گیا۔ پھر مختلف علاقوں میں اردو کی اٹھان کا تقابلی جائزہ لیا گیا جہاں سے صحیح معنیٰ میں مقالے کا آغاز ہوا۔

اس کے ساتھ ہی وہ زمانہ آگیا جب دکن میں قلی قطب شاہ کے ہاتھوں اردو شاعری کا چراغ روشن ہو چکا تھا اور سندھ میں میر فاضل بکھری اور شاہ کریم بلڑی اس کی بنیادیں استوار کر چکے تھے۔

اردو اساسی طور پر ہندوستان کے کسی حصّے میں بھی خواص کی رہین منت نہیں رہی تھی۔ یہ ایک عوامی زبان تھی، عوام میں پیدا ہوئی تھی اور عوام ہی نے اس کی پرورش کی تھی۔ خانقاہیں اور مراکز تبلیغ اس کے مستقر تھے لہٰذا سندھ میں بھی اس کی اٹھان ایسی ہی کچھ ہوئی اور وہ سندھی سے ہم آہنگ ہو کر آگے بڑھتی رہی پھر دلی اور لکھنؤ کی طرح سندھ میں بھی امرا کی طرف سے اس کی سرپرستی کی گئی مگر دوسرے علاقوں میں اس کی حیثیت ثانوی تھی۔ سندھ میں اس کا درجہ فارسی اور سندھی کے بعد تھا اس لئے شاعرانہ بساط پر اس کو پیچھے رہ جانا چاہیئے تھا۔

لیکن نتیجہ تحقیق میں کوئی دور ایسا نہیں ملتا جس میں سندھ نے اردو کے بلند پایہ شاعر پیدا نہ کئے ہوں۔

شاعروں کی تعداد اگرچہ مقابلتاً کم ہے پھر بھی تقسیم سے قبل تک اٹھاسی[۹۸] شاعروں کا سراغ لگ سکا ہے۔ جن میں ایک تعداد ایسی بھی ہے جسے شمالی ہند کے شعراء کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے۔ سرفہرست ملا عبدالحکیم عطا ٹھٹھوی کا نام ہے جو سندھ کے ولی یا قلی قطب شاہ ہیں۔ اس کے بعد جو سلسلہ آگے بڑھتا ہے تو اردو شاعری کے کتنے ہی قطب نظر آتے ہیں۔ بیدرالدین ابوتراب کامل، میر محمود صابر، ثابت علی شاہ، سچل سرمست، محمد فضل ماتم، غلام محمد گدا، میر علی نواز تالپور وغیرہ۔ جنہوں نے میر و غالب سے ہمسری کا دعویٰ تو نہیں کیا مگر وقت مساعد ہوتا تو دلی اور لکھنو کی فضا میں ان کا کلام خراجِ تحسین ضرور حاصل کرتا۔

تعدادِ شعراء کی کمی کچھ تو مرکزی ہندوستان سے سندھ کی دوری کے سبب ہے اور کچھ اس لئے بھی کہ سندھ کی پہلی عوامی زبان سندھی تھی۔ ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "وادیٔ سندھ کا قدیم تاریخی ریکارڈ یا نوشتے مختلف خارجی حملوں کی وجہ سے بوجہ امتداد زمانہ قطعی ضائع ہو چکے ہیں" اور کچھ ہوں گے بھی تو وہ کونوں کھدروں میں جوہر شناس نظروں سے دور پڑے ہوں گے جو کسی اتفاقی موقع پر روشنی میں آ سکتے ہیں۔

اس پر مستزاد وہ احتیاط ہے جو انتخاب شعراء میں کی گئی ہے

میر فاضل بھکری اور شاہ عبدالکریم روایتی طور پر اردو کے پہلے شاعر کہے جاتے ہیں لیکن میر فاضل کا کلام دستیاب نہیں ہے اور شاہ کریم سے جو شعر منسوب

ــے "مقدمہ صوفیائے سندھ اور اردو" از پیر حسام الدین راشدی صفحہ ۱۲ مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۷۳ء

ہے وہ تحقیق کا محتاج ہے لہٰذا انھیں شامل نہیں کیا گیا۔ اگرچہ ضمنی ذکر کئی جگہ آیا ہے۔ شعراء کی ایک تعداد وہ بھی ہے جس نے ہندی بحور و اوزان میں طبع آزمائی کی ہے، انھیں بھی نظر انداز کر دیا گیا ہے حالانکہ ان کی شاعری کا مزاج بعض اعتبار سے صدفی صد اردو ہے مگر ہندی زمین کے شعروں کو فی زمانہ ہندی کہہ دیا جاتا ہے اس لئے انھیں نکال دیا گیا جس کے بعد سندھ کی لسانی ٹکسال کے صرف کھرے سکے ہی رہ جاتے ہیں جو ہر لحاظ سے اردو کی میزان شاعری پر پورے اترتے ہیں۔

اس طرح شعراء کی تعداد مختصر سے مختصر تر ہو گئی اور سابقہ فہرست میں کافی کمی آ گئی جس کو نئے شاعروں کا سراغ لگا کر پورا کیا گیا بلکہ اس میں اتنا اضافہ کر دیا گیا کہ اب جو تعداد پیش کی جا رہی ہے وہ سابقہ تحقیق کی ڈیوڑھی ہے۔ یہی صورت حال تقسیم کے بعد کے شاعروں کی ہے۔ ان میں تو انتخاب ہی بڑا دشوار تھا کیونکہ سندھ کے پچاس فی صد سے زائد ادیب و شاعر اردو میں لکھتے ہیں یا شعر کہتے ہیں اس لئے یہ فیصلہ آسان نہ تھا کہ کس کو لیا جائے کس کو چھوڑا جائے۔ آخر طے یہ کرنا پڑا کہ منتخب صرف ان ہی کو کیا جائے جن کا کام کسی مقدار میں ہو یا کم از کم کچھ وقعت ہی رکھتا ہو۔

اسی معیار پر ۲۴۰ شاعر اور ۶۳ نثر نگار پورے اترے جن کو شامل مقالہ کیا گیا۔ تقسیم سے قبل کے نثر نگاران کے علاوہ ہیں جن کی تعداد صرف ۴ ہے جو حد درجہ مایوس کن ہے اور جس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا پڑتا ہے کہ سندھ میں اردو نثر کا رواج بہت کم تھا حالانکہ بعض حقائق اس کی تردید کرتے ہیں۔ منصورہ اورنٹیل کالج میں دو سو سال پرانا بھگوت گیتا کا جو ترجمہ موجود ہے وہ دلیل ہے اس بات کی کہ سندھ کے ہندو مسلمان سب اردو لکھتے پڑھتے تھے اور بعض بزرگوں کی اردو میں خط و کتابت کرنے کی شہادتیں بھی ملتی ہیں۔ اس سے یہ خیال باطل ٹھہرتا ہے کہ اہلِ سندھ کو اردو نثر سے کوئی

دلچسپی نہ تھی۔

سبب بدیہی طور پر نشر و اشاعت کی کمی کا معلوم ہوتا ہے جو ایک حقیقت ہے کہ سندھ میں کتابوں کی طباعت انگریزی دور کے بعد شروع ہوئی اور رفتار بھی بہت سست رہی۔ ایسا ہی کچھ حال صحافت کا بھی تھا۔ انگریزی، سندھی اردو کوئی اخبار انیسویں صدی عیسوی کی چھٹی دہائی سے پہلے نہیں نکلا۔ اردو کا پہلا اخبار دوربین تھا جس کو مرزا مخلص علی کے چھوٹے بیٹے مرزا محمد جعفر نے قیاساً ۱۸۵۵ء میں نکالا تھا۔ اس کے بعد ہفتہ وار، پندرہ روزے اور ماہنامے سب ہی جاری ہوتے۔

سندھ کی اردو صحافت ہمیشہ ہندوستان کی مسلم سیاست کے محور پر گھومتی رہی ہے کیونکہ اہلِ سندھ کی حریت پسندی نے کبھی انھیں کسی مسلم تحریک سے الگ رہنے نہ دیا اور یہی وجہ اردو سے ربط کی بھی ہے کیونکہ مذہبی کتب اور تحریکوں کا لٹریچر بیشتر اردو ہی میں ہوتا تھا ـــــــ مگر ان حقائق کے باوجود سندھ نشر و اشاعت میں آگے بڑھ نہ سکا۔ اسی لئے ماضی میں نثر نگاروں کی بھی کمی رہی اور اردو کتابیں بھی کم ہی چھپیں پھر بھی سیکڑوں کی تعداد میں مطبوعہ کتب کا سراغ لگ چکا ہے اور لگ بھگ اسی تعداد میں اردو مخطوطات کی موجودگی ثابت ہو چکی ہے جس کا ایک اجمالی خاکہ شامل کر دیا گیا ہے۔

مقالے کا آغاز ثقافتی اور لسانی اختلاط سے کیا گیا تھا جس کے نتیجے میں مستقبل کی ایک انجانی زبان کے الفاظ وجود میں آئے تھے۔ لہٰذا بدیہی طور پر مقامی زبان کو بھی متاثر ہونا چاہیے تھا۔ اس اثر پذیری کا کا سلسلہ یقیناً پہلے دن سے شروع ہو گیا تھا اور آج تک جاری ہے لہٰذا ربطِ تحریر میں جابجا اس پر روشنی ڈالی جاتی رہی اور آخر میں صریحی طور پر واضح کرنے کی کوشش کی گئی کہ اردو اور سندھی نے کس حد تک ایک

دوسرے کے اثرات قبول کئے اور ان کے مابین آپس میں کتنی قربت یا کس قدر فصل ہے۔

یہ گویا ایک طرح پر سندھ میں اردو کی داستان کا آئینہ ہے جس میں ماضی سے حال تک کی روداد مضمر ہے اور جس سے سندھ میں اردو کا مستقبل بھی روشن ہوتا ہے۔ اس کام کے سلسلے میں مجھے کن کن مشکل مرحلوں سے گزرنا پڑا اس کی تفصیل میں نہ جاؤں گی۔ صرف یہ عرض کروں گی کہ وہ سب کچھ کیا گیا جس کے بغیر ایسے کام مکمل نہیں ہوتے۔ ہاں یہ معروضہ ضرور پیش کروں گی کہ بعض شخصیتوں کی سرپرستی اور اعانت حاصل نہ ہوتی تو یہ بیل منڈھے چڑھ نہ سکتی۔

ان میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری، افسر امروہوی، ڈاکٹر جمیل جالبی، اختر انصاری اکبرآبادی، ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی، عبدالرزاق راز، عثمان ڈیپلائی وغیرہ سرِفہرست ہیں۔ یوں تو بہت سے لوگ ہیں جن کی میں شکرگزار ہوں۔ ایک تعداد ان کی ہے جنھوں نے وقت دے کر تبادلہ خیالات کا موقع دیا۔ کچھ لوگوں نے خطوط کے جوابات عطا کرکے احسان فرمایا، کچھ نے مشورے بھی دیئے اور کتابیں بھی جیسے علاؤالدین خالد، نادم سیتاپوری، نسیم امروہوی، سید ابن حسن قیصر، مصطفیٰ علی بریلوی، مولانا رزمی جے پوری، الیاس عشقی، ڈاکٹر محمد ابراہیم خلیل، میرزا اسد بیگ، مولانا عبداللہ اثر، حافظ خیر محمد اوحدی، حبیب اللہ بھٹو، پروفیسر غلام احمد بدوی اور یوسف شاہین وغیرہ۔

مقالہ میں جو کچھ ہے، وہ پیشِ نگاہ ہے۔ اس میں بالاجمال موضوع کے ہر گوشے کا احاطہ کرلیا گیا ہے اور سندھ میں اردو کی پوری تاریخ منضبط ہوگئی ہے۔

سندھ کا تاریخی، تہذیبی اور لسانی پس منظر

سندھ آج پاکستان کے ایک صوبے کا نام ہے، جو خطِ سرطان کے شمال ۲۳ اور ۲۹ عرض البلد، ۶۷ اور ۷۱ طول البلد کے مابین ۵۰۳۹۷ مربع میل پر پھیلا ہوا ایک چھوٹا سا خطۂ ارض ہے لیکن کبھی اس کی حدیں ایک طرف عمان بلکہ پنجاب اور کشمیر تک اور دوسری طرف لسبیلہ اور مکران کو اپنے دامن میں لئے تھیں۔

اس کی علیحدہ حکومت تھی اور جداگانہ تہذیب۔ اور اگر یہ کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا کہ زمانۂ قدیم میں سندھ ایک ایسی تہذیب کا نام تھا جو بابل و نینوا، مصر و ایران یا چین کے ہم پلہ تھی، جس کی تصدیق کوٹ ڈیجی اور موئن جو دڑو کے کھنڈروں سے ہوتی ہے۔

سندھ کی تاریخ بلاشبہ ماضی کے گرد آلود دھندلکے میں چھپی ہوئی ہے اور دوسری قدیم تہذیبوں کی طرح اس کی پرانی ثقافت بھی تحقیق کی محتاج ہے۔ حتیٰ کہ اس کی وجہ تسمیہ کے سلسلے میں بھی کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی۔ پھر بھی قدماء کی مختلف آراء کو سامنے رکھا جائے تو ایک رائے ابوالقاسم فرشتہ کی بھی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

(ارشد بن یافث) "بیٹا ارشد کا حام کہ ہند نام رکھتا تھا، ملک

ہند سانٹھ اس کے موسوم ہے۔ اس کا بھائی سند ملک سندھ میں فروکش ہوا، شہر ٹھٹھہ اور ملتان اپنے فرزندوں کے نام پر بنا گیا" [۱]

میر علی شیر قانع کی رائے غالباً فرشتہ کی رائے کی تابع ہے۔ وہ تحریر کرتا ہے۔

"ملک سندھ کا نام حام بن نوح علیہ السلام کے فرزند ہند کے بھائی سندھ کے نام پر مشہور ہوا۔" [۲]

مولانا سید ابوظفر ندوی نے انڈین امپائر مصنفہ ہنٹر کے حوالے سے لکھا ہے۔

"آریہ قوم نے جب سندھ کی وادی میں قدم رکھا تو اس کا نام سندھو رکھا کیونکہ سندھو ان کی زبان میں دریا کو کہتے ہیں اور دریائے سندھ کی مناسبت سے وہ پورے ملک کو سندھو پھر سندھ کہنے لگے۔ سندھ کے ادھر جتنے ملک فتح کئے، سب کا نام سندھ ہی رکھا۔ یہاں تک کہ پنجاب کی سرحد سے بھی آگے بڑھ گئے مگر نام میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔" [۳]

وجہ تسمیہ میں ایک اضافہ یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ سمندر کے دیوتا کا نام سندھو ہے۔ گزیٹیر آف سندھ میں "مہران آف سندھ" کے مصنف ریورٹی اور پلینی کی رایوں کے حوالے سے یونانیوں کے رکھے ہوتے نام Sindus

---

۱۔ تاریخ فرشتہ صفحہ ۱۲ مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۳۳ء

۲۔ ترجمہ تحفۃ الکرام صفحہ ۳۰ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ کراچی اشاعت ۱۹۵۹ء

۳۔ تاریخ سندھ صفحہ ۱ مطبع المعارف اعظم گڑھ ۱۹۴۷ء

سے بحث کی گئی ہے اور ہند ، سندھو اور اندو کو قریب المخرج بتایا گیا ہے۔ ؁۴ فرشتہ نے بھی یہی نام بنیادی قرار دیتے ہیں اور ہندوستان کے مختلف حصوں کے جو نام ہیں انھیں بھی حضرت نوحؑ کی اولاد کے ناموں سے منسوب کیا ہے۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے بیان کے مطابق :۔

"لفظ سندھ کا صوتی تغیر لفظ ہند کے استعمال کا باعث بنا سندھ سنسکرت کے لفظ سیاند سے اخذ کیا گیا ہے جس کے معنی بہنے کے ہیں اور سندھو دریائے سندھ کا نام ہے۔ سیاند سے سندھ اور ہند کے نام نکالے گئے علم اللسان کی رو سے ہندوستان دراصل دریائے سندھ کی سرزمین ہے۔ ایسی مثالیں موجود ہیں کہ ہند اور سندھ کو ہم معنی الفاظ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ ان الفاظ کے درمیان امتیاز و تفریق رفتہ رفتہ ایک عرصہ بعد ہوئی۔ ؁۵

اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کچھ دشوار نہ ہوگا کہ سندھ کا نام حقیقتاً ہزاروں سال سے سندھ ہی تھا جو آریاؤں کی آمد پر سندھو بن گیا اور یونانیوں نے سندھ کے حروف کو مقدم موخر اور مخلوط کر دیا اور وہاں کے دریا کا نام اندس لکھ دیا جو کثرتِ استعمال سے انگریزی میں انڈس بن گیا ۔۔۔۔

؁۴ THE GAZETTEER OF WEST PAKISTAN THE FORMER PROVINCE OF SIND CHAPTER I PAGE I

؁۵ بحوالہ منزل بہ منزل ص۲۶ از شریف الدین پیرزادہ گلڈ اشاعت گھر کراچی ۱۹۶۵ء

مہران ایرانی نژاد معلوم ہوتا ہے جو تاریخ مابعد میں مستعمل ہوا اور اسی مناسبت سے سندھ کی وادی وادیٔ مہران کہلائی۔

تاریخی پس منظر :

قدیم تاریخ کی آنکھ نے اس سرزمین کے عروج و زوال کو دیکھا ضرور ہو گا مگر کوٹ ڈیجی اور موئن جو دڑو کے کھنڈر ثقافت کی جو کہانی بیان کرتے ہیں، وہ مبہم اور غیر واضح ہے البتہ ولادت مسیح سے پانچ سو سال قبل کے واقعات کچھ روشن ہیں جب ایران کے پہلے "دارا" نے اس کو مسخر کیا تھا پھر کوئی دو سو سال بعد یونان کے سکندر سے ایرانیوں کا معرکہ ہوا اور یہ سرزمین ایک کے اقتدار سے دوسرے کی غلامی میں چلی گئی۔ [6]

سندھ کے روایتی تمدن کی انفرادیت جو آریا اثرات سے مل جل کر قائم ہوئی تھی اب ایرانیوں اور یونانیوں سے متاثر ہو رہی تھی، زبان پر بھی اس کا اثر پڑ رہا تھا اور اندس جیسے لفظ بنیادی شکل میں پیدا ہوتے جا رہے تھے ـــــــ حالانکہ حقیقتاً سندھ کا یہ دور ایک انحطاطی دور تھا جس کے دوش بدوش شمالی ہندوستان ارتقاء کی انتہائی منازل طے کر رہا تھا، وہاں کی موریہ حکومت اپنے عروج پر پہنچی ہوئی تھی اور ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک سنسکرت کا بول بالا ہو رہا تھا۔

---

[6] SIND: A HISTORICAL PERSPECTIVE PAGE 8 BY DR. N. A. BLOCH PUBLISHED IN SIND THROUGH THE CENTURIES

ڈیڑھ سو سال قبل مسیح میں ساکا اور ساتھین قوموں کے حملے بھی سندھی زبان و ثقافت پر اثر انداز ہوئے بغیر نہ رہے اور ترکی اور دراوڑی زبان کے بگڑے ہوئے الفاظ مقامی پراکرتوں میں داخل ہو گئے پھر ہر سو دو سو سال بعد انسانی خون کی ارزانی ہوئی اور سو برس قبل مسیح میں کوشان شہنشاہ کنشک کے دور میں پالی پراکرت کو عروج حاصل ہوا جو حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے بعد نصف صدی تک باقی رہا۔

۵۰ء میں پارتھین بادشاہ سیستان اور قندھار کی طرح سندھ پر بھی قابض ہو گئے اور ترکی زبان کا غلبہ بڑھ گیا۔ ۴۷۰ء میں سندھ کی سرزمین بھی وسط ایشیا کی طرح سفید ہنوں کے ہاتھوں پامال ہوئی اور ایک صدی تک تمدن و زبان پر وحشیانہ ثقافت کا عمل دخل رہا، یہاں تک کہ ایران کی ساسانی حکومت نے پھر پرپرزے نکالے اور سندھ بار دیگر ایران کے اقتدار میں آگیا۔ [۵]

ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں جب ایرانی حکومت کمزور پڑی اور عربوں کے ہاتھوں ایران کی تباہی عمل میں آئی تو چچ برہمن نے سندھ کو آزاد کرا لیا اور ملتان سے دیبل تک ایک مضبوط حکومت قائم کر لی جس کا اختتام ۷۱۲-۷۱۱ء میں اس کے بیٹے داہر کے دور میں محمد بن قاسم کے ہاتھوں ہوا۔

قدیم ترین تہذیبی مرکز اور اس کی روایت :

ہزاروں سال کے اتار چڑھاؤ کی یہ تاریخ صرف سندھ کی ثقافت ہی کو

---

[۵] SIND: A HISTORICAL PERSPECTIVE PAGE 11
BY DR. N.A. BLOCH PUBLISHED IN SIND THROUGH THE CENTURIES

زیر بار نہ کر رہی تھی بلکہ ذہن اور عقیدہ پر بھی ضرب کاری لگا رہی تھی۔

آریوں کی آمد کے وقت جب ہندوستان کے باقی حصے جہالت کی تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے تو سندھ میں تمدن کی شمع روشن تھی۔ موئن جو دڑو اور ہڑپہ اُس کے باقیات الصالحات میں تھے جس پر یقیناً آریوں کا اثر پڑا اور اس کے رسم و رواج، رہن سہن کے طریقے اور عقائد نو وارد فاتحین سے متاثر ہوئے مگر یہ ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے کہ آریہ بھی اس تہذیب کے اثرات سے اپنا دامن نہ بچا سکے جس میں جادو ٹونے اور اوراد کو اہمیت حاصل تھی۔ دریاؤں، جانوروں اور پرہیبت درختوں کی پوجا خاص طور پر مروج تھی۔ نسل و رنگ کے لحاظ سے اس تہذیب کے علم بردار عموماً دراوڑی تھے۔ بعض قبیلے ہندوستان کے اندرونی حصوں سے اور بعض وسط ایشیا سے متعلق معلوم ہوتے لیکن عقائد و تمدن میں سب برابر کے شریک تھے اور مافوق الفطرت چیزوں کے اعتقاد میں کسی کو کوئی اختلاف نہ تھا۔

اس موقع پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا دراوڑ زیادہ مہذب تھے یا آریہ؟ اس کا جواب اثبات یا نفی میں دینا ذرا مشکل ہوگا مگر یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ سندھ نے آریوں کا اثر اس حد تک قبول نہیں کیا جتنا ہندوستان کے دوسرے حصوں نے بلکہ اس کے برعکس سندھ میں جو آریہ اقامت پذیر ہوئے انھوں نے سندھ والوں سے ایک تہذیبی اور لسانی سمجھوتا کر لیا۔ اس کے بعد اس سرزمین پر جس زبان، مذہب اور تمدن نے رواج پایا وہ شمالی ہندوستان اور ملک کے دیگر حصوں سے بالکل مختلف تھا۔

یہاں کے قدیم مذہب کو سندھی اور آریائی عقائد کا آمیزہ کہا جا سکتا ہے جو ایرانی اور سلوکسی میزانوں پر تلتا ہوا آگے بڑھا تو بدھ مت کے سانچے

میں ڈھل گیا اور یہ پیمانہ اس کو اتنا بھاگیا کہ اُسے نہ ہنوں کی یلغار جکنا چور کرسکی اور نہ ترجیح کی برہمنیت اس کے مزاج کو اتنا بدل سکی کہ باطنیت اور گیان سے اس کا کوئی رابطہ نہ رہتا البتہ محمد بن قاسم جب ریگزار عرب کی تجلیاں لے کر دیبل کے ساحل پر اترا تو سندھ کی مذہبیت کی آنکھوں میں ایک چکا چوند پیدا ہوگئی اور وحدانیت کے نور نے اس کے زاویہ نگاہ کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔

مسٹر ایم۔ اے صدیقی، ڈاکٹر ممتاز حسین پٹھان کی کتاب ARAB KINGDOM OF ALMANSURAH صفحہ ۵۱ کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

"اسلام کی مساوات نے سندھی ذہنوں کو از حد متاثر کیا اور تصوف کی روشنی سے وہ بہت مانوس ہوگئے۔ تصوف کا پیغام محبت اور صرف محبت ہوتا ہے جس کے نتیجے میں سندھ کے سابقہ عقائد میں ایک زلزلہ آگیا اور سندھ کے لوگ دامن اسلام کے اس گوشے میں بڑا سکون محسوس کرنے لگے۔" [۸]

مروجہ زبانیں اور ثقافتی سرمایہ :

یہی صورت تمدن و ثقافت کی بھی ہوئی۔ زبان تو ہر منزل پر اپنے دامن کو وسیع سے وسیع تر کرتی رہی مگر سندھ کی ثقافت اب نہ بہت

---

۸ SIND: THROUGH THE CENTURIES PAGE 35 PUBLISHED BY DAILY HILAL-E-PAKISTAN 1974.

قدیم تھی اور نہ بالکل نئی۔ اس میں کوٹ ڈیجی، ہڑپہ اور موئن جو دڑو کی تہذیب کے جلوے بھی تھے اور آریائی دیویوں کا جمال بھی، ایرانی خال وخد کی آمیزش بھی تھی اور ترکی بانکپن کا نکھار بھی، یونانی تراش خراش کا حسن بھی تھا اور آہوان ختن کی وحشت انگیزی بھی۔ عربوں کے ورود اور اسلام کی آمد سے اس میں ایک اور اضافہ ہو گیا اور جلد ہی وہ دن آگیا جب ثقافت و زبان دونوں نے نووارد عربوں سے ایک سمجھوتہ کر لیا۔

اب دیبل سے ملتان تک کھجور کی جو نئی پود نظر آتی، اس کے درختوں کا قد و قامت پہلے سے زیادہ مختلف نہ ہوتا۔ مگر اس میں جو خوشے لگتے ان کا رنگ روپ اور ذائقہ کچھ بدلا ہوا ضرور ہوتا ــــــ ایسا ذائقہ جو عربوں کو عراق کی یاد دلاتا اور سندھی اس کو اپنی زمین کی پیداوار قرار دیتے اور یہ تغیر کچھ غیر متوقع نہ تھا۔ ایک سندھی ادیب کے بقول:۔

"ہر ایک ملک کی زبان اور تمدن پر اس وقت کے فاتحین کی زبان اور رسم ورواج کا بہت اثر پڑتا ہے۔ علاقہ سندھ میں بھی عربوں کی آمد کے بعد عربی رسم الخط کا آغاز ہوا اصلی باشندگانِ سندھ نے ٹوپیاں اتار کر پگڑیاں باندھنا شروع کر دیں۔ کھجوریں بوئی گئیں۔ گھوڑے کی سواری قابلِ فخر سمجھی جانے لگی اور سندھی میں ہزاروں عربی الفاظ جذب ہو گئے۔ تاریخ سندھ کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ایام میں سندھی شاعری درجہ کمال پر تھی۔ اہلِ عرب کی تقلید کرتے ہوئے دو تارہ اور گھڑوں پر نغمہ سرائی کرنے کو باعث تفریح تصور کیا جاتا تھا اور اس زمانہ میں اپنی مادری زبان میں جو دیہاتی گیت منظوم کیے گئے انھیں لوگ کافی کے نام سے پکارنے

لگے جیسے صحیح معنیٰ میں شاہ عبداللطیف بھٹائی نے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔" [۹]

سندھ نے کئی ہزار سال قبل ایک ثقافتی اور لسانی اتحاد آریوں سے کیا تھا۔ اور یہ اتحاد اتنا مضبوط تھا کہ سندھ کی عوامی زبان پر ایک طرح سے سنسکرت کی مُہر لگ گئی تھی مگر نئے فاتح اس سرزمین کے ذرّوں سے اس طرح گھل مل گئے کہ اقتدار کے دباؤ سے ہٹ کر عام زندگی پر اپنے اثرات مترتب کرنے لگے اور برسوں کے فصل سے بڑے بڑے شہروں کی بولی میں عربی الفاظ نے اپنی مستقل جگہ بنا لی۔

اس مقام پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پورے سندھ میں ایک ہی بولی یا زبان رائج تھی؟ اس کا جواب ہزاروں سال پہلے کا وہ دور دے سکتا ہے جب نہ راستے محفوظ تھے اور نہ آمد و رفت کی سہولتیں حاصل تھیں لہٰذا سندھ کا حال بھی تمام دنیا بالخصوص ہندوستان کے مختلف حصّوں کا سا تھا اور یہاں بھی ہر پچاس میل کے بعد زبان بدل جاتی تھی۔ مولانا ابوظفر ندوی کے مطابق۔

"سندھ اور ملتان کی اصلی زبان جس میں وہاں کے سندھی عوام بات کرتے تھے، وہ متعدد تھی۔ بھاٹیہ سے لے کر سندھ کے بالائی حصے تک تو اردنا گری کا رواج تھا یعنی نصف ناگری کیونکہ یہ مختلف زبانوں سے مل کر کھچڑی زبان بن گئی تھی۔ اسی زبان میں یہ لوگ خط و کتابت کرتے تھے اور کتابیں بھی لکھی جاتی تھیں۔" [۱۰]

---

[۹] سندھ کے لوک گیت از آغا تاج محمد صفحہ ۲۷ مطبوعہ ماہنامہ ماہِ نو شمارہ مئی ۱۹۲۹ء

[۱۰] تاریخ سندھ صفحہ ۳۶۵ مصنفہ سید ابوظفر ندوی بحوالہ سفرنامہ بشاری مقدسی مطبوعہ المعارف اعظم گڑھ ۱۹۴۷ء

"جنوب سندھ کے ساحلی علاقوں میں ملگاری زبان کا زیادہ رواج تھا اسی ملگاری میں تمام قسم کا لکھنا پڑھنا ہوتا تھا لیکن منصورہ اور برہمن آباد میں ایک اور زبان رائج تھی جس کو سین دب کہتے تھے (کتاب الہند البیرونی) اسی سین دب ہی کا ترمیمی نام سندھی ہے۔

یہ (سین دب) ملک کے اصلی باشندوں کی زبان تھی لیکن عربوں کی زبان جو عدالت، تجارت اور تعلیم کے موقعوں پر استعمال کرتے تھے، وہ سندھ کے مختلف حصّوں میں مختلف رہی ہے۔ تیسری صدی تک یہاں صرف دو زبانیں استعمال ہوتی رہیں عوام اپنی ملکی زبان بولتے اور خواص عربی اور ملکی دونوں سے واقفیت رکھتے۔ چوتھی صدی کے وسط میں بھی یہی حال رہا کہ ملتان و منصورہ کے لوگ ملکی اور عربی زبان میں گفتگو کرتے تھے لیکن مکران میں مکرانی اور فارسی رائج تھی"۔[۱]

"چوتھی صدی کے آخر میں جب دیلیموں کے عروج سے سندھ پر اثر پڑا تو فارسی زبان کا رواج شروع ہو گیا چنانچہ ۳۷۵ھ کے قریب جب بشاری ملتان آیا ہے تو یہاں فارسی زبان رائج ہو چکی تھی اور یہاں کے باشندے اس کو سمجھنے لگے تھے۔ اسی طرح مکران میں بلوچی یا مکرانی کا استعمال تھا لیکن خواص پر فارسی کا اثر تھا لیکن منصورہ کی ریاست میں ابھی عربی اپنا اثر جمائے تھی۔ تاجر سندھی اور عربی

---

[۱] تاریخ سندھ صفحہ ۳۶۵ مصنفہ سید ابوظفر ندوی (بحوالہ مروج الذہب جلد اول صفحہ ۳۷۷ تا صفحہ ۳۸۰ مطبوعہ لیڈن) مطبوعہ المعارف اعظم گڑھ ۱۹۴۷ء۔

ہی کے ذریعہ اپنا کاروبار چلاتے تھے۔" ۱۲؎

اس بیان سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر اس سے یہ صورت حال ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ مقامی زبانوں پر زمان و مکاں کی تفریق کے ساتھ عربی کے اثرات روز بروز مستحکم ہوتے جا رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے حلقوں میں مروج زبانوں نے باہمی اختلاط سے جو بھی شکل اختیار کی ہو لیکن اصلی سندھی جو پراکرت یا سنسکرت کے بطن سے پیدا ہوئی تھی، اس کا دامن غیر شعوری طور پر کشادہ ہو گیا تھا اور وہ آہستہ آہستہ پرانے اور نئے سندھیوں دونوں کے لئے قابلِ فہم بنتی گئی۔

عربوں کا دو سو سالہ دور، اس سلسلے میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے پھر وسط ایشیا کے سیاسی انقلابات نے جہاں سندھ کی سرزمین پر حکومتوں کے نئے نئے نقشے بدلے وہاں ثقافتی ولسانی تغیر کے اسباب بھی فراہم کئے۔ بغداد میں خلافت عباسیہ کے انحطاط پر جب صفاریوں کا غلبہ ہوا تب بھی سندھ کی حدود اس سے بے تعلق نہ رہ سکیں اور جب حکومت دیلمیوں سے غزنوی اقتدار میں پہنچی، اس وقت بھی سندھ کسی انقلاب سے محفوظ نہ رہا۔

سلطان محمود کے ہندوستان پر حملے تاریخ کا ایک اہم باب ہیں۔ سندھ اس سے قبل کی صدی میں فاطمیّن مصر کے تصرف میں آچکا تھا اور عربی و فارسی الفاظ کی مفرد اور مرکب شکلیں کسی نامعلوم زبان کی اساس بنتی جا رہی تھیں۔

"یہی وہ دور ہے جب سندھی نے ناگری کے ساتھ ساتھ

۱۲؎ تاریخ سندھ صفحہ ۳۶۵ مصنفہ سید ابو ظفر ندوی (بحوالہ سفر نامہ ابن حوقل بغدادی صفحہ ۲۲۶ مطبوعہ لیڈن) مطبوعہ المعارف اعظم گڑھ ۱۹۴۷ء

عربی رسم الخط اختیار کیا اور ایک عرصہ تک سندھی ہر دو رسم الخط میں لکھی جاتی رہی پھر گیارھویں صدی عیسوی کی چھٹی دہائی سے اس سرزمین کی زبان مستقل طور پر نسخ میں لکھی جانے لگی مگر ہندو اب بھی اکثر ناگری ہی کو استعمال کرتے تھے"۔[۱۳] سندھ کا سومرہ عہد حکومت اس کی ترویج کے لئے مختص ہے۔ اس کے بعد سمہ دور میں تو اس کی طرف خاصی توجہ کی گئی اور سندھی دیونا گری اور نسخ کے ساتھ نستعلیق میں بھی لکھی جانے لگی۔

عربوں کی آمد سے قبل برہمن راج میں سندھو بولی ایک بڑے حصے کی عوامی زبان تھی اور ناگری رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔ اس کا استعمال خط وکتابت اور دفتری کاموں کے لئے یکساں طور پر ہوتا۔ عربوں کا اقتدار قائم ہونے پر حکومت کی زبان عربی ہو گئی جو سولھویں صدی عیسوی کے وسط تک باقی رہی پھر سندھ کا دہلی سے براہِ راست رابطہ پیدا ہو جانے کے باعث فارسی نے عربی کی جگہ لے لی جو انگریزی دور تک باقی رہی۔

لیکن سندھ کی سیاسی تاریخ ہنوز کروٹوں پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ ۱۵۲۰ء میں ارغونوں نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ ۱۵۵۵ء میں ترکمان سریر آرائے سلطنت ہوئے اور ۱۵۹۲ء میں عبدالرحیم خان خاناں نے سندھ کو فتح کر کے مغل سلطنت میں شامل کر دیا جس کا اثر زبان د

---

[۱۳] SIND: A HISTORICAL PERSPECTIVE PAGE 14. By DR. N.A. BLOCH PUBLISHED BY DAILY HILAL-E-PAKISTAN 1974.

ثقافت پر پڑتا رہا اور ہندوستان کے دوسرے حصوں کی طرح سندھی میں بھی نئے نئے الفاظ وجود میں آتے رہے جو ایک مستقبل کی زبان کا پیش خیمہ تھے۔

سترھویں صدی کے اختتام سے قبل سندھ کے سیاسی اُفق پر کلہوڑوں کی ایک مقامی طاقت ابھری۔ پہلے اس نے شمالی حصے میں اپنے قدم جمائے پھر جنوب سے بھی مغل صوبہ دار کو نکال دیا۔ اس دور میں علم و ادب کی بڑی ترقی ہوئی اور فارسی کے ساتھ ساتھ سندھی شاعری بھی پروان چڑھی۔

۱۷۸۲ء میں تالپور کلہوڑوں کے جانشین ہوئے جن کی حکومت ۱۸۴۳ء میں انگریزوں کے ہاتھوں ختم ہوئی اور وادیٔ مہران کی ثقافت غیر شعوری طور پر ایک اجنبی تہذیب سے دوچار ہونے لگی۔ [14]

سندھ پنجاب اور شمالی ہندوستان کی طرح ہمیشہ سے نوواردوں کی آماجگاہ رہا تھا تاہم اس نے آسانی سے غیر ملکی اثرات کو قبول نہ کیا تھا۔ عرب قدرے خوش قسمت تھے اور ایرانیوں سے تو سندھ کا چولی دامن کا ساتھ رہا تھا لہٰذا عربی و فارسی کو لسانی بساط پر مستقل جگہ مل گئی تھی۔ لیکن پرتگالی، ڈچ اور انگریزی کا کبھی کوئی خیر مقدم نہ کیا گیا۔ پھر بھی سیاسی اقتدار اپنا اثر دکھلائے بغیر نہیں رہتا اس لیے دانستہ یا نادانستہ انگریزی الفاظ آہستہ آہستہ رائج ہونے لگے اور مروج زبانیں بتدریج سمندر پار کی اصطلاحوں سے آشنا ہونے لگیں۔

---

[14] تاریخ سندھ از مولانا ابوظفر ندوی مطبوعہ المعارف اعظم گڑھ ۱۹۴۷ء۔
تاریخ سندھ از مولانا غلام رسول مہر مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد ۱۹۵۸ء۔

عربوں کی آمد کا ثقافت اور زبانوں پر اثر:

یہ تھا ایک مختصر سا خاکہ اس تہذیب و ثقافت کا جو سیاسی انقلابات کے طوفانوں میں پروان چڑھتی رہی اور ہر سو دو سو سال بعد اپنے تازہ نقوش و آثار کے ساتھ ابھرتی رہی لیکن ماضی سے حال تک کوئی تمدنی خطِ مستقیم کھینچا جائے تو یہ اندازہ کرنا کچھ دشوار نہ ہوگا کہ اقتدار کی آئے دن کی کشمکش سے سندھ کی لسانی سطح رہن سہن اور سج دھج سے زیادہ متاثر ہوئی اور زبانیں مختلف حصوں اور ادوار میں اپنے زاویے بدلتی رہیں۔

سنسکرت کے ورود کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ ماضی کی ایک کہانی ہے لیکن عربی کی آمد تو صفحاتِ تاریخ میں کل کی بات ہے اور آج کے سندھ کے لئے یہ بات ہر نہج داعتبار سے طلوعِ آفتاب کے مژدے سے کم نہیں ——— وہ آفتاب جو عراق کے ساحل سے ابھرا اور بحیرۂ عرب کے نیلے پانی میں ایک تلاطم پیدا کرتا ہوا دیبل کے اُفق پر آکر ٹھہرا۔ پھر اس کی کرنوں نے ریگزار سندھ کے ہر ذرّے کو ہشت پہل بنا دیا۔

بلاشبہ جواں سال محمد بن قاسم کے ساتھ آنے والے مجاہدوں میں اکثریت عربوں کی تھی لیکن ایک تعداد وہ بھی تھی جو فارس نژاد تھے۔ یہ نو وارد اپنے جلو میں عرب کی تمدنی روایات اور ثقافتی نوادرات لے کر آئے تھے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ بعض تحائف ایسے بھی تھے جن کے ایرانی الاصل ہونے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ بعینہٖ یہی صورت زبان کی بھی تھی۔ اس میں بھی جا بجا کسر ائیت کی جھلک پائی جاتی تھی جس سے سندھ کی سرزمین قطعی اجنبی نہ تھی۔

کوئی فاتح قوم جب کسی ملک میں وارد ہوتی ہے تو مقامی آبادیوں

کے لئے ایک آفتِ آسمانی تصور کی جاتی ہے اور خوف و دہشت کی فضا میں اس کا کوئی خیر مقدم نہیں کیا جاتا چنانچہ ابتداً عرب فاتحین کی حیثیت بھی اس سے مختلف نہ ہوئی لیکن عرب سندھ میں رہنے بسنے کے لئے آئے تھے لہٰذا جلد ہی میل جول اور بھائی چارے کا ماحول پیدا ہو گیا اور تہذیبوں کے اختلاط کے دوش بدوش زبانوں کا اختلاط وقت کی ناگزیر ضرورت بن گیا۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:۔

"جب محمد بن قاسم نے سندھ کو فتح کیا یہاں ایک ایسی کھچڑی زبان تھی جو پساچی اثرات بھی رکھتی تھی اور شورسینی بھی۔ اسی زبان کو جو ملتان سے ساحل سمندر تک بولی جاتی تھی اہل سندھ سندھی کہتے تھے اور وہ زبان جو گجرات، راجپوتانہ، مشرقی و مغربی پنجاب اور وسطی ہند میں رائج تھی، ہندی کے نام سے موسوم تھی۔ داہر کے والد کے بارے میں تاریخ معصومی میں لکھا ہے کہ "او علم محاسبہ دلغات سندی و ہندی خوب می دالنست،، مسلمانوں کے آنے کے ساتھ مفتوح علاقے کی تہذیب معاشرت اور زبان پر وہی اثر ہوا جو آریاؤں، پساچیوں اور ابھیروں کی فتوحات سے یہاں کی تہذیب اور زبانوں پر ہوا تھا۔ فاتح و مفتوح جب تہذیبی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور لسانی سطح پر ایک دوسرے سے ملے تو ایک نئی میل شتم کی زبان اپنے خد وخال اجاگر کرنے لگی جس میں سامی، ایرانی، تورانی اور دوسری بولیوں نے مل جل کر لسانی کھچڑی پکانے کا عمل کیا تھا۔

عربوں کی حکومت سندھ و ملتان پر ۷۱۲ء سے ۱۰۲۶ء تک قائم رہی۔ انھوں نے اپنے نظام خیال کی قوت سے ان علاقوں میں وحدت کا تصور پیدا کر کے معاشرتی زندگی کی رفتار کو نہ صرف تیز کر دیا بلکہ تہذیبی اور لسانی عوامل میں بھی ایک نئی روح پھونک دی۔ اس نئی سیاسی و

معاشرتی صورت حال نے لسانی سطح پر ایک دیسی زبان کی ضرورت کو ابھارا جس کے ذریعے اس علاقے میں رہنے بسنے والی مختلف اقوام ایک دوسرے سے ابلاغ کر سکیں ۔" ۱۵

یہ صورت حال ہندوستان کے لئے ایک تاریخی اور پرانی ریت تھی اور وادئ مہران اس سے قبل بار بار اس سے دوچار ہو چکی تھی مگر ماضی کے بیشتر فاتح بن بلائے مہمان کی طرح آئے تھے اور چلے گئے تھے یا زائد سے زائد انھوں نے پنجاب کو اپنا مستقر بنا لیا تھا ۔ ان کے برعکس عرب خود سندھ میں اقامت گزیں ہو گئے تھے اب گویا یہی ان کا وطن تھا جس کی مروج زبان یا زبانوں میں بعض ایسے الفاظ موجود تھے جن سے وہ آشنا تھے ۔ بالفاظ دیگر سندھ کی لسانی بساط پر مزید عربی الفاظ کی گنجائش وقت کی منتظر تھی لہٰذا عربوں کے آتے ہی اس نے اپنا دامن پھیلا دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سندھیوں کی زبانوں پر عربی اور عربوں کے ہونٹوں پر سندھی لفظ متحرک نظر آنے لگے ۔

یہ ایک ایسا عمل تھا جو فطری طور پر ماضی میں مسلسل دہرایا جاتا رہا تھا مگر فی زمانہ اس میں شدت آگئی تھی اور وقت کی تدریجی ترقی کے ساتھ یہ شدت بڑھتی رہی ——— مگر زبانوں نے ابھی اپنے مزاج نہ بدلے تھے ۔ عربی اور سندھی دونوں زبانیں مفردات اور مرکبات کے اضافوں سے اسی طرح علیحدہ علیحدہ بولی اور سمجھی جاتی تھیں اور سرکاری اور عوامی سطح پر ان کے استعمال کے میدان جدا جدا تھے ۔

یہی وہ بدیہی حقیقت ہے جس کی بنا پر سید سلیمان ندوی ، حبیب الرحمٰن خاں شیروانی ، پیر حسام الدین راشدی اور بعض دوسرے محققین کا کہنا ہے

---

۱۵ تاریخ ادب اردو جلد اول صفحہ ۷۶ ، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۵ء ۔

کہ سندھ اردو کا پہلا گہوارہ تھا اور سندھ کی لسانی ٹکسال سے اساسی طور پر جو نئے لفظ اور فقرے ڈھل کر نکلے انھیں پر مستقبل میں اردو زبان کی بنیاد رکھی گئی۔

الفاظ کی یہ غیر ارادی تخلیق کئی سو سال تک ہوتی رہی حتیٰ کہ سلطنت غزنویہ کے قیام کے بعد پنجاب پر امیر سبکتگین کے حملے شروع ہو گئے۔ پھر سلطان محمود کے دور میں سندھ پہلے کی طرح زیادہ غیر متعلق نہ رہ سکا اور ایک دن وہ بھی آگیا جب محمود نے منصورہ کو فتح کر لیا۔

عربوں کے دورِ حکومت کی تین صدیوں کا جائزہ لیا جائے تو اس طویل مدت میں سندھ پر عربی کے ساتھ فارسی کے اثرات بھی پڑ چکے تھے اور یہ دونوں زبانیں بھی مقامی الفاظ کے استعمال سے اپنا دامن بچا نہ سکی تھیں۔ سندھ پر محمودی اقتدار کے دوش بدوش عربی کا دائرہ تنگ ہونے لگا اور فارسی کی بساط وسیع سے وسیع تر ہو گئی ـــــــ اس کا سبب شاید یہ ہو کہ ایران کے ساتھ اہلِ سندھ کی تاریخی ہم آہنگی تھی اور عربی کے مقابلے میں وہ فارسی سے زیادہ قریب تھے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی بشاری مقدسی کے سفرنامے کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

"ملتان بھی منصورہ کی طرح ہے مگر منصورہ زیادہ آباد ہے
فارسی زبان عموماً سمجھی جاتی ہے۔" [۱۶]

اس کے بعد وہ زمانہ آجاتا ہے جب پنجاب پر غزنوی پرچم لہرانے لگتا ہے اور سندھ و پنجاب کا ایک رابطہ قائم ہو جاتا ہے۔ اب سندھ

---

[۱۶] تاریخ ادب اردو صفحہ ۶۷۶ از ڈاکٹر جمیل جالبی مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۵ء بحوالہ "ہندوستان عربوں کی نظر میں" جلد اول صفحہ ۲۷۵ مطبوعہ دار المصنفین اعظم گڑھ۔

کا آدمی پنجاب پہنچتا ہے تو اپنے ساتھ تین صدی کے بعض نوزائیدہ الفاظ لے کر جاتا ہے اور وہاں سے واپس ہوتا ہے تو لسانی دامن میں چند نئے فقرے اور لفظ تحفۃً میں لاتا ہے۔

عربوں کو تین سو سال قبل سندھ میں عوامی زندگی کے لئے جو لسانی ضروریات پیش آئی تھیں، وہ اب غزنوی مسلمانوں کے لئے وقت کا اہم ترین مسئلہ بنی ہوئی تھیں لہذا ان کا حل بھی ویسا ہی کچھ نکلا جو سندھ میں برآمد ہوا تھا البتہ غزنویوں کو پنجاب میں زمین قدرے ہموار ملی اور کچھ مدد سندھ سے مل گئی پھر کوئی ڈیڑھ سو سال کے فصل سے جب غور کا آفتاب شمالی ہندوستان کے مطلع پر چمکا اور شہاب الدین غوری نے پانی پت کے میدان میں ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کر دیا تو تاریخ میں دوسری بار مسلمانوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا۔

اب نسلی ارتباط اور لسانی اختلاط کا عمل تیز سے تیز تر ہو گیا اور ۱۲۱۰ء میں جب شمس الدین التمش کے عہد میں پایہ تخت لاہور سے دلی منتقل ہوا تو نئے الفاظ کا اثاثہ بھی سامان سفر کے ہم رکاب تھا۔ اب دلّی کے بازاروں میں وہ الفاظ بھی سنائی دے رہے تھے جو پہلے پہل دیبل، منصورہ، ملتان اور لاہور کے در و دیوار میں گونجے تھے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں۔

> "لاہور سے پایۂ تخت جب دہلی منتقل ہوتا ہے تو ایک بہت بڑے پیمانہ پر لاہور کی آبادی ہجرت کر کے دہلی آجاتی ہے۔ یہ ہجرت اتنے بڑے پیمانہ پر ہوئی کہ اس کی بدولت گنگا جمنا کے بالائی حصے اور دہلی کے اطراف میں ایک نئی زبان کی داغ بیل پڑ گئی۔" ۱۷

---

۱۷ مقدمہ تاریخ زبان اردو صفحہ ۶۷ مطبوعہ اردو مرکز لاہور ۱۹۶۶ء۔

بہرحال مختلف علاقوں میں مقامی بولیوں کی ساخت ہنوز ماضی کی روایات پر برقرار تھی مگر ان کی مدد میں ایسے جواہر ریزے بھی نظر آتے جن پر کبھی عربی و فارسی کی چھاپ لگی ہوئی تھی لیکن اب وہ سندھ و پنجاب کی ٹکسالوں میں ڈھل کر خالص ہندوستانی بن گئے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ بعض ہندوستانی ہیرے بھی دکھائی پڑتے جو کچھ اس طرح تراشے گئے تھے کہ ان کی تراش خراش تبریزی اور اصفہانی معلوم ہوتی تھی۔

اس موقع پر یہ واضح کر دینا بے محل نہ ہو گا کہ شمالی اور مغربی ہندوستان میں جو زبانیں مروج تھیں، وہ لگ بھگ سب کی سب شورسینی اپ بھرنش سے ماخوذ تھیں۔ پنجاب راجپوتانہ اور گجرات میں تو ایک حد تک لسانی آہنگ پایا جاتا۔ سندھ کچھ الگ تھلگ ضرور تھا لیکن اس پر بھی اپ بھرنش کی شاخ پساچی کے ساتھ ساتھ شورسینی کا اثر غالب تھا اور وہاں کی زبان پنجاب کی زبان سے زیادہ دور نہ تھی۔

اس طرح مختلف علاقوں کی زبانوں پر عربی و فارسی کا اثر پڑا تو نتائج یکساں برآمد ہوئے اور سندھ، پنجاب اور دلی میں رابطے کے جو الفاظ وضع ہوئے ان میں بھی کچھ زیادہ فرق نہ ہو سکا۔

دلی کی مقامی زبان برج بھاشا تھی جو اودھی کی طرح اپ بھرنش کی ایک شاخ تھی لہٰذا مسلم فاتحین نے جب اندرونِ ملک بڑھنا شروع کیا تو لسانی کارواں بھی ان کے ساتھ ساتھ رہا جو فارسی کے جلو میں علاقائی اور مقامی جملوں اور فقروں کو بھی لئے ہوئے تھا۔ انجامِ کار آہستہ آہستہ سارا ملک نئی ثقافت اور خلط ملط زبان سے متاثر ہونے لگا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:۔

"مسلمانوں کی فتوحات کے ساتھ یہ زبان گجرات، دکن، مالوہ اور دوسرے علاقوں میں پھیل گئی اور سارے برِ اعظم

یں واحد مشترک زبان کی حیثیت سے ابھرنے لگی"۔ ۱۸؎

اس سلسلے میں دکن کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ملک کافور کے حملے کے بعد سے جزیرہ نمائے دکن دوسرے علاقوں کی طرح نوواردوں کا اثر قبول کر رہا تھا لیکن چودھویں صدی عیسوی میں بہمنی سلطنت کے قیام سے اس اثر میں بڑا اضافہ ہوگیا اور نسلوں اور زبانوں کے اختلاط کا جو نتیجہ ہندوستان کے شمال و مغرب میں برآمد ہوا تھا اس سے بہتر نتیجہ دکن میں برآمد ہونے لگا لیکن سج دھج اور وضع قطع کے لحاظ سے ہندوستان کے مختلف حصّوں میں جو تفریق تھی، وہی تفریق رابطے کے نئے الفاظ میں بھی پائی گئی پھر بھی اس دور میں مستعمل ہونے والے الفاظ کا ایک اجتماعی جائزہ لیا جائے تو بہت سے الفاظ ایسے مل جائیں گے جو سندھ، پنجاب، گجرات اور دکن ہر جگہ ایک ہی معنیٰ میں بولے جاتے اور یہی الفاظ وہ بنیادی پتھر تھے جن پر اردو کا ایوان تعمیر ہوا۔

قدیم علاقائی زبانوں میں مستعمل ہونے والے افعال کی ہم آہنگی سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو یقیناً سندھ کو اولیت کا درجہ حاصل ہے کہ اس سرزمین پر پہلے پہل بین الاقوامی رابطے کے جو الفاظ استعمال میں آئے وہی چھنٹ چھنٹا کر مستقبل بعید میں اردو کا جزو بنے اور انھیں کی بنیاد پر (ہندی) اردو زبان کا قطعی ڈھانچہ مغل دور حکومت میں دلی اور اس کے نواح میں تیار ہوا۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ زمانہ مابعد میں پنجاب، گجرات، دکن اور جہاں کہیں بھی کوئی لسانی عمل وجود میں آیا وہ کسی مستقبل کے پیش خیمے ہی کے مترادف تھا۔ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی تحریر کرتے ہیں:۔

۱۸؎ تاریخ ادب اردو جلد اول صفحہ ۶۷۴ مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۵ء۔

"بہر کیف یہ نظریہ کہ اردو کا مولد سرزمین سندھ ہے، اگرچہ علم و تحقیق کی کسوٹی پر پورا نہ اترے لیکن اتنی بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جن عوامل نے ہندوستان کی ایک آریائی زبان کو ہماری اردو کا قالب عطا کیا، وہ سب سے پہلے سندھ میں کارفرما ہوئے۔" [19]

اور اس کارفرمائی میں عربی کے بعد فارسی کا حصّہ ہے جو سندھ میں سلطان محمود کے حملے سے پہلے ہی اپنے قدم جما چکی تھی۔ بھیرو مل مہرچند اڈوانی لکھتے ہیں۔

"۱۰۲۴ء میں محمود غزنوی نے سندھ سے خلفاء کے نائبوں کو نکال باہر کیا۔ غزنوی خاندان کے وقت سے فارسی کا میل جول ہوا ــــــ ۱۵۲۱ء سے سندھ میں ارغونوں کی حکومت ہوئی۔ اس وقت سے سندھ میں فارسی زبان کی تعلیم کا سلسلہ باقاعدہ شروع ہوا ــــــ دہلی کے بادشاہوں کی حکومت سے فارسی کا تعلق بڑھ گیا ــــــ کلہوڑوں اور میروں کی حکومت سے ہندو اہلکار خانگی خط پتر بھی فارسی میں لکھتے تھے ــــــ کلہوڑوں اور میروں کی صاحبی میں ٹھٹھہ اور روہڑی گویا سندھ کی یونیورسٹیاں تھیں ــــــ ہندو اور مسلمانوں کے بچوں کے لئے اخوندوں کے مکتب کے ہوتے تھے جن میں، آج کل کے اسکولوں کی طرح درجے نہ ہوتے تھے۔ کریما، گلستاں، بوستاں، پند نامہ اور دوسری فارسی

---

[19] سندھی اردو کے لسانی روابط صفحہ ۴۰ مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۷۰ء۔

کتابیں پڑھاتے تھے ،، ۲۰؎

محمد بن قاسم کے وقت سے سندھ کی سرکاری زبان عربی رہی تھی ۔ سمہ دورِ حکومت میں فارسی نے اس کی جگہ لے لی اور پنجاب و دلی کے متوازی اس سرزمین میں چلتی رہی ۔ حالات کی مطابقت یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ آپس کا میل ملاپ ہندوستان کے مختلف حصّوں میں اختلاطِ لسانی کی جو فضا پیدا کر رہا تھا ، سندھ میں بھی ویسا ہی کچھ ظہور میں آیا ۔ ۱۳۶۱ء میں فیروز شاہ تغلق کے ٹھٹھہ پر ناکام حملے کے بعد اہلِ سندھ کی زبان سے اردو زبان کا پہلا فقرہ ادا ہوا ۔ جس کے بعد سندھ کی تاریخ میں ایک تواتر سے ایسے الفاظ کا استعمال پایا جاتا ہے جو ٹھیٹ اردو کے ہیں یہ استعمال کہیں تو فارسی کے تسلسل میں ہے اور کہیں اردو ، فارسی اور سندھی کے معجون مرکب کے طور پر ، جو اردو کا ویسا ہی اٹھان ہے جس کے نمونے امیر خسرو نے پیش کیے ہیں ۔

مسلم دور میں ہندوستان کے مختلف حصّوں کا جائزہ لیا جائے تو ہر جگہ ایک مخلوط ثقافت اور کھچڑی زبان پائی جاتی تھی جس میں روز بروز ایک پختگی پیدا ہوتی رہی ۔ یہاں تک کہ اردو ایک زبان کی حیثیت سے وجود میں آگئی ۔

اس کو صرف اردو کا قبولِ عام کہا جا سکتا ہے کہ اس زبان نے اس زمانے میں بھی معروف اور غیر معروف شاعر پیدا کیے جب فارسی کو حکومت کی سرپرستی حاصل تھی اور فارسی ہی ثقہ لوگوں کی زبان تھی ۔ اس سلسلے میں ہندوستان کے کسی حصّے کو بھی پہل کرنے کی فضیلت حاصل ہو لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جب شمال یا جنوب میں نوزائیدہ زبان شعر کا

۲۰؎ سندھی بولی جی مختصر تاریخ ص ۲۴۶ تا ص ۲۴۸ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد سنہ ۱۹۶۲ء

قالب اختیار کر رہی تھی تو سندھ بھی خاموش نہ تھا اور جب دکن کے پہلے
صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ اردو میں اپنی بقائے دوام کی داغ
بیل ڈالنے والے تھے تو سندھ میں شاہ عبدالکریم اور میر فاضل بکھری اردو
شاعری کا آغاز کر چکے تھے۔ اس کے بعد شعراء کا ایک تسلسل ہے جو عہد
بعہد آگے بڑھتا ہے اور اورنگ زیب کے عہدِ حکومت میں شاہ عبداللطیف
بھٹائی کا دور آجاتا ہے۔ کلہوڑوں کے زمانے میں روحل فقیر، میر علی شیر
قانع اور ابو تراب کامل وغیرہ پیدا ہوتے ہیں اور تالپوری عہد میں تو
شعراء کی تعداد میں معتد بہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ سوال کیا جا سکتا ہے کہ
سلطنت مغلیہ کے زوال پذیر دور میں دلی، لکھنؤ، پنجاب اور دکن کی
طرح سندھ میں اردو کا عروج کیوں نہیں ہوا؟ اس کا جواب اس
وقت کا سیاسی دور دے سکتا ہے جس سے واضح ہو گا کہ اہلِ سندھ نے
حقیقتاً اردو کی جانب سے بے اعتنائی نہیں کی بلکہ جمود کا سبب انگریزوں
کی لسانی پالیسی تھی جو ۱۸۴۳ء میں تالپوروں کو شکست دے کر سندھ
پر قابض ہو چکے تھے۔

تاریخ کا ایک سرسری جائزہ لیا جائے تو محسوس ہو گا کہ سومرہ اور
سمہ عہدِ حکومت سندھ کی ثقافتی اور لسانی تاریخ کے درخشاں باب تھے۔
سمہ دور کے بارے میں پیر حسام الدین راشدی "مقدمہ تذکرہ اولیائے
سندھ" میں لکھتے ہیں۔

"سندھ کا وہ عہد جسے تاریخی نقطۂ نظر سے زریں دور سے تعبیر
کیا جا سکتا ہے، وہ سمہ عہد ہے۔ سمہ کے دورِ حکمرانی میں کئی
صدیوں تک سندھ نے امن، خوشحال اور سکون کے وہ دور
دیکھے ہیں جس کی نظیر سندھ کی تاریخ کے پورے ادوار میں ملنا
مشکل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سمہ حکمرانوں نے سندھ کو ترقی

وکمال کے انتہائی عروج پر پہنچایا۔ خوش بختی وکامرانی سمہ
فرمانروا ؤں، کے قدم چومتی تھی اور سمہ فرمانروا ملک کی فلاح
وبہبود کی شاہراہ پر بڑی تیزی سے گامزن تھے کہ اچانک
جام نظام الدین (المتوفیٰ ۹۱۴ھ) کے بعد سندھ کا وہ عظیم
نقصان ہوا کہ جس کی تلافی ہزاروں گردشوں کے بعد آج تک
زمانہ نہ کرسکا۔ علم وادب کی وہ بساطیں جو صدیوں سے بچھی
ہوئی تھیں الٹ گئیں۔ روحانی فیض اور ارشاد کی وہ مسندیں
جن سے عرفان وتصوف کے چشمے اُبلتے تھے خالی ہوگئیں۔
مدرسے، جن سے علم وفضل کے دریا بہتے تھے، سونے ہو
گئے۔ علماء وصوفیائے کرام یہاں کے غیر محفوظ حالات دیکھ
کر ترکِ وطن پر مجبور ہوئے اور اس طرح گئے کہ پھر کسی نے
رُخ نہ کیا۔" [۲۱]

یہ زمانہ فارسی کے عروج کا تھا۔ سندھ کے اُفق پر عرفان وآگہی کے
آفتاب طلوع ہو رہے تھے۔ شاعروں کے قلم سے حمد الٰہی اور نعت رسالت
پناہی کے شاہکار نکل رہے تھے مگر ان کی زبان عموماً فارسی ہوتی۔
البتہ درمیان درمیان عوامی بولی کے فقرے اور مصرعے بے ساختہ منہ
سے نکل جاتے جن میں سے کسی کو سندھی اور کسی کو اُردو کہا جاسکتا ہے۔
ارغونوں اور ترخونوں کی پون صدی اگرچہ ایک افراتفری میں گزری
لیکن اس میں بھی شاعرانہ تجلیاں اپنی ضو دکھاتی رہیں پھر مغلوں کے سو
سال اور کلہوڑوں کے دو سو برس میں اردو کے خال وخد ابھر کر سامنے

---

[۲۱] بحوالہ "مسلمانانِ کراچی وسندھ کی تعلیم" صفحہ ۳۶ از سید مصطفیٰ علی بریلوی
مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۶۸ء۔

آگئے اور سندھ میں دکن اور دلی کے دوش بدوش متحدہ زبان کے شاعر پیدا ہوتے رہے یہ اور بات ہے کہ سندھ مرکزی ہندوستان سے دور دراز تھا لہٰذا یہاں کے اردو شاعروں کو وہ شہرت حاصل نہ ہو سکی جس کے وہ مستحق تھے لیکن آج اگر عہد بعہد دکن و دلی کے اردو کلام کا سندھی شاعروں کے اردو کلام سے موازنہ کیا جائے تو سندھ کے شاعر کسی دوسرے مقام کے شاعروں سے کسی طرح پیچھے نہیں رہتے۔

اس کا سبب افرادی صلاحیت بھی ہے اور وہ سرپرستی بھی ہے جو مقامی حکومتوں کی طرف سے علم و ادب کو پروان چڑھانے کے لئے کی گئی جس میں کلہوڑہ خانوادے کسی طرح بھی اپنے پیش رووں سے کم ثابت نہیں ہوئے اور ان کے بعد تالپوروں نے پون صدی کی حکومت میں داد دہش کا ایک ریکارڈ قائم کر دیا۔ اردو ان کے دور میں پوری طرح منظر عام پر آچکی تھی اور سچل سرمست، عظیم الدین عظیم، غلام حیدر فقیر اور غلام محمد گدا وغیرہ کتنے ہی شاعر اس زبان میں طبع آزمائی کر رہے تھے۔ مختصر یہ کہ سندھ میں اردو کا مستقبل کسی طرح تاریک نہ تھا۔ بشرطیکہ انگریز اس سرزمین میں اس کی قسمت پر مہر لگانے کی لگاتار کوشش نہ کرتے ــــــ ۱۸۴۳ء میں جب میانی کے میدان میں انگریزوں نے سندھ کو تالپوروں کے ہاتھ سے چھین لیا تو عام خیال یہی تھا کہ انگریز قدم جمانے کے لئے سندھ میں بھی فارسی دشمنی کا ثبوت دیں گے اور ہندوستان کے دوسرے حصوں کی طرح یہاں بھی اردو کو فارسی کی جگہ لائیں گے جیسا کہ انھوں نے ہندوستان کے دوسرے حصوں میں کیا تھا لیکن مسلم عناد اور عام انتشار پھیلانے کی پالیسی سندھ میں کچھ مختلف تھی لہٰذا انگریزوں نے یہاں سندھی کو ایک مستقل قواعد اور ترمیمی رسم الخط دے کر فارسی کا متبادل بنا دیا اور

مسلمانوں کو پوری طرح تباہ کرنے کے لئے اس علاقے کو صوبہ بمبئی میں شامل کر دیا تاکہ سندھ کی مسلم اکثریت اقلیت میں تبدیل ہو جائے۔

یہ وہ دور ہے جب سندھ میں اردو شاعری کے ساتھ اُردو نثر نگاری کے چراغ بھی روشن ہو چکے تھے اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا مگر ابھی اشاعت کا باقاعدہ انتظام نہ تھا۔ لہٰذا اس زمانے میں جو چند کتابیں لکھی گئیں ان میں سے بعض کراچی میں اور بعض سندھ کے باہر دلی یا لکھنؤ میں طبع ہوئیں۔

قیامِ پاکستان میں اہلِ سندھ کا حصّہ:

اہلِ سندھ کی حریت پسندی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ انھوں نے جس طرح انگریزوں کے خلاف ایک عرصے تک اپنی جنگ جاری رکھی، اسی طرح سندھ کو صوبہ بمبئی سے علیحدہ کرانے کے لئے بھی جد و جہد کا آغاز کیا تو اس کا سلسلہ ختم ہونے کو نہ آیا ـــــــ اس جد و جہد میں سندھی کے ساتھ اردو کا استعمال بھی کیا گیا۔ تقریریں ہوئیں، مضامین لکھے گئے حتیٰ کہ ۱۹۳۶ء میں سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے علیحدہ صوبہ بنا دیا گیا۔ اس کے بعد ہی سارے ہندوستان کے مسلمان مسلم لیگ کے پرچم کے نیچے جمع ہو گئے اور سندھ میں بھی بڑی شدت کے ساتھ آزادی کا نعرہ بلند ہو گیا۔ تشکیل پاکستان کی سعی مسلسل میں بلاشبہ اہل سندھ کا بڑا حصّہ ہے۔ اس دور میں اس سرزمین پر اردو کو بڑا عروج ملا اور اردو کے رسالے اور اخبار بھی جاری ہوئے۔

تصنیف و تالیف اور اردو نثر نگاری میں سندھ کا شمالی ہندوستان اور دکن سے مقابلہ کیا جائے تو یقیناً سندھ کچھ پیچھے نظر آتا ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ سندھ میں اودھ، رامپور اور حیدرآباد کی سی ریاستیں

نہ تھیں جن کی سرپرستی زبان کو فروغ دیتی ۔ لے دے کے ایک ریاست خیرپور رہ گئی تھی ، اس نے بیسویں صدی کے آغاز سے کچھ نہ کچھ کیا اور ماضی کے باقیات الصالحات میں جو رئیس خانوادے تھے انھوں نے بھی بقدر حیثیت ادیب و ادب نوازی میں حصّہ لیا جس کے نتیجے میں انگریزی دور کے کچھ دنوں بعد سے سندھ میں باقاعدہ اردو کا کام ہوا۔

انیسویں صدی کی آخری نصف صدی سے سندھی فارسی کی متبادل زبان بن گئی تھی اور سندھی کے ساتھ انگریزی کی ترویج کی کوشش ہو رہی تھی لہٰذا سندھ کے قدیم مدارس میں فارسی اور سندھی اور جدید مدرسوں میں سندھی اور انگریزی پڑھائی جاتی تھی مگر انیسویں صدی کے آخر سے بعض مدرسوں میں اردو کو بھی جگہ مل گئی جس کے آغاز کا تعین ۱۸۸۵ء میں سندھ مدرسۃ الاسلام کے قیام سے کیا جا سکتا ہے اور بیسویں صدی شروع ہونے کے بعد سے تو اردو باقاعدہ نصاب میں داخل ہو گئی ۔

یہی صورت اردو مشاعروں کی بھی ہوئی ۔ ایک سرسری جائزے کے مطابق انجمنوں کی تشکیل اور مشاعروں کا انعقاد بھی اسی عہد کی بات ہے اور پھر اکثر ادب کی محفلیں ہوتی نظر آتی ہیں جس میں مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ یعنی ۱۹۳۸ء سے بڑا اضافہ ہو گیا ۔ سندھ میں تحریک آزادی کی لہر دوڑ گئی اور سندھ کے حرّیت پسند عوام اپنے اکابر کے شانوں سے شالے جوڑ کر میدان میں آ گئے ۔ حیدرآباد ، کراچی ، خیرپور ، سکھر ، نواب شاہ جیسے شہروں کو چھوڑ کر دیہات قریات قریات زندہ باد کے نعروں سے گونجنے لگے ۔

حصول پاکستان یقیناً قائدِ اعظم کا کارنامہ ہے لیکن اس سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ربع صدی تک انھوں نے مسلمانوں میں ایسا اتحاد پیدا کر دیا تھا جس کی نظیر مسلم تاریخ میں نہیں ملتی اور اس اتحاد میں اردو نے سندھ میں

بھی وہی کام کیا جو ہندوستان کے دوسرے حصّوں میں کیا تھا۔ اس زمانے کو ایک طرح سے سندھ میں ماضی قریب کی تلافی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جس کا سلسلہ ہنوز باقی ہے۔

اردو نثر و اشاعت میں سندھ کا ماضی کچھ زیادہ روشن نہیں۔ قلمی کتب کے دور میں جو کام بھی ہوا وہ ہوا لیکن ہندوستان میں مطبع کے قیام کی ابتدا سے سندھ قدرے خاموش نظر آتا ہے ـــــــ حالات کا جائزہ اگر اس وقت سے لیا جائے جب ہندوستان میں اردو کا پہلا اخبار جاری ہوا تو سندھ میں ایسی کوئی تحریک نہیں پائی جاتی اور نہ انیسویں صدی کے وسط تک کوئی ایسا تصور کیا جاسکا۔

اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ سندھ کی سرکاری اور مروج زبان سندھی تھی اور یہ علاقہ مرکزی ہندوستان سے الگ تھلگ تھا۔ انیسویں صدی عیسوی سندھ میں اردو کے لئے ایک اچھا شگون لے کر آتی دکھائی دیتی ہے جس میں بعض لیتھو پریس قائم ہوئے، ریاست خیرپور میں اردو کو درباری زبان کا درجہ دیا گیا۔ بعض رسائل کا اجرا ہوا، کتابیں چھپیں اور تحریر و تقریر میں اس طرح اردو کا استعمال کیا جانے لگا گویا وہ قیام پاکستان سے قبل ہی سندھ کی سرکاری زبان بن گئی ہو ـــــــ اور پاکستان بننے کے بعد اردو کی ترقی میں جو اہل سندھ کا حصّہ ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔

سندھ میں اُردو کے ابتدائی نقوش و آثار

بعض دوسرے مسائل کی طرح اردو زبان کی جائے پیدائش کا قضیہ بھی ماہرینِ لسانیات کے لئے تصفیہ طلب ہے۔ ملک کے مختلف حِصے پورے استدلال کے ساتھ دعویدار ہیں کہ اُردو نے ان کی سرزمین میں جنم لیا۔ ان کے دعووں کے پس پشت ایسے ایسے محققین کے چہرے نظر آتے ہیں جن کی شخصیتیں ہر نہج داعتبار سے مسلّم ہیں اور دلائل و براہین کسی طرح صرفِ نظر نہیں کئے جا سکتے۔

متقدمین کا ایک بڑا گروہ اس کو عہد شاہجہان کی پیداوار بتاتا ہے۔ چنانچہ انشاء اللہ خاں انشاء تحریر فرماتے ہیں:۔

"دلّی میں ان کی بہ نسبت بادشاہت زیادہ عرصہ تک رہی ہے اس لئے اس کے ہم بیانوں نے باہم ہو کر متعدد زبانوں سے اچھے اچھے الفاظ منتخب کر کے بعض عبارتوں اور محاوروں میں تصرف اور پھر تمام زبانوں سے الگ ایک نئی زبان پیدا کی۔ یہی نئی زبان اُردو ہے۔" [۱]

---

[۱] دریائے لطافت صفحہ ۲۲ مطبوعہ آفتاب اکیڈمی کراچی ۱۹۶۲ء۔

سرسید کی تحقیق انشار کی تائید میں ہے۔

"وہ جب کہ شہاب الدین شاہجہاں بادشاہ ہوا اور اس نے انتظام سلطنت کا کیا اور سب ملکوں کے وکلار کے حاضر رہنے کا حکم دیا اور دلی شہر کو نئے سرے سے آباد کیا اور قلعہ بنایا اور شاہ جہان آباد اس کا نام رکھا اس وقت اس شہر میں تمام ملکوں کے لوگوں کا مجمع ہوا ہر ایک کی گفتار رفتار جدا جدا تھی۔ ہر ایک کا رنگ ڈھنگ نرالا تھا جب آپس میں معاملہ کرتے لاچار ایک لفظ اپنی زبان کا دو لفظ اس کی زبان کے تین لفظ دوسرے کی زبان کے ملا کر بولتے اور سودا سلف لیتے۔ رفتہ رفتہ اس زبان نے ایسی ترکیب پائی کہ یہ خود ایک نئی زبان ہوگئی اور جو کہ یہ زبان خاص بادشاہی بازاروں میں مروج تھی اس واسطے اس کو زبان اردو کہا کرتے تھے اور بادشاہی امیر امرا اسی کو بولا کرتے تھے گویا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی یہی زبان تھی ہوتے ہوتے خود اس زبان ہی کا اردو نام ہوگیا۔" [۲]

مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں۔

" اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خالص ہندوستانی زبان ہے لیکن وہ ایسی زبان نہیں کہ دنیا کے پردے پر ہندوستان کے ساتھ آئی ہو۔ اس کی عمر آٹھ سو برس سے زیادہ نہیں ہے اور برج کا سبزہ زار اس کا وطن ہے۔"

پھر آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں۔

---

[۲] آثار الصنادید صفحہ ۲۰۵ مطبوعہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی سنہ ۱۹۶۶ء۔

"رفتہ رفتہ شاہجہاں کے زمانے میں کہ اقبال تیموری کا آفتاب عین عروج پر تھا شہر اور شہر پناہ تعمیر ہو کر نئی دلی دار الخلافہ ہوئی بادشاہ اور ارکانِ دولت زیادہ تر وہاں رہنے لگے۔ اہلِ سیف، اہلِ قلم، اہلِ حرفہ اور تجار وغیرہ ملک ملک اور شہر شہر کے آدمی ایک جگہ جمع ہوئے۔ ترکی میں اردو، بازار لشکر کو کہتے ہیں اردوئے شاہی اور دربار میں ملے جلے الفاظ زیادہ بولتے تھے۔ وہاں کی بولی کا نام اردو ہو گیا۔ اسے فقط شاہجہاں کا اقبال کہنا چاہیئے کہ یہ زبان خاص وعام میں اس کے اردو کی طرف منسوب ومشہور ہو گئی۔" ۳ے

عبدالغفور نساخ "رسالہ تحقیق زبان" میں رقم طراز ہیں۔

"زبان اردو روزمرہ شہر دلی کو کہتے ہیں، اس شہر میں قدیم الایام سے برابر ہندی مروج ہے۔ جب شہاب الدین محمد غوری نے اہلِ ہند کو شکست دی اور تمام ملک ہند غور کے قبضۂ اختیار میں آیا، رفتہ رفتہ زبان قدیم میں لفظ فارسی، عربی، ترکی ملتا گیا، ۱۰۵۸ھ میں شاہجہاں نے شاہجہاں آباد (دہلی) آباد کیا تو اطراف وجوانب سے عالم، ہر قسم کے ذی علم اور صاحب استعداد اور قابل لوگ جمع ہوئے۔ قدیم ہندی متروک ہونے لگی، محاورے میں فرق ہونے لگا، زبان اردو کی ترقی شروع ہوئی۔" ۴ے

امام بخش صہبائی نے بھی "انتخاب دواوین" کے دیباچے میں کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے لیکن میر امن دہلوی ان سے اتفاق نہیں کرتے،

۳ے آبِ حیات صفحہ ۹۔۲۰ مطبوعہ تاج بک ڈپو لاہور ۱۹۶۲ء۔

۴ے ماخوذ از زبان اور اردو زبان از ڈاکٹر فرمان فتحپوری صفحہ ۳۹۔۴۰ آئینہ ادب لاہور ۱۹۷۳ء۔

وہ لکھتے ہیں :۔

"جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تو چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم کے لوگ قدردانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سن کر حضور میں آکر جمع ہوئے لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی، اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین سودا سلف، سوال جواب کرکے ایک زبان اردو بھی مقرر ہوئی۔" [۵]

انگریزی محقق ڈاکٹر گلکرائسٹ کو بھی آزاد، سرسید اور نساخ وغیرہ کی رائے سے اختلاف ہے، وہ ہندوستانی فلالوجی مطبوعہ لندن ۱۸۱۰ء میں تحریر کرتے ہیں۔

"جب تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا، اس وقت سے اردو کی بنیاد قائم ہوئی۔" [۶]

اس سلسلے میں ایک تحقیقی نظریہ سندھ کے شہرہ آفاق محقق علامہ آئی۔آئی قاضی کا بھی ہے۔ جو میرامن دہلوی کی رائے کی تائید کرتا ہے۔ حضرت علامہ اپنا نظریہ پیش کرنے سے قبل لفظ اردو پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"لفظ اردو (ارڈو) اپنی روزانہ بول چال میں "ڈھیر" یا بہت سی چیزوں کے جمع ہونے کے معنی میں استعمال کرتے ہیں اور یہ لفظ اس مفہوم میں سندھ میں عربوں کی آمد سے تین ہزار سال پہلے سے رائج ہے۔ اردو کا لفظ سندھ یا ہندوستان کی سرزمین پر وجود میں نہیں آیا۔ یہ لفظ ماضی قبل تاریخ سے چلا آتا ہے۔ وہ لوگ جو ہند جرمانی زبان سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں۔ یہ لفظ بیک وقت

---

[۵] دیباچہ باغ و بہار صفحہ ۴۲ مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۵۷ء

[۶] ماخوذ از زبان اور اردو زبان از ڈاکٹر فرمان فتحپوری صفحہ ۴ آئینہ ادب لاہور ۱۹۷۳ء

اسکنڈے نیویا، فارس اور ہندوستان میں موجود پاتے ہیں اور یہی
تین مقام آریوں کے خاص وطن ہیں۔ قدیم ناردی دیومالا میں ہمیں
لفظ اُردو یا اُرتھ ایک دیوی کے نام کی صورت میں ملتا ہے جو
تقدیر کی قائم مقام سمجھی جاتی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہند
جرمانی زبان بولنے والی اقوام نے جب اپنا مشترکہ وطن چھوڑ کر
مشرق اور مغرب کا رُخ کیا تو یہ لفظ مروج تھا۔ اگر ہم اوستا کی
زبان یا قدیم فارسی دیکھیں تو یہ لفظ وہاں بھی موجود ہے۔ شہر
اُردبیل اور بادشاہ اُردشیر کے نام اُس دور میں اِس لفظ کے
مستعمل ہونے کا واضح ثبوت ہیں۔ یہ لفظ آج بھی سندھی اور
جدید فارسی میں یکساں طور پر فوج، چھاؤنی اور بازار کے معنوں
میں موجود اور مروّج ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے معنی میں
اجتماع، ڈھیر اور بھیڑ کا مفہوم مشترک ہے۔"

آگے چل کر رقم طراز ہیں۔

"اردو کی بنیاد ہر معنی میں سنسکرت پر ہی استوار ہے۔ ایران کی
زبان نے اس کے ارتقائی مدارج اور اُس کے حُسن میں اضافہ کرنے
کے عمل میں حِصّہ لیا ہے۔ یہ ہے اردو کے ابتدائی اس کے بنیادی
مواد اور مادے کی حقیقت!" [۵]

سلسلۂ بیان میں علامہ قاضی یورپ کی زبانوں کے حوالے دیتے ہیں۔
اور بحث کا اختتامیہ ان الفاظ پر کرتے ہیں:۔

---

[۵] خطبۂ صدارت یوم اردو منعقدہ خالقدینا ہال کراچی بتاریخ ۱۵ دسمبر ۱۹۳۸ء
مترجمۂ الیاس عشقی مشمولہ "ادبی رابطے، لسانی رشتے" صفحہ ۱۰ تا ۱۲۔
مطبوعہ مجلسِ ادب حیدرآباد ۱۹۷۶ء۔

"یہ وہ زبان ہے جس نے اکبر اعظم کے دور میں تقویت اور اہمیت حاصل کی، جب رنگ و نسل کے اختلافات ختم ہو رہے تھے اور مغل ہندوستان کو اپنا وطن سمجھنے میں فخر محسوس کرتے اور یہاں کی زبانیں شوق سے بولنے لگتے تھے۔" ۸

اس کے بعد بیسویں صدی کے ماہرین لسانیات کی رائے تو اس مسئلہ کو اور الجھن میں ڈال دیتی ہے۔ ہر محقق کا نعرہ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ LINGUISTIC SURVEY OF INDIA کے سربراہ مسٹر گریرسن اردو، ہندی، ریختہ اور دکنی کو چار الگ الگ زبانیں قرار دیتے ہیں جس کے بعد محققین کا ایک بڑا گروہ اس طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ حافظ محمود شیرانی بڑے عالمانہ انداز میں اس موضوع پر بحث کرتے ہیں اور پنجاب کو اردو کا مولد قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں ہے بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے اور چونکہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے جاتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں۔" ۹

"اردو جہاں اپنے اسماء و افعال کو الف پر ختم کرتی ہے، برج بھاشا واؤ پر ختم کرتی ہے، برج میں جمع کا طریقہ بہت سادہ ہے لیکن اردو میں بہت پیچیدہ، اردو میں مرکب افعال

---

۸ خطبۂ صدارت یوم اردو منعقدہ خالقدینا ہال کراچی بتاریخ ۱۵ دسمبر ۱۹۳۶ء۔ مترجمہ الیاس عشقی مشمولہ "ادبی رابطے، لسانی رشتے" صفحہ ۱۰ تا ۱۲۔ مطبوعہ مجلس ادب حیدر آباد ۱۹۷۶ء۔

۹ "پنجاب میں اردو" صفحات ۱۶، ۱۷، ۱۸ مطبوعہ کتاب نما لاہور ۱۹۷۲ء۔

کا بہت رواج ہے۔ بھاشا میں یہ بات موجود نہیں ہے۔ اس لئے اردو کو بھاشا سے کوئی تعلق نہیں۔ ان میں ماں بیٹی کا رشتہ نہیں ہے بلکہ بہنوں بہنوں کا ہے۔" ۱۰؎

"اردو اپنی صرف و نحو میں پنجابی و ملتانی زبان کے بہت قریب ہے۔ دونوں میں اسماء و افعال کے خاتمہ پر الف آتا ہے اور دونوں میں جمع بنانے کا طریقہ مشترک ہے۔ دونوں زبانیں تذکیر و تانیث کے قواعد، افعال مرکبہ و توابع میں متحد ہیں۔ پنجابی و اردو میں ساٹھ فی صدی سے زیادہ الفاظ مشترک ہیں۔" ۱۱؎

عین اسی زمانے میں پروفیسر محی الدین قادری زور یورپ میں اس موضوع پر تحقیق کرتے ہیں۔ ۱۹۳۰ء میں ان کا مقالہ "ہندوستانی فونی ٹکس" کے نام سے شائع ہوا ہے جس کا ہندوستانی ایڈیشن "ہندوستانی لسانیات" ہے۔ ڈاکٹر زور شیرانی صاحب کے متعین کئے ہوئے راستے سے تو گزرتے ہیں لیکن حقیقتاً ان سے اتفاق نہیں کرتے بلکہ اردو کی جڑیں اس زبان میں ڈھونڈھ نکالتے ہیں جس سے پنجاب و دہلی دونوں جگہوں کی زبانیں ماخوذ ہیں۔ زور صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"اردو کا سنگِ بنیاد دراصل مسلمانوں کی فتح دہلی سے پہلے ہی رکھا جا چکا تھا یہ اور بات ہے کہ اس نے اس وقت تک ایک مستقل زبان کی حیثیت نہیں حاصل کی، جب تک مسلمانوں نے اس شہر کو اپنا پایۂ تخت نہ بنا لیا۔ اردو اس زبان سے مشتق ہے جو بالعموم ہند آریائی دور میں اس حصۂ ملک میں بولی جاتی تھی

۱۰؎، ۱۱؎ "پنجاب میں اردو" صفحات ۱۶، ۱۷، ۱۸ مطبوعہ کتاب نما لاہور ۱۹۷۲ء

جس کے ایک طرف عہد حاضر کا شمال مغربی سرحدی صوبہ ہے اور دوسری طرف الہ آباد۔ اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہے کہ اردو اس زبان پر مبنی ہے جو پنجاب میں بارھویں صدی عیسوی میں بولی جاتی تھی کیونکہ ہند آریائی دور کے آغاز کے وقت پنجاب کی اور دہلی کے نواح کی زبانوں میں بہت کم فرق تھا۔ ان کی اس وقت کے اختلاف کو ظاہر کرنے والی بہت کم خصوصیتوں کا اس وقت تک پتہ چلا تھا۔ یہ واقعہ دراصل بارھویں صدی عیسوی کے بعد کا ہے کہ موجودہ زبانوں نے ان اختلافات کی پرورش کی جو آج انھیں ایک دوسرے سے جدا ظاہر کرتے ہیں۔

موجودہ زمانے میں یہ بتانا مشکل ہے کہ کس ٹھیک ٹھیک وقت سے پنجاب کی اور نواح دہلی کی زبان میں فرق پیدا ہونے لگا یقین ہے کہ یہ فرق مسلمانوں کے قبضۂ دہلی کے بعد سے شروع ہوا ہے ابتدا میں وہ صرف ایک تاریخی تغیر تھا۔ آخر کار ان دونوں مقامات کی بولیوں کے درمیان ایک ایسی خلیج حائل ہوتی گئی کہ ایک پنجابی بن گئی اور دوسری کھڑی بولی، اردو نہ تو پنجابی سے مشتق ہے اور نہ کھڑی بولی سے بلکہ اُس زبان سے جو ان دونوں کی مشترک سرچشمہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ بعض باتوں میں پنجابی سے مشابہ ہے اور بعض میں کھڑی بولی سے، لیکن مسلمانوں کے صدر مقام صدیوں تک دہلی اور آگرہ رہے ہیں اس لئے اردو زیادہ تر کھڑی بولی ہی سے متاثر ہوتی گئی۔" [۱۲]

---

[۱۲] "ہندوستانی لسانیات" صفحات ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶ مطبوعہ مکتبہ معین الادب۔ اردو بازار لاہور ۱۹۶۱ء۔

پروفیسر شیرانی نے برج بھاشا اور اردو کو ماں بیٹی ماننے سے انکار کردیا ڈاکٹر زور نے برج بھاشا، پنجابی اور اردو تینوں میں ہم شیرگی کا رشتہ قائم کردیا۔

اور پھر پروفیسر احتشام حسین نے ایک جداگانہ نظریہ پیش کیا جس سے آگے چل کر ان کے اکثر ہم عصروں نے اتفاق کیا۔ جیولز بلاک (فرانسیسی ماہر لسانیات) نے جو نظریہ پیش کیا ہے اور جسے ڈاکٹر زور نے تسلیم کیا ہے وہ یہ ہے کہ:۔

"ابتدا میں پنجابی اور کھڑی بولی میں صرف تدریجی فرق رہا ہوگا بعد میں ایک بولی پنجابی بن گئی اور دوسری کھڑی بولی اس لئے یہ کہنا درست ہوگا کہ اردو نہ پنجابی سے مشتق ہے اور نہ کھڑی بولی سے بلکہ اس زبان سے جو ان دونوں کا مشترک سرچشمہ ہے۔"[۱۳]

بحث کے دھارے میں کلکتہ یونیورسٹی کے ماہر لسانیات ایس۔ کے چیٹرجی کا بیان بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ پروفیسر چیٹرجی تحریر فرماتے ہیں:

"ترک افغان فاتحین کے ساتھ ایک تعداد پنجابی مسلمانوں کی بھی تھی جو دہلی کے دارلحکومت میں وارد ہوئے۔ یہ لوگ ہندوستانیوں میں قدرے نمایاں اور ممتاز تھے۔ ان کی بولی دہلی کے شمال اور شمال مغرب کے علاقوں کی زبان سے کافی حد تک ملتی جلتی تھی۔ انھوں نے مروج کاروباری زبان کو ایک لہجہ و آہنگ دیا اور اس کے خال و خد درست کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔"[۱۴]

مسٹر چیٹرجی ایک طرح سے پروفیسر شیرانی کے ہم آواز ہیں لیکن اس سے

---

[۱۳] "ہندوستانی لسانیات کا خاکہ" از پروفیسر احتشام حسین۔

[۱۴] "انڈو آرین اینڈ ہندی" مصنفہ ایس کے چیٹرجی۔ صفحہ ۱۶۸، ۱۶۹۔ ورناکیولر ریسرچ سوسائٹی گجرات (کاٹھیاواڑ) ۱۹۴۲ء۔

زور صاحب کے خیال کی تردید نہیں ہوتی کیونکہ ڈاکٹر زور کا کہنا تو یہ ہے کہ اُس زمانے میں دلی اور پنجاب کی بولیوں میں کوئی نمایاں فرق نہ تھا۔ دونوں علاقوں کی زبانیں اپ بھرنش سے مشتق تھیں اور ان میں بڑی حد تک یکسانیت پائی جاتی تھی لہٰذا اردو کا دلی کے بجائے پنجاب میں پیدا ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

اس سلسلے میں ایک تیسری اور توجہ طلب رائے مولانا سید سلیمان ندوی کی ہے جس پر پروفیسر شیرانی اور دیگر محققین نے بحث کی ہے اور جس کی اساسی استدلال کو سب ہی مانتے ہیں مگر آگے چل کر نظریاتی راستے بدل جاتے ہیں اور مولانا اپنی تحقیق میں ایک مرد میدان کی طرح حبیب الرحمٰن شیروانی کے دوش بدوش تنہا ایستادہ نظر آتے ہیں۔ آپ کا کہنا ہے:۔

"مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچے اس لئے قرین قیاس یہ ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں اس کا ہیولیٰ اسی وادئ سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔ عربی و فارسی بولنے والے مسلمان تاجر عراق، بندر رابلہ، سیراف اور بصرہ سے نکل کر، سندھ کے بندروں سے گزر کر، گجرات ہوکر، بحرِ ہند کے کنارے سفر کرتے ہیں۔ آخر پہلی صدی ہجری کے آخر، یعنی ساتویں صدی عیسوی میں عرب مسلمانوں نے سندھ پر قبضہ کر لیا۔ یہ اسلامی لشکر شیراز اور عراق سے مرتب ہو کر آیا تھا جس کے یہ معنی ہیں کہ اس لشکر کے لوگ فارسی اور عربی بولتے تھے۔ اس کے بعد جو سوداگر اور تاجر یہاں آکر بود و باش اختیار کرنے لگے تھے وہ بھی عربی اور فارسی بولتے تھے۔ جہازرانوں کی زبان بھی عربی اور فارسی سے مرکب تھی۔ خود سندھیوں کی آمد و رفت بھی عراق میں لگی رہتی تھی خصوصاً جب ۱۳۳ھ میں خلافت کا مرکز شام سے عراق کو منتقل ہو گیا اور سندھ کے پنڈت بغداد جا کر اپنی زبان

سے عربی میں کتابوں کے ترجموں میں مدد دینے لگے اور وہاں کے مختلف علمی اور طبی منصوبوں پر سرفراز ہونے لگے۔ اس زمانے میں عربی میں ہندی کے بہت سے اصطلاحی لفظ اور دواؤں اور خوشبوؤں کے نام داخل ہوئے ـــــ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ سندھ اور ملتان میں دیسی بولیوں کے ساتھ عربی اور فارسی کا میل جول بڑھتا رہے اور ایک نئی مرکب بولی کا ہیولیٰ تیار ہو۔" [15]

مولانا نے دلیل کے طور پر اصطخری، ابنِ حوقل اور لبشاری مقدسی کے سفر ناموں کے بعض فقرے دیئے ہیں اور ان سے قوموں کے ساتھ ساتھ زبانوں کے اختلاط کو ثابت کیا ہے۔ پھر آگے چل کر لکھتے ہیں :۔

"اس تشریح سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کی عربی و فارسی سب سے پہلے ہندوستان کی جس دیسی زبان سے مخلوط ہوئی، وہ سندھی اور ملتانی ہے۔ پھر پنجابی اور بعد ازاں دہلوی۔ سندھی پر اس اختلاط کی شہادت آج بھی اسی طرح نمایاں ہے چنانچہ ہماری اردو کی طرح سندھی بھی عربی و فارسی الفاظ سے اسی طرح گراں بار ہے اور سب سے عجیب یہ کہ اس کا رسم الخط آج تک ٹھیٹھ عربی نسخ ہے اور عربی کے بہت سے خاص الفاظ مستعمل ہیں مثلاً پہاڑ کو جبل اور پیاز کو بصل کہتے ہیں۔

سندھی، ملتانی اور پنجابی آپس میں بالکل ملتی جلتی ہیں۔ تینوں میں بہت سے الفاظ کا اشتراک ہے، تینوں میں عربی و

---

[15] نقوش سلیمانی صفحہ ۳۱ از سید سلیمان ندوی مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۶۷ء

فارسی کا میل ہے۔ صیغوں کے طریق میں تھوڑا فرق ہے یہاں پر اس تاریخی غلط فہمی کا مٹانا ضرور ہے۔ جس کی رو سے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ بولیاں موجودہ اردو کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ موجودہ اردو انہی بولیوں کی ترقی یافتہ اور اصلاح شدہ شکل ہے یعنی جس کو ہم اردو کہتے ہیں، اس کا آغاز ان ہی بولیوں میں عربی و فارسی کے میل سے ہوا اور آگے چل کر دارالسلطنت دہلی کی بولی سے جس کو دہلوی کہتے ہیں رل کر معیاری زبان بن گئی اور پھر دارالسلطنت کی بولی معیاری زبان بن کر تمام صوبوں میں پھیل گئی۔" [۱۶]

پیر حسام الدین راشدی بھی سندھ ہی کو اردو کا مولد بتاتے ہیں۔

" اردو ہندو مسلمانوں کی وہ مشترک زبان ہے جو مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد اور حکومت اور تمدنی روابط کی بدولت اس طرح وجود میں آئی کہ اسلامی زبانوں کے ہزارہا الفاظ ہندی زبانوں میں شامل ہو گئے اور اہلِ ہند، ہندو ہوں یا مسلمان انھیں سمجھنے اور بولنے لگے۔ بے شبہ اردو کو اپنی موجودہ معیاری شکل اختیار کرنے میں بہت مدت صرف ہوئی اور مختلف مدارج و مراحل سے گزرنا پڑا لیکن اگر اس کے وجود میں آنے کا وہ سبب، جو اوپر بیان ہوا، مسلم ہے تو یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ مسلمان سب سے پہلے سندھ میں آئے اور یہیں ان کی زبان عربی اور پھر فارسی کا ہندی زبانوں سے ارتباط و اختلاط شروع ہوا لہٰذا یہ ایک واضح اور یقینی امر ہے کہ

---

[۱۶] نقوش سلیمانی صفحہ ۳۴، ۳۵ از سید سلیمان ندوی مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۶۷ء

اردو کا اصلی مولد سندھ ہے۔" ۱۷؎

پیر صاحب نے اپنے مضمون میں جو استدلال کیا ہے اس سے یہ بات تو بہر طور ثابت ہو جاتی ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا ربط وضبط سب سے پہلے اہلِ سندھ سے ہوا اور اسی سرزمین پر دو ثقافتیں اور دو زبانیں آپس میں گلے ملیں جس کا بدیہی اور لازمی نتیجہ یہ نکلنا چاہیئے تھا کہ بعض تمدنی اور لسانی اقدار مشترک وجود آجاتیں اور آہستہ آہستہ کچھ لفظ ایسے بن جاتے جو دو قوموں کی اجنبیت کو دور کر دیتے۔ سید سلیمان ندوی اور پیر حسام الدین راشدی دونوں نے یہی موقف اختیار کیا ہے، ڈاکٹر جمیل جالبی بھی اس موقف سے متفق نظر آتے ہیں، ان کے مطابق:۔

"غرض ان شواہد کے ٹکڑوں کو جوڑ کر جب دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے آنے کے بعد سرزمین سندھ پر ایک ایسی زبان کا رواج ہو گیا تھا جس میں ایک زبان کے بولنے والے دوسری زبان کے بولنے والے سے اظہار مدعا کرتے محمد بن قاسم سے لے کر دورِ مغلیہ تک اس زبان کا رواج اور اثر و نفوذ بڑھتا گیا اور یہ ایک ایسی زبان بن گئی جو عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ جیسے سندھ کے عمر کوٹ میں پیدا ہونے والا بچہ آگے چل کر شہنشاہ ہند اکبر اعظم کے نام سے مشہور ہوا، اسی طرح سندھ و ملتان میں پروان چڑھنے والی یہ زبان پنجاب اور ترک افغانوں کی توانائیوں کو جذب کر کے صدیوں بعد دہلی پہنچی اور وہاں کی بولیوں سے نیا رنگ و نور لے کر جلد ہی مسلمانوں کی فتوحات

۱۷؎ اردو زبان کا اصلی مولد سندھ، صفحہ ۱۲، سہ ماہی اردو مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی، اپریل ۱۹۵۱ء

کے ساتھ سارے برعظیم کی مشترک زبان بن گئی۔" [۱۸]

لیکن بعض ماہرین لسانیات کا نقطۂ نظر اس سے مختلف ہے

اختلاف صرف دلی، پنجاب، گجرات اور سندھ ہی کا نہیں ہے بلکہ بعض محققین یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمان درّہ خیبر کے راستے ہندوستان میں داخل ہوئے لہٰذا شمال مغربی سرحدی علاقے کو اولیت حاصل ہے اردو کے ابتدائی نقوش وہیں پیدا ہوئے پروفیسر محمد معین الدین دردائی کا خیال غالباً اسی نظریے پر دلالت کرتا ہے:۔

"ان تمام بیانات کو پڑھ کر اور اس سلسلے کی تمام کڑیوں کو ملا کر ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو "ہندی" اسلامی تمدن زبان کے ربط سے پیدا ہوئی اور یہ ربط تاریخی حیثیت سے سلطان محمود غزنوی کے عہد سے شروع ہوا لہٰذا یہ امر یقینی ہے کہ اردو کی ابتدا بھی اسی عہد سے ہوئی لیکن ابھی لسانی موشگافیاں اور ریسرچ ختم نہیں ہوتے ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم اور نواب حبیب الرحمٰن شیروانی مرحوم نے اردو کی داغ بیل کو مسلمانوں کی اولین آمد (یعنی فتوحات سندھ) سے وابستہ کیا ہے۔ میری رائے میں اس کی ابتدا مسلمانوں کی آمد سے بھی آگے عرب ایرانی تجار کی آمد سے کرنا زیادہ صحیح ہوگا کیونکہ ظہور اسلام سے قبل اہالیان عرب و فارس بحیثیت تاجر سواحل ہند پر وارد ہوتے رہے"۔ [۱۹]

پروفیسر دردائی مولانا ندوی کے خیال کا بالکلیہ رد کرتے ہیں مگر خود قوموں اور زبانوں کے ابتدائی ملاپ پر اپنے قیاس کی اساس رکھتے ہیں۔

---

[۱۸] تاریخ ادب اردو صفحہ ۶۸۰ مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۵ء۔

[۱۹] "لسانی مطالعے" صفحہ ۸۵ مطبوعہ مجلس دانشوران لاہور ۱۹۷۰ء۔

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کا بیان ہے کہ :-

"جو مسلمان فاتح ۱۱۹۱ء میں اور اس کے بعد آئے وہ ہندوستان ہی میں رہ پڑے۔ قبیلے اور حسب کے اعتبار سے وہ کچھ ہی ہوں لیکن کلچر اور تہذیب کے اعتبار سے وہ آرین تھے یا زیادہ محتاط رہ کر کہئے، وہ ایران کی شائستگی اور تمدن و معاشرت کے رنگ میں رنگے ہوتے تھے اور ایرانی اسی تنے کی ایک شاخ تھے جس کی دوسری شاخ ہند آرین تھے۔ اس کلچر کی یگانگی نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں فاتح اور مفتوح کی مغائرت کو محو کر دیا۔ جب دو مختلف قوموں کو ایک ملک میں رہنا ہوا تو وہ معاشرتی اور لسانی لین دین کے بغیر ناممکن تھا۔ اس لین دین اور اس یگانگی اور یکجہتی میں جو ہندو مسلمان کی روزمرہ زندگی اور سب سے زیادہ اردو کی پیدائش میں کارفرما ہوئی، کس نے زیادہ فراخدلی سے کام لیا؟ اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ اس کا تاریخی نظر سے مہتم بالشان نتیجہ آپ کے سامنے یہ اردو موجود ہے۔" ؎۲۰

محققین کا یہ اختلاف دراصل ایک اصولی بحث ہے جو "تصرفِ الفاظ" کے محور پر گھومتی ہے اور تصرف کی مسابقت میں سندھ کو اولیت ہے اس کا پلہ بھاری پڑتا ہے لیکن دلی، پنجاب و گجرات کی فضیلت کثرت تصرفات میں ہے۔ انجامِ کار اردو کی ولادت کا سہرا ایک سرزمین کے ماتھے سے مس ہو کر دوسری سرزمین کی پیشانی سے آلگتا ہے اور پھر تیسری کے سر باندھنے کی تیاریاں ہونے لگتی ہیں۔ اور درحقیقت ہے بھی یہ فیصلہ بہت دشوار۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق، سندھ کو اردو کا مولد نہیں مانتے پھر بھی اس کی اولیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ سندھ پراونشل اردو کانفرنس

؎۲۰ "کیفیہ" صفحہ ۳۱۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۵۰ء۔

۱۹۳۷ء کے خطبے میں فرماتے ہیں:۔

"اے اہلِ سندھ! اگرچہ اردو کی ابتدا آپ کے ملک سے نہیں ہوئی مگر سب سے پہلے مسلم ہندو تہذیبوں کی یکجائی آپ ہی کے ہاں شروع ہوئی اور آپ ہی نے یکجہتی میں وہ رنگ بھرا کہ جس کے نمونے کچھ دنوں پہلے تک دونوں قوموں کی رفتار و گفتار، خوراک و پوشاک وغیرہ میں نظر آتے تھے۔ اب بھی آپ کی زبان میں ہزاروں عربی فارسی کے لفظ بے تکلف بول چال اور تحریر میں آتے ہیں۔ گویا آپ نے وہ زمین تیار کی جس پر آگے چل کر اردو کے چمن نے رونق اور سرسبزی حاصل کی۔ اگرچہ ہم دونوں کی یک جہتی اور اتحاد کی اور بہت سی نشانیاں اب بھی موجود ہیں اور بہت سی مٹتی جاتی ہیں لیکن یہ زبان جو اردو یا ہندوستانی کہلاتی ہے۔ ہندو مسلم کی یکجہتی اور اتحاد کی سب سے بڑی اور زندہ یادگار ہے ــــــــ آپ کے صوبے کی زبان یو پی، پنجاب اور بہار کو چھوڑ کر دوسرے صوبوں کے مقابلے میں اردو سے قریب تر ہے ــــــــ ہزارہا فارسی، عربی کے لفظ آپ کی زبان میں رس بس گئے ہیں۔ فارسی زبان کا تسلط یہاں صدہا سال تک رہا ہے۔ عربی کی تعلیم اب تک جاری ہے۔ رسمِ خط تقریباً وہی ہے جو اردو کا ہے اور یہ سب سے بڑی سہولت ہے جو آپ کو حاصل ہے۔ جملے کی ترکیب و ترتیب وہی ہے جو اردو زبان کی ہے۔ آپ کے صوبے میں سینکڑوں اردو کے ادیب اور شاعر ہوئے ہیں اور اب بھی موجود ہیں۔" [۲۱]

بابائے اردو کا بیان بڑی حد تک غیر جانبدارانہ ہے جس کو انھوں نے بالفاظ دیگر ۱۹۵۹ء میں میرپور خاص کے کنونشن میں بھی دہرایا ہے۔

---

[۲۱] خطبات عبدالحق صفحہ ۵ امرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۶۳ء

"ہم سندھ میں یہی پیغام لے کر حاضر ہوئے اور اس یقین و اعتماد کے ساتھ کہ اہل سندھ اپنی روایتی مہمان نوازی کے ساتھ اس پیغام کا خیر مقدم کریں گے۔ ہمیں سندھ اس لئے عزیز ہے کہ برصغیر میں سب سے پہلے اسی سرزمین پر اسلام کی روشنی پہنچی اور پھر یہیں سے توحید کی صدائیں بلند ہو کر ایک طرف تو ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں سے ٹکرائیں اور دوسری جانب جنوب کی معطر فضاؤں اور مشرق کے سبزہ زاروں میں گونجیں ہمیں سندھ اس لئے عزیز ہے کہ یہیں حجازی تہذیب اور عربی ثقافت ہند قدیم کی تعلیم و روحانیت سے ہمکنار ہوئی اور پھر اس اتحاد و اشتراک سے ایک نئی تہذیب و ثقافت وجود میں آئی اور ہماری یہ قومی زبان اردو اسی تہذیب و ثقافت کا شاہکار اور اس کی زندہ جاوید یادگار ہے۔" ۲۲

اسی خطبے میں وضاحت مزید کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"اردو سندھ کے لئے اجنبی اور نامانوس نہیں اور بعض محققین کا تو یہاں تک خیال ہے کہ اردو زبان کا مولد و منبع بھی آپ کی وادی مہران ہے۔ ان کے دعوے کی بنیاد یہ ہے کہ اردو مسلمان اور ہندوؤں کے میل جول اور ان کے تہذیبی و ادبی اختلاط سے پیدا ہوئی اور چونکہ پہلے پہل یہیں عربوں کی حکومت قائم ہوئی اس لئے لامحالہ اردو نے بھی یہیں جنم لیا ہوگا اردو سندھ میں پیدا ہوئی یا گجرات اور دکن میں — لیکن بہرحال یہ حقیقت ہے کہ صدیوں پہلے بھی یہاں اردو کے استعمال کا سراغ ملتا ہے" ۲۳

بابائے اردو کا شمار ان محققین میں نہیں ہے جو سندھ کو اردو کی جائے

---

۲۲ خطبات عبدالحق صفحہ ۶۰۱ مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی سنہ ۱۹۶۴ء

۲۳ " " " " " " " " " ۶۰۴ " "

پیدائش قرار دیتے ہیں تاہم وہ اس سے انکار نہیں کرتے کہ اردو کے ابتدائی نقوش و آثار اسی ریگزار سے ابھرے اور یہی قیاسی اساس ہے اس نظریے کی جو سید سلیمان ندوی اور پیر حسام الدین راشدی کا ہے۔

لیکن اگر عربوں کی آمد ہی کو سندھ کی اولیت کا سبب قرار دیا جاتا ہے تو بقول پروفیسر درانی عرب تاجر قبل اسلام بھی ہندوستان کے ساحل سے گزرتے رہے تھے اور مکران سے لے کر ملایا تک سمندر کے کنارے کنارے کتنے ہی مقامات ان کی اقامت گاہ تھے اور بعض شواہد کے مطابق وہ جاوا اور سماترا تک پہنچتے تھے جہاں اپنے بعد اپنے ملک کی چند اصطلاحیں اور زبان کے کچھ الفاظ ضرور چھوڑ جاتے ہوں گے۔ لہٰذا اس سطح پر اگر سندھ کو لیا جائے گا تو دکن کے بہت سے مقامات اور اس سے آگے کے علاقے بھی آجائیں گے جبکہ دکن کے جنوبی ساحل پر عرب تاجروں کی بستیوں کا سراغ بھی ملتا ہے اور اکا دکا عربی لفظوں کے مستعمل ہونے کا پتہ بھی چلتا ہے اور مسئلہ صرف دکن ہی کا نہیں ہے بلکہ ایک سامنے کی بات تو یہ ہے کہ کسی ملک کے تجارتی قافلے دوسرے ملک کے کسی مخصوص مقام پر اگر بار بار جاتے ہوں گے تو وہاں سے کچھ ثقافتی اور لسانی تحائف بھی لاتے ہوں گے اور مقامی لوگوں کو اپنی کوئی یادگار ضرور دے آتے ہوں گے اس لئے اجنبیوں کا عارضی قیام کسی مستقل لسانی تاثر کی دلیل نہیں بن سکتا۔ ہاں پردیس کو وطن بنا لیا جائے تو لسانی اثر مستقل ہو سکتا ہے۔ اس نکتہ نظر سے دکن یا ہندوستان کا کوئی اور علاقہ سندھ کی سطح پر نہیں ٹھہرتا اور یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ سندھ وہ واحد خطہ ہے جس کی ثقافت اور زبان کو عربوں نے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ متاثر کیا۔

یہ حقیقت مسلم ہو جانے کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ سندھ میں دو قوموں کے اختلاط سے جو نئے الفاظ وجود میں آئے، کیا وہ اردو ہی کے تھے؟ بات کا ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان سے سندھی زبان کو وسعت ملی ور

آگے چل کر ان میں سے بعض الفاظ نے اردو کا چولا اختیار کر لیا جو وقت کا ایک ناگزیر تقاضا تھا۔

سندھ کی یہی صورت حال پنجاب، دلی، دکن، اودھ اور بہار ہر جگہ رونما ہوئی اور پہلے نئے نئے الفاظ زبان زد ہوئے جو مقامی بولیوں کا جزو بنتے رہے اور علیحدہ علیحدہ افعال ترکیبی کے ساتھ استعمال میں آتے رہے اور چونکہ مختلف علاقوں کی بولیوں میں ایک اساسی آہنگ تھا اور ان میں کی بیشتر ایک ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھیں لہٰذا مستقبل کے ملاپ میں بھی زیادہ دیر نہ لگی۔ بحث کے اس سلسلے میں اگر اُس دور کی بولیوں پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو سندھی، پنجابی، برج بھاشا اور اودھی کا بہناپا سامنے آجاتا ہے اور ان کے افعال میں جو فرق پایا جاتا ہے، اتنا ہی فرق نوزائیدہ الفاظ میں بھی ہے۔ آج بھی پنجاب کا آدمی سندھی، سرائیکی اور ملتانی کو آسانی سے سمجھ لیتا ہے اور ان تمام علاقوں کے رہنے والے پنجابی سے اجنبی نہیں ہیں۔ اُس زمانے میں بھی یہی بات تھی اور نئے مشترک نئے الفاظ بھی بن گئے تھے جو قدیم شہریوں اور جدید شہریوں دونوں کے لئے قابلِ فہم تھے۔

بعض ماہرین لسانیات شاید اردو کی پیدائش کا فیصلہ اس زاویۂ نگاہ سے کرتے ہیں کہ جس سرزمین پر سب سے پہلے جدید الفاظ نے جنم لیا، وہی اردو کا مولد ہے جبکہ یہ طے کرنا ہی ممکن نہیں کہ جدید الفاظ بننا کب شروع ہوئے تھے اور اگر اس کا کوئی تعین بھی کر لیا جائے تو الفاظ کسی زبان کی پوری ساخت پر دلالت تو نہیں کرتے اور کسی لفظ کا اطلاق جملے پر تو نہیں ہو جاتا ـــــــ پھر اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ لفظ مفرد ہو یا مرکب مگر رہتا ہے لفظ ہی جو کسی بھی زبان کے ڈھانچے میں استعمال ہو سکتا ہے جیسے آج انگریزی کے بہت سے لفظ اردو کے سلسلۂ گفتگو میں بولے جاتے

ہیں مگر وہ اردو کے لفظ کہلاتے ہیں۔ اسی طرح اُس دور میں بھی نوزائیدہ الفاظ سندھی، پنجابی اور دوسری تمام بولیوں میں گھر کر گئے تھے اور ایک طرح سے اُن کا جزو بن گئے تھے مگر تھے وہ سندھی، پنجابی یا کسی اور بولی کے لفظ۔

ہندوستانی لسانیات کے تدریجی تغیر و ارتقاء کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے ہر خطے میں بلا قید زمان و مکان الفاظ کے ذخیرے میں اضافہ ہوتا رہا اور ہر زبان میں ایک بڑی تعداد ایسے لفظوں کی شامل ہو گئی جو صوتی اور معنوی اعتبار سے مماثل تھے۔ کون سا لفظ ملک کے کس حصے میں کب سے مستعمل ہوا؟ اس کا پتہ لگانا ذرا مشکل ہے مگر یہ بتایا جا سکتا ہے کہ کسی مختص دور میں کون کون سے جدید الفاظ کن کن مقامی زبانوں میں بولے جاتے تھے ——— اور اس جائزے سے یہ استعجاب دور ہو سکتا ہے کہ برصغیر کا ہر حصہ اردو کا مولد ہونے کا دعویدار کیوں ہے؟

بات صرف اتنی ہے کہ شمال جنوب، مشرق و مغرب، ہر سمت کی مختلف بولیوں کے دامن میں مخلوط الفاظ کے گرانبار ذخیرے موجود تھے اور خود بولیوں کے مابین اسماء و افعال کی اقدارِ مشترک پائی جاتی تھیں جو اپنا اپنا مزاجی ثقل دور کرتی ہوئی آسان سے آسان تر کی طرف جا رہی تھیں۔ عین اسی صدی میں ایک نئی زبان ہریانی، برج بھاشا، کھڑی بولی، مالسی یا کسی اور زبان کے چولے میں دلی اور اس کے مضافات سے آہستہ آہستہ برآمد ہوئی اور نصف النہار کے آفتاب کی طرح اطراف و اکناف میں اپنی شعاعوں کو بکھیرنے لگی تو ہمالیہ سے راس کماری تک اور بحیرۂ عرب سے خلیج بنگال تک پھیلے ہوئے ہر گوشے نے اپنے کو اس سے مانوس سمجھا اور تھوڑے تھوڑے سے تغیر کے ساتھ اسی کو اپنی مروج زبان قرار دے دیا۔ کیونکہ اس زبان کے بیشتر لفظ وہاں سے پہلے سے موجود تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو پر سیماب اکبرآبادی کا یہ شعر صادق آتا ہے ؎

کہانی میری روداد جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

پروفیسر علی حیدر اسی خیال کا اظہار اپنے الفاظ میں یوں کرتے ہیں ۔

" اردو زبان کا مخرج ہندوستان کی مختلف پراکرتیں ہیں ۔ عربی فارسی اور ترکی نے رنگ و روغن کا کام کیا اور ایک زبان پیدا ہوئی جس نے اپنی ترقی کے مختلف ادوار میں مختلف نام پائے اور بالآخر اردو زبان کے نام سے موسوم ہوئی ۔ اس کی پیدائش کے لئے ایک مقام کو متعین نہیں کیا جا سکتا کیونکہ زبان کی پیدائش افراد کی پیدائش سے مختلف ہوتی ہے ۔ یہ صدیوں میں بطنِ ہند سے پیدا ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے آفاق گیر ہو گئی " [۲۴]

ڈاکٹر شوکت سبزواری ایک ماہر لسانیات کی حیثیت سے تحریر فرماتے ہیں ۔

" اُردو نے دلی ، میرٹھ اور اس کے نواح میں جنم لیا ۔ اس کو قریب قریب فن کے سبھی ماہروں نے مانا ہے ۔ لشکریوں کے ساتھ یہ زبان دکن اور گجرات پہنچی ۔ یہاں کے لوگوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی ۔ " [۲۵]

ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں ۔

" دہلی کی یہ زبان لشکریوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے جن جن گوشوں میں جاتی ہے ، وہاں وہ ایک باوقار بولی کی شکل اختیار کر لیتی ہے ۔ " [۲۶]

۲۴؎ نقد ادب صفحہ ۵ مطبوعہ کتاب منزل ، سبزی باغ پٹنہ ۱۹۶۰ء

۲۵؎ لسانی مسائل صفحہ ۱۲۵ مطبوعہ مکتبہ اسلوب کراچی ۱۹۶۳ء

۲۶؎ مقدمہ تاریخ زبان اردو صفحہ ۱۰۵ مطبوعہ اردو مرکز لاہور ۱۹۶۶ء

اس مختصر سے تاریخی جائزے کے بعد یہ حقیقت مسلّم ہو جاتی ہے کہ مشترک الفاظ سب سے پہلے سندھ میں پیدا ہوئے، پھر پنجاب، دہلی، گجرات دکن، اودھ اور ہندوستان کے دوسرے حصّوں میں —— یہ الفاظ اگرچہ ابتداً مقامی بولیوں کا جزو تھے مگر آگے چل کر انھوں نے بین الاقوامی اور بین اللسانیاتی کردار ادا کیا اور آج وہ ایک طرف اردو کے لفظ ہیں تو دوسری طرف سندھی، ملتانی، پنجابی، گجراتی اور دیگر زبانوں میں مفہوم کی یکسانیت کے ساتھ بولے جاتے ہیں اور اردو کے سرمایہ مشترک ہونے کی دلیل پیش کرتے ہیں بقول ڈاکٹر فرمان فتحپوری:

"حقیقت یہ ہے کہ اردو میں خود اس کا اپنا کچھ نہیں ہے بلکہ اس کا سرمایہ دوسری زبانوں سے آیا ہے، یا یوں کہہ لیجیے کہ اردو کی بنیاد ہی مختلف زبانوں کے اشتراک پر رکھی گئی ہے۔ اردو گویا بین الاقوامی زبانوں کی ایک انجمن ہے جس میں شرکت کے دروازے عام و خاص ہر زبان کے الفاظ پر یکساں کھلے ہوتے ہیں چنانچہ اردو زبان کا کوئی ایک فقرہ بھی ایسا نہیں مل سکتا جس میں دو تین زبانوں کے الفاظ شامل نہ ہوں۔" [۲۷]

اسی خیال کا اظہار استاذی ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے فیصلہ کن انداز میں اس طور پر کیا ہے:۔

"اردو میں پراکرتی عناصر سنسکرت عناصر سے بھی زیادہ نمایاں ہیں کیونکہ درحقیقت یہ پراکرتیں برصغیر کے مختلف علاقوں میں عوامی بولیاں تھیں اور انھیں عوامی بولیوں نے ارتقائی منزلیں طے کر کے جدید ہندوستانی زبانوں کا روپ پایا ہے اور اردو بھی

۲۷؎ زبان اور اردو زبان صفحہ ۳۰ مطبوعہ آئینہ ادب لاہور ۱۹۷۳ء

ایسی ہی ایک عوامی پراکرت کی ترقی یافتہ شکل ہے جسے مہاراشٹری اپ بھرنش کہتے ہیں ۔ پراکرت کی سب سے بڑی روایت اس کا عوامی عنصر ہے اور یہی عنصر اردو نے اپنے ورثے میں پایا ہے یہ کسی خاص علاقے ، مذہب ، کسی خاص فرقے ، قبیلے ، خطے ، طبقے یا جماعت کی زبان نہیں ۔ اس کی تشکیل و ترویج میں برصغیر کے تمام صوبوں ، علاقوں ، ان کے لوگوں کی مقامی بولیوں ، لوک گیتوں ، کہانیوں اور سنگیت نے حصّہ لیا ہے اس لئے اردو قید مقام سے آزاد ہے ۔ کبھی پنجاب کے لہلہاتے ہوئے سبزہ زاروں میں اس نے بچپن گزارا ۔ کبھی دلی کی گلیوں اور بازاروں میں اسے پھرتے دیکھا گیا ۔ اس کی جوانی کی اٹھان دکن اور گجرات میں ہوئی پھر یہ شمالی ہند میں لوٹی تو دلی کی شاہی اسے نصیب ہوئی ۔ دلیّ اجڑ کر فیض آباد اور لکھنؤ پر رونق آئی تو اس نے پورب دیس کو اپنا مسکن بنایا لیکن اس کی آواز سرحد کے بلند پہاڑوں ، بنگال کے دریاؤں ، لہلہاتے دھانوں کے کھیتوں ، سندھ کے روپہلے چمکتے ریتیلے میدانوں ، کشمیر کے سبزہ زاروں اور جوئباروں میں ہر جگہ سنائی دیتی رہی ۔ جدید ہندوستانی پاکستانی زبانوں میں یہ وسعت ہمہ گیری اور پھیلاؤ اردو ہی کے حصّے میں آیا ہے اور آج بھی یہ اس کی ایک ممتاز روایت ہے ۔ “

ربطِ تحریر میں وہ آگے چل کر تحریر کرتے ہیں ۔

” اس سلسلے میں ایک نکتہ قابلِ لحاظ یہ ہے کہ اس لسانی مفاہمے میں کہیں بھی جبر و اکراہ یا تہدید نظر نہیں آتی ۔ یہ زبان کسی پر ٹھونسی نہیں گئی ، نہ کسی علاقے پر عائد کی گئی ، نہ اس کے بولنے اور لکھنے والوں کو انعام و اکرام سے سرفراز کیا گیا اور نہ اسے قبول

کرنیوالوں سے جواب طلب ہوا بلکہ یہ سارا لسانی عمل نرم روی سے
خود اختیاری طور پر ہوتا رہا۔ معاشی اور تمدنی ضروریات نے اسے
تقویت پہنچائی اور عوام نے اسے توانائی بخشی۔ عرصہ تک یہ غلط
فہمی عام رہی کہ اردو لشکری بولی تھی۔ جو مسلمان فاتحین نے اس
ملک پر مسلط کی لیکن اب اس غلط فہمی کا پردہ چاک ہو چکا ہے
شاہجہاں کے بازار" اردوئے معلیٰ" سے اس کا رشتہ بھی محض
ایک فسانہ نکلا۔ حقیقت اس کے برعکس ہے کہ اسے شہنشاہوں اور
امیروں نے منہ بھی نہیں لگایا۔ وہ سب فارسی کے پرستار اور
ایران کے عاشق تھے۔ جب مغلوں کا اقتدار شباب پر تھا، اس
وقت بھی دلی کے دربار میں ایرانی شعراء فارسی قصائد کے صلے میں
موتیوں اور سونے سے تولے جاتے تھے۔ اردو میں شعر کہنا شاید
شعرائے ہند کے بھی مرتبہ سے کم کی چیز سمجھا جاتا تھا۔ اس طبقے کے
لوگ اردو کی طرف مائل بھی ہوتے تھے تو محض تفنن طبع یا منہ کا مزہ
بدلنے کے لئے۔ اردو کو جوان ہونے اور پروان چڑھنے کے لئے
صوفیوں کی خانقاہیں، مبلغین کی مجلسیں اور اللہ والوں کی محفلیں
تلاش کرنا پڑیں۔ ان کے بھی دربار تھے مگر شاہی دربار نہ تھے۔ یہ
عوام کے لئے کھلے تھے۔ یہاں شرافت کی زبان، ثقافت کی زبان،
اور تہذیب کی زبان کا سکہ نہیں چلتا تھا، یہاں عوام کے دلوں
میں اترنے کے لئے عوام کی بولی کا رواج تھا چنانچہ اردو کی ابتدائی
نشوونما میں سب سے زیادہ صوفیائے کرام ہی نے کام کیا ہے۔" ؎۲۸

؎۲۸ ادب و لسانیات" صفحہ ۳۰۲ اور ۳۰۶، ۳۰۷ مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۶۸ء

لیث صاحب کا بیان اگرچہ قید زماں سے آزاد ہے مگر اپنے پیشرؤں اور معاصرین میں سے اکثر کے خیالات سے ہم آہنگ ہے، بالخصوص ڈاکٹر زور کے نظریے کا موید ہے ـــــ جہاں تک زبان کے نفاذ کے لئے تعین وقت کا تعلق ہے، اس کی وضاحت خود ڈاکٹر صاحب نے پہلے ہی کر دی ہے کہ اردو کوئی آمرانہ حکم تو تھا نہیں جو عوام کے سر تھوپ دیا جاتا' وہ تو ضرورت کا ایک تقاضا تھا جو بلاارادہ پورا ہونا شروع ہو گیا تھا اور اس کی ابتدا ء ہندوستان میں مسلمانوں کے ورود سے ہو گئی تھی لیکن کثرت استعمال دلی اور اس کے نواح میں ہوئی جس کے لئے مغل دور کو مختص نہیں کیا جا سکتا بلکہ وہ زمانہ لیا جا سکتا ہے جب مہاراشٹری اپ بھرنش مروج تھی ـــــ جس کی تائید نتیجے کے طور پر پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کے بیان سے ہوتی ہے۔

" اردو کی تدوین اور تنظیم دہلی میں ہوئی اور وہیں اس کو ادبی حیثیت ملی۔ اردو کا پہلا شاعر امیر خسرو اور پہلا ناثر حضرت گیسو دراز ہیں۔ اردو کی سب سے پرانی غزل جو ملتی ہے۔ وہ ایک ہندو شاعر تخلص برہمن کی ہے۔ دہلی سے اردو دکن گئی۔ "[۲۹]

مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں اردو کے اٹھان پر نظر ڈالی جائے تو محسوس ہوگا کہ عوامی زندگی میں یہ نئی بولی قبول عام حاصل کرتی ہوئی آگے بڑھی تو لین دین کے لئے بازاروں اور بین الاقوامی معاشرتی سطح سے گزری اور سلاطین و امراء کو کتراتی ہوئی ان حلقوں میں جگہ بنانے لگی جو مذہب وملت اور طبقاتی اونچ نیچ سے پاک تھے اور ظاہر ہے کہ یہ حلقے انھیں صوفیائے

---

۲۹ "کیفیہ" صفحہ ۹۵ مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی سنہ ۱۹۵۰ء

کرام اور مبلغین کے ہو سکتے جنھوں نے نسل انسانی کے سدھار کے لئے اپنے کو وقف کر دیا تھا۔

اردو کو متقدمین نے بازار لشکر سے منسوب کیا ہے۔ یقیناً یہ زبان بازار لشکر میں بھی ضرور تاً بولی جاتی ہوگی مگر اس کی اصل جگہ وہ بازار تھا جہاں مقامی اور غیر مقامی لوگ خرید و فروخت کرتے تھے ـــــــ یہ اور بات ہے کہ مقبول عام اور مجموعہ السنہ زبان اس وقت تک اردو کے نام سے پکاری نہیں گئی جب تک اس پر قلعہ معلیٰ کی چھاپ نہ لگ گئی اور وہ شاہجہانی لشکر سے منسوب نہ ہو گئی۔

عقلی اور قیاسی دلائل کی اس روشنی میں اردو کے تدریجی ارتقار کا پس منظر سیکڑوں سال کا احاطہ کرتا ہے جو تعین زماں اور تقید مکاں کسی کا پابند نہیں۔ ہاں الفاظ کے ابتدائی استعمال کا وقت متعین ہو سکتا ہے اور وہ وقت وہی ہے جب عرب مجاہدین کی اذانیں پہلے پہل سندھ کے ریگزاروں میں گونجیں اور دو اجنبی قوموں کا باہمی اختلاط عمل میں آیا۔

تاریخ کی تدریجی ترقی کے ساتھ اردو الفاظ کا استعمال

تصور کی آنکھ سے دیکھا جائے تو ساڑھے بارہ سو سال قبل کا وہ منظر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جب کوئی سندھی قیدی کسی عرب سالار کے سامنے پیش ہوا ہوگا اس سے عربی میں کچھ پوچھا گیا ہوگا مگر سندھی کچھ سمجھ نہ سکا ہوگا ـــــــ اور اگر یہ مان لیا کہ عربوں کو ایسے لوگ مل گئے ہوں گے جو عربی اور سندھی دونوں زبانوں سے واقف تھے اور انھوں نے ترجمانی کے فرائض انجام دیئے ہونگے تب بھی اس کے بعد کی اجتماعی زندگی میں ہر موقع پر ترجمان تو موجود نہ رہے ہوں گے۔ عربوں نے اپنی زبان میں کسی سندھی سے "بصل" لانے کے لئے کہا ہوگا اور وہ پیاز کے بجائے مٹی کا بدھنا اٹھا لایا ہوگا۔

ہاتھ کے اشارے سے پیاز کی شکل اور اس کا استعمال بتایا گیا ہوگا تو وہ کوئی گول ترکاری لے آیا ہوگا۔ لانے والا اگر گاؤدی رہا ہوگا تو اس وقت تک پیاز کو نہ سمجھا ہوگا جب تک اس کو کوئی گٹھی منگا کر دکھا نہ دی گئی ہو۔ اور بتایا نہ گیا ہو کہ ھٰذا بصل۔ اس کے بعد ایک سے دوسرے سندھی کو معلوم ہوا ہوگا کہ پیاز کو عرب بصل کہتے ہیں۔

اب سندھ میں بصل کے دو نام معروف ہو گئے ہوں گے۔ ایک عربی، ایک سندھی۔ پھر سندھی نام کا استعمال آہستہ آہستہ کم ہوتا رہا ہوگا اور بصل زبان زد ہو گیا ہوگا ـــــ وہ دن ہے اور آج کا دن کہ سندھ میں پیاز کو بصل ہی کہا جاتا ہے۔

یہ ایک قیاسی مثال تھی۔ تحقیق کے ساتھ کہا نہیں جا سکتا کہ سب سے پہلے کون سا عربی لفظ سندھ کی سرزمین پر مستعمل ہوا مگر ہوگا وہ ضروریاتِ زندگی ہی میں سے کسی شئے کا نام۔ اس کے بعد ناموں کی بھرمار ہو گئی ہوگی اور بہت سے سندھی نام بھی عربوں کی زبان چڑھ گئے ہوں گے۔ بعض نام ایسے بھی ہوں گے جو تلفظ اور املا بدل کر مستعمل ہونے لگے ہوں گے۔

اب ناموں کا یہی قافلہ مستقبل کی حدیں توڑتا ہوا آگے بڑھا تو اس نے سندھ کی عوامی بولی کا مزاج بدل کر رکھ دیا ـــــ اجنبیت کے پرخچے دھیرے دھیرے چاک ہو چکے تھے، مغائرت ایک اپنائیت کا قالب اختیار کر چکی تھی۔ دیسی اور پردیسی ایک دوسرے کے رسم و رواج سے آشنا ہو گئے تھے اور آپس کی افہام و تفہیم کا ذریعہ ہر ایک کے لئے آسان ہوتا جا رہا تھا کیونکہ بولیوں میں ایسے لفظ شامل ہو چکے تھے جن کو عرب، ایرانی اور سندھی سب سمجھتے تھے۔ یہی وہ لفظ ہیں جن کی اکثریت آج بھی اردو میں مستعمل ہے۔

عرب دور کی کوئی تمدنی یا ثقافتی تاریخ ہوتی تو یہ پتہ لگانا چنداں

دشوار نہ تھا کہ شروع شروع میں کن عربی اور فارسی الفاظ کو اہلِ سندھ نے استعمال کیا مگر ایسی کوئی باقاعدہ کتاب کسی زبان میں موجود نہیں البتہ بعض سفرنامے اور تذکرے پائے جاتے ہیں جن سے اتنا سراغ ملتا ہے کہ

"جبل ، جمل ، بصل ، بقوم ، دلو بالکل ابتدائی الفاظ میں ہیں جو سندھ میں رائج ہوئے اور آج بھی اسی طرح بولے اور سمجھے جاتے ہیں۔" ؎۳۰

اس کے بعد یقیناً نو بنو الفاظ کا اضافہ ہوتا رہا ہوگا تب ہی سندھ میں مروّج عربی الفاظ کا جو ذخیرہ ہے وہ اردو سے کسی طرح کم نہیں۔

فارسی عرب دور میں بھی عربی کے ساتھ ساتھ لگی ہوئی تھی کیونکہ عرب سپاہیوں میں ایک تعداد فارس نژاد تھی لہٰذا فارسی الفاظ کو اپنی جگہ بنانے کا موقع مل گیا۔ اس کے علاوہ خود اہلِ سندھ کا ایران سے قدیمی رابطہ تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ ۹۵۱ء میں بغداد کا سیاح اصطخری جب ہندوستان آیا تو مکران میں مکرانی کے ساتھ فارسی بھی بولی جاتی تھی۔ یہ واقعہ سلطان محمود کے حملے سے باسٹھ سال پہلے کا ہے پھر ۹۸۵ء میں بشاری مقدسی سندھ آتا ہے تو ملتان میں فارسی کا رواج ملتا ہے جس کا اثر مقامی زبانوں پر پڑنا ناگزیر تھا۔ لہٰذا سندھی پر فارسی کے اثرات روز افزوں ہوگئے اور جب سندھ میں غزنوی حکومت قائم ہوگئی تو حقیقتاً فارسی کی حاکمیت کا دور شروع ہوگیا اور سندھی پر بڑی تیزی کے ساتھ فارسی الفاظ کا عمل دخل شروع ہوگیا۔

عربی اب بھی ایک مذہبی لگاؤ کے باعث قابلِ توجہ تھی اور اس کی

؎۳۰ "اردو سندھی کے لسانی روابط" صفحہ ۸۵ مصنفہ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۷۰ء

بے شمار اصطلاحیں اور الفاظ سندھی زبان کا جزو بن چکے تھے جیسے اللہ، ایمان، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، دعا، خیرات، صدقات، رسول، وحی کتاب الٰہی وغیرہ۔ سیاسی، تمدنی، صنعتی، تجارتی اور علمی اصطلاحات ان پر مستزاد تھیں۔ یہ سب کے سب آج بھی روز اول کی طرح رائج ہیں، بجز ان الفاظ اور اصطلاحوں کے جن کی جگہ فارسی کے سبک الفاظ نے لے لی ہے پھر بھی وہ ہیں انھیں زبانوں کا عطیہ جنھوں نے اردو کو گرانبار کیا ہے اور بعینہٖ اردو پر وہی اثرات مترتب کئے ہیں جو ابتدائً سندھی پر کئے تھے لہٰذا سرزمین سندھ پر انھیں بھی اردو کے ابتدائی نقوش میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

اس مقام پر یہ حقیقت فراموش نہیں کی جا سکتی کہ سندھ ہی عرب و ایران سے متاثر نہیں ہوا، خود سندھ نے بھی دونوں ملکوں اور وہاں کی زبانوں پر مستقل اثر قائم کیا۔ سندھ کے پنڈت بارہا بغداد بلائے گئے اور وہاں انھوں نے عربی میں اپنی زبان کی بعض کتب کے ترجمے میں مدد دی[۳۱]

فارسی پر سندھی یا ہندی اثرات کے ثبوت میں حکیم سنائی ۱۱۰۱ء کا شعر پیش کیا جا سکتا ہے۔

اسامی دریں عالم است از نہ حاشا
چہ آب و چہ نان و چہ میدہ، چہ پانی

منوچہری کا ایک شعر بھی قابلِ ملاحظہ ہے۔

الا تا مومناں دارند روزہ		الا تا ہندواں گیرند لنگھن[۳۲]

---

[۳۱] نقوش سلیمانی صفحہ ۱۳ مصنفہ سید سلیمان ندوی مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۶۰ء

[۳۲] نقد ادب صفحہ ۱۳ مصنفہ پروفیسر علی حیدر مطبوعہ کتاب منزل پٹنہ ۱۹۶۰ء

ایک مصرعہ مسعود سعد سلمان (۱۱۲۱ھ) کا بھی ان اثرات کی نظیر ہے۔

ع برآمد از پس دیوار حصن "مارا مار" ۳۳

"پانی" اور "مارا مار" فارسی میں ڑنہ ہونے کے باعث اس طرح استعمال ہوئے ہیں جو اس بات کا بدیہی اشارہ ہیں کہ سندھی کے بعض الفاظ کا تلفظ اردو میں آکر بدل کیوں گیا؟

پروفیسر محمود شیرانی نے فارسی میں استعمال ہونے والے ہندی الفاظ کی ایک طویل فہرست غزنویوں اور سلطنت دہلی کے زمانے کی فارسی تصانیف سے مرتب کی ہے جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی زبان میں سیکڑوں الفاظ یہاں کی زبان کے داخل ہو گئے تھے۔ ۳۴

اس کے برعکس سید سلیمان ندوی نے ہر شعبے کی ان اصطلاحات کو یکجا کر دیا ہے جو مسلمانوں کے دم قدم سے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں رواج پائیں جن میں سندھ بھی شامل ہے۔ یہاں بھی یہ اصطلاحات من وعن یا قدرے ترمیم کے ساتھ مروج ہیں۔ سید صاحب اصطلاحات کے نام دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ان مثالوں سے مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں نے جب یہاں قدم رکھا تو اپنے پورے تمدن و معاشرت، ساز و سامان اور اپنی اصطلاحات اور ایجادات کو ساتھ لے کر یہاں وارد ہوئے اور ان سب کے لئے نام، اصطلاحات اور الفاظ بھی اپنے ساتھ لائے اور چونکہ یہ ہندوستان میں بالکل نئی چیزیں تھیں اس لئے ہندوستان کی بولیوں میں ان کے مرادفات کی تلاش بیکار

---

۳۳ تاریخ ادب اردو صفحہ ۶۷، مصنفہ ڈاکٹر جمیل جالبی مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۵ء

۳۴ مقالات محمود شیرانی جلد اول صفحہ ۴، ۵ مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۶ء

تھی اور وہی الفاظ ہندوستان میں رائج ہو گئے۔" ۳۵

سید صاحب کے مبینہ ناموں میں سے بلاشبہ عربی و فارسی کے بہت سے نام سندھ میں اسی طرح استعمال کئے جاتے ہیں لیکن یہ نام کب سے رائج ہوئے، اس کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ قیاس یہی کیا جا سکتا ہے کہ عربی نام پہلے اور فارسی نام بعد میں مروج ہوئے اور پھر وہی نام اردو میں منتقل ہو گئے۔ یہ منتقلی سندھ سے ہوئی ہو، یا پنجاب سے، گجرات سے یا دکن سے لیکن منتقلی ہوئی ضرور اور اکثر لفظ متعلق زبانوں سے براہِ راست بھی لئے گئے لیکن یہ امر مسلمہ ہے کہ ایسا ہر عمل برسوں کے فصل سے ہوا کیونکہ پنجاب کی طرح سندھ پر بھی عرب و ایران کا ثقافتی اور لسانی اثر بتدریج پڑا اور سندھ کی زبان میں جن نئے الفاظ کا اضافہ ہوا، وہ بلا ارادہ خود بخود اور آہستہ آہستہ۔

جہاں تک اردو کا تعلق ہے، سندھ میں اس کے مروج الفاظ کی تفصیل سند کی محتاج ہے۔ سب سے پہلا فقرہ ساتویں صدی ہجری کی چھٹی دہائی کے آخر میں استعمال ہوا جس کو اردو نثر کا پہلا فقرہ قرار دیا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ محمد تغلق نے ۱۳۵۱ء میں ٹھٹھہ پر حملہ کیا تھا اور وہ اسی حملے کے دوران مر گیا پھر دس سال بعد فیروز تغلق نے ٹھٹھہ پر یلغار بولی مگر اس کو ناکام اور بیمار ہو کر پلٹنا پڑا۔ اس کو اہلِ سندھ نے ایک مقامی بزرگ شیخ پٹھا کی کرامت قرار دیا اور بیساختہ ان کی زبانوں پر آ گیا۔

"برکت شیخ پٹھا، ایک موا ایک نٹھا"، ۳۶

۳۵۔ نقوش سلیمانی صفحہ ۳۰ مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۳۹ء

۳۶۔ تاریخ فیروز شاہی از شمس سراج عفیف صفحہ ۲۳۱ مطبوعہ دار الطبع جامعہ عثمانیہ سرکار ۱۹۳۸ء

"دونٹھا"، پنجابی، راجستھانی اور کئی زبانوں میں بھاگ جانے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ شیخ پیٹھا کی برکت سے ایک مرگیا اور دوسرا فرار ہوگیا۔ مخلوط زبانوں کے اس فقرے کو اردو اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس دور میں اردو کی مخلوط صورت ایسی ہی کچھ تھی۔ البتہ ایک صدی کے بعد گجرات میں حضرت قطب عالم کی زبان سے جو دو جملے ادا ہوئے وہ قدرے واضح ہیں "لوہ ہے، لکڑ یا پتھر یا کیا ہے"۔ "چشتیوں نے پکائی اور بنجاریوں نے کھائی۔" پھر بھی اولیت سندھ کے فقرے کو ہے۔ لیکن ڈاکٹر نبی بخش بلوچ اس کو اردو نہیں مانتے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ لفظ نٹھا نہیں بلکہ ٹٹھا ہے جو خالص سندھی لفظ ہے اور جس کے معنی ہیں، بھاگا۔[۳۷]

ڈاکٹر بلوچ کے اس خیال کی تردید یا تائید نہیں کی جا سکتی کیونکہ تائید ان حالات میں کی جاتی جب تاریخ فیروزشاہی کے کسی نسخے میں ٹٹھا لکھا ہوا ملتا اور تردید اس لئے نہیں کی جا سکتی کہ اردو اس وقت تک باقاعدہ وجود میں آئی ہی نہیں تھی۔ ہندوستان کے مختلف حصّوں میں مختلف انداز سے مستقبل کی ایک مخلوط زبان کا ڈول پڑ رہا تھا اور سندھ کی صورت حال بھی کچھ اسی طرح کی تھی لہٰذا اگر یہ فقرہ سندھی کا ہو تو بھی اس کی ساخت عوامی مزاج کو اس راستے پر لا رہی تھی جہاں سے اُردو کی حد شروع ہوتی ہے اور جس کا ثبوت ذخیرۃ الخوانین سے مل جاتا ہے جو اس واقعہ کے تین سو سال بعد لکھی گئی۔ یہ کتاب شیخ فرید بھکری کی ہے جن کا زمانہ اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط کا تھا۔ انھوں نے مغل عہد حکومت کے مشاہیر کے حالات قلم بند کئے ہیں جن میں سے بیشتر لوگ سولھویں صدی

۳۷۔ تذکرہ صوفیائے سندھ صفحہ ۳، مصنفہ مولانا اعجاز الحق قدوسی مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی سنہ ۱۹۵۹ء

عیسوی کے ہیں یعنی متذکرہ واقعہ کے کوئی دو سو سال بعد کے اور اس دور میں سندھ سے متعلق جو الفاظ فقرے اور دوہے ملتے ہیں، وہ بے کم و کاست اسی لسانی مزاج کو پیش کرتے ہیں جو دلی، گجرات اور پنجاب سے منسوب ہے صاحب ذخیرۃ الخوانین راجہ رامداس کچھواہہ کی مدح میں کسی شاعر کا کہا ہوا ہندی زبان کا ایک دوہہ نقل کرتے ہیں جس کو بلا شک و شبہ ابتدائی اردو کہا جا سکتا ہے۔

کہ کہاں لوں بکھان کروں اودات رامداس
ہری دیبی مال کوں حمال ہیریت ہیں ۳۸؎

اس سے قبل اسی کتاب میں خنجر بیگ چغتائی کے تذکرے میں جو فارسی عبارت ہے اس میں "در باب اکھاڑہ" استعمال ہوا ہے۔ "اکھاڑہ" آج کی اردو میں بھی اسی طرح مستعمل ہے ۳۹؎۔

پھر ایسے ہی ان گنت الفاظ مختلف لوگوں کے بیان میں آتے ہیں جو فارسی جملوں کے بیچ بیچ سندھ میں ٹھیٹ ہندی یا ابتدائی اردو کے وجود پر دلالت کرتے ہیں مثلاً دیانت رائے مہتہ کے ذکر میں "بلبلاس ستانیاں" حکیم علی کے بیان میں "یک پوری دارد"، اور دوسرے مشاہیر کے تذکرے میں بھٹی شراب اور ڈھولکی وغیرہ۔

یہ الفاظ بعض جگہ تو خود صاحب تذکرہ کے ہیں اور بعض مقامات پر کسی اور کے جو اس شخصیت سے متعلق ہیں جس کا بیان شیخ فرید بھکری نے کیا ہے اور اس طرح ان الفاظ کی جڑیں ماضی میں صدی ڈیڑھ صدی تک چلی جاتی ہیں۔

۳۸؎ ذخیرۃ الخوانین صفحہ ۲۰۹ مطبوعہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی ۱۹۶۱ء

۳۹؎ " " " ۲۲۹ " " " " "

بعض افراد کے متعلق شیخ فرید نے لکھا ہے کہ وہ ہندی زبان سے پوری طرح واقف تھے۔ جیسے میر محمد فاضل۔ یہی وہ بزرگ ہیں جنھیں سندھ میں اردو کا پہلا یا دوسرا شاعر بتایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ انھیں اس زبان میں کافیاں کہنے میں مہارت حاصل تھی۔

اردو نے یقیناً اب تک اپنا اصلی نام اختیار نہیں کیا تھا اور ایک مخلوط زبان کی شکل میں ہر جگہ بولی جاتی تھی۔ ثقہ لوگوں کی زبان فارسی تھی لہٰذا اس زبان کو عموماً ہندی کہہ دیا جاتا تب ہی ملا عبدالقادر بدایونی نے ایک مقام پر لکھا ہے۔

"سندھی درویش اتنے پرسوز لحن میں نغمۂ ہندی گاتے تھے
کہ مجھ پر اس کا بہت اثر ہوا۔" [۴۰]

یہ بات اس حقیقت پر روشنی ڈالتی ہے کہ سندھیوں میں بھی ہندی دوہوں اور گیتوں کا رواج تھا۔ ایک دوسرا واقعہ سولھویں صدی عیسوی کے وسط کا سید محمد مطیع اللہ راشد برہانپوری نے لکھا ہے کہ شیخ عیسیٰ المسیح الاولیا والی خاندیش کی دعوت پر جب سندھ کے قصبۂ پاتری سے ہجرت کر کے برہان پور میں جا کر آباد ہوئے تو ایک دن آپ سے پوچھا گیا کہ دنیا چہ باشد تا بداں اجتناب نمودہ آید؟

جواباً آپ نے فرمایا۔

جے ہر گول بسرا دے سہی
دنیا ناؤں اسی کا کہی [۴۱]

یہ دوہا ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے اس خیال کی تصدیق کرتا ہے کہ

۴۰؎ منتخب التواریخ حصہ سوم ص ۲۲ مطبعہ کالج پریس کلکتہ ۱۸۶۹ء

۴۱؎ برہان پور کے سندھی اولیا صفحہ ۲۰ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد ۱۹۵۷ء

مخلوط زبان کے مراکز حقیقتاً دارالتبلیغ اور خانقاہیں تھیں جہاں عوام کی ذہنی اصلاح کے لئے انھیں کی زبان میں بات کی جاتی تھی۔ اس سلسلے میں پنجاب ہو یا دلی، گجرات ہو یا سندھ سب ایک سطح پر تھے اور اردو کی داغ بیل ہر علاقے میں متوازی طور پر پڑ رہی تھی۔

سندھ میں ہندی دوہوں کے رواج کے ثبوت میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے سید محمد میر عدل کا تذکرہ کیا ہے جو عہدِ اکبری کے منصب دار تھے اور جن کے پانچ لڑکوں میں سے تین کے نام ابوالفضل، ابوالقاسم اور ابوالمعالی تھے۔ ان پانچوں نے راجہ جے مل فتح سنگھ کے مقابلے میں بڑی بہادری کے جوہر دکھائے تھے اور کسی شاعر نے ان کے کارناموں کو نظم کیا تھا جو شمالی ہند کے ساتھ ساتھ راجستھان اور سندھ میں بھی مشہور ہو گئے تھے۔

دل بادل کجسر د گھٹا فوج کا فر نوکائے

عادل محمد کے تھابلی سندر قاسم شاہے

پڑی دھما کے چوٹ تھر تھر کانپے کوٹ

. . . . جائے چھپے گھر اوٹ

دھنت پکڑ کے جائے چھپو ہنڈ ہے دھر لاج

جرس کا بنڈ لا یو چھٹا جیسے معالی قاسم باج

نالے ہم چلیں تم چلے چلے خان سلطان!

معالی قاسم جب چلیں جنگھ چُم اگنھے بھان [۲۲]

ان شواہد سے سندھ کی لسانی حالت کا لگ بھگ وہی نقشہ سامنے آ جاتا ہے جو ہندوستان کے دوسرے خطوں کا تھا یعنی سرکاری زبان فارسی

---

[۲۲] تاریخ ادب ... ص ۷۰۹، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۵ء بحوالہ تاریخ امروہہ جلد اول از محمود احمد عباسی صفحہ ۳۰۹ مطبوعہ دہلی۔

کے دوش بدوش ایک مقامی زبان کی کارفرمائی اور اس کے ساتھ ساتھ حسب ضرورت ایک مخلوط زبان جو مختلف القوم افراد کی ملاقات کے موقع پر بولی جاتی۔ مقامی زبانوں کی ہیئت ہر جگہ وقت کے ارتقار کی ہم آہنگ تھی اور ہر زبان مخلوط زبان کے قریب سے قریب تر آتی جا رہی تھی۔

اس کو بھی ایک اتفاق ہی کہنا چاہیئے کہ سندھ، ملتان اور راجستھان کی زبانیں قریب المخرج تھیں، پنجاب، دلی اور گجرات کی بھی وہی صورت تھی اور خود سندھ و پنجاب کی زبانوں میں بھی زیادہ فصل نہ تھا لہٰذا جب اپ بھرنش کے ڈھانچے میں اردو کا بے نام یا مختلف الاسم قالب تیار ہوا تو کسی نے اس سے اجنبیت محسوس نہ کی کیونکہ اپ بھرنش کا تقریباً ہر زبان سے ماں بیٹی کا رشتہ تھا۔

سندھی اپنے افعالِ ترکیبی کے لحاظ سے قدرے مختلف تھی مگر اتنی مختلف بھی نہیں کہ دوسری زبانوں اور ابھرتی ہوئی اردو کے مقابلے میں اقدار مشترک سے خالی ہوتی۔ قدیم سندھی اور ہندوستان کی تمام مروج زبانوں کا بقید زمان و مکان جائزہ لیا جائے تو محسوس ہوگا کہ پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی میں ہر علاقے کی زبان میں ایسے الفاظ کا بڑا ذخیرہ موجود تھا جو آج کی اردو کا سرمایہ ہیں۔

قدیم سندھی یقیناً سندھی کے علاوہ کچھ نہ تھی۔ ہندی زبان کے جو فقرے یادو ہے سندھ میں رائج تھے ان کی حیثیت جداگانہ تھی مگر بنظر غائر دیکھا جائے تو سندھی اپنے دامن میں خود اردو کو پرورش کر رہی تھی اور اس کے لئے غیر شعوری طور پر ایک بڑا ذخیرہ بہم کرتی جا رہی تھی جو آج بھی دونوں زبانوں میں خون کے رشتے کے مترادف ہے۔

چنانچہ اردو کی موجودہ وسعت کو سامنے رکھ کر صرف قدیم سندھی سے ان الفاظ کو نکالا جائے جو فی زمانہ اردو میں مستعمل ہیں تو ان کی تعداد

ہزاروں تک پہنچ جائے گی اور عربی فارسی لفظوں کو چھوڑ کر ٹھیٹ سندھی لفظوں کا انتخاب کیا جائے تب بھی اُن کی خاصی تعداد نکلے گی [۴۳]

اردو اور سندھی کے مشترک الفاظ کی جو فہرستیں مرتب کی گئی ہیں ان پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سندھی میں الفاظ کا ذخیرہ ابتداءً قدیم پراکرتوں سے آیا ہوگا۔ تب ہی ان میں سے اکثر لفظ دوسری علاقائی زبانوں میں بھی پائے جاتے ہیں اور اسی لئے اردو کو بین اللسانی حیثیت حاصل ہوگئی۔

اس کا دوسرا سبب عربی و فارسی کے الفاظ ہیں جو عربوں کی آمد پر پہلے سندھی میں داخل ہوئے پھر ہریانی، کھڑی بولی اور دوسری زبانوں میں ایسے لفظ اردو کے لئے سندھی سمیت تمام علاقائی پراکرتوں کا عطیہ بھی ہیں اور براہِ راست عربی و فارسی کی دین بھی۔ موجودہ سندھی میں ان الفاظ کی تعداد کل ذخیرہ الفاظ کی نصف سے کم نہ ہوگی مگر اصل زبان میں ان کا داخلہ بتدریج ہوا۔ پہلے فوجی اور سیاسی اصطلاحیں مستعمل ہوئیں پھر انتظامِ حکومت سے متعلق امور اور شعبوں کے نام۔ اس کے بعد ضروریاتِ زندگی کی چیزیں اور اسی سلسلے میں ایسی اشیاء جو ہندوستان میں پائی نہیں جاتی تھیں۔ سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں:

---

۴۳ الف: بنیادی اردو سندھی ترجمہ از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور

ب: ہفت زبانی لغت، مرکزی اردو بورڈ لاہور۔

ج: سندھی اردو کے لسانی روابط صہ ۲۵۵، مرکزی اردو بورڈ لاہور سن ۱۹۷۰ء

س: سندھی اردو لغات از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، مطبوعہ، سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سن ۱۹۵۹ء

"مسلمانوں نے جب یہاں قدم رکھا تو اپنے پورے تمدن و معاشرت ساز و سامان اور اپنی اصطلاحات اور ایجادات کو ساتھ لے کر یہاں وارد ہوئے اور ان سب کے لئے نام، اصطلاحات اور الفاظ بھی اپنے ساتھ لائے اور چونکہ یہ ہندوستان میں بالکل نئی چیزیں تھیں اس لئے ہندوستان کی بولیوں میں ان کے مرادفات کی تلاش بیکار تھی اور وہی الفاظ ہندوستان میں رائج ہو گئے۔"[۴۴]

مولانا ندوی اس سے قبل سلسلۂ بیان میں لکھتے ہیں:

"وہ کابل، ترکستان اور ایران کے بیسیوں میوے اور پھل وہ ہندوستان لائے اور ان کے ساتھ ساتھ ان کے نام بھی آئے اور یہ سارے ہندوستان میں ہر بولی بولنے والوں کی زبانوں پر بعینہٖ چڑھ گئے۔ انگور، انار، سیب، بہی، انجیر، نارنگی، خربزہ، تربزہ، بادام، منقیٰ، کشمش، پستہ، شفتالو، ناشپاتی، آبجوش، خوبانی، چلغوزہ، فندق کے مزے سے اہل ہند ایسے مانوس ہوئے کہ ان پھلوں کے ساتھ ساتھ ان کے ناموں سے بھی اپنی زبان کو نئی لذت بخشی۔ پھولوں کے بہت سے اقسام مسلمان ہندوستان لائے۔ مثلاً گلاب، سوسن، سنبل، ریحاں، بنفشہ، خطمی، نرگس، نسرین، نسترن، گل طرہ، گل شبو، گل مخمل وغیرہ۔

میووں کی تمہید سے مسلمانوں کے دسترخوان کے الوان نعمت یاد آئے۔ خشکہ، پلاؤ، قبولی، بریانی، زردہ، شیر برنج، قورمہ

۴۴؎ نقوش سلیمانی صفحہ۔۳۰ مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۶۷ء

قلیہ، شوربہ، کباب، یخنی، دم پخت، قیمہ، کوفتہ، مزعفر، متنجن، حلوہ وغیرہ مسلمانوں نے پیش کیا۔

کپڑوں کی نئی نئی صنعت کاریوں کی ایجادات کے ساتھ ان کے ناموں کو بھی ہندوستان کی زبانوں میں فروغ دیا۔ مخمل، قاقم، کاشانی، زربفت، طاس، منقیش، شروانی، مشجر، کمخواب، دیبا، اطلس، تافتہ، بافتہ، مشروع، زری، گلبدن، تن زیب، شال باف، جامہ دار، محمودی، علی قلی خانی، زرتار، چارخانہ، جامدانی، کامدانی وغیرہ۔

کھانا کس ملک میں پکایا اور کھایا نہیں جاتا مگر ہندوستان کی قناعت پسند طبیعت مٹی کی ہانڈیوں اور کیلے کے پتوں سے آگے نہیں بڑھی۔ مسلمان آئے تو دیگ، دیگچی، کفگیر، چمچہ، رکابی، پیالہ، بادیہ، قاب، دسترخوان، آفتابہ، آبخورہ، سیلابچی، صابون، خلال، بکاول، باورچی، رکابدار، خانساماں اپنے ساتھ لائے۔ مسلمان جب یہاں آئے تو سرِ شام یہاں دیا اور دیپک جلتا پایا۔ انھوں نے برسرِ محفل شمع جلائی، قندیل روشن کی اور جابجا فانوس، دیوارگیر، ملالہ، مردنگ اور فتیلہ سوز رکھے اور ان سے مشعلچی نے مشعل جلا کر راستہ کو پُرنور کیا۔

گھوڑے کی سواری کہاں نہ تھی مگر مسلمان جب یہاں آئے تو لگام، زین، تنگ، خوگیر، رکاب، نعل، نکتہ، جل جس کی خرابی جھول ہے، سئیس، سوار، شہسوار، تازیانہ سب اپنے ساتھ لائے۔

جواہرات میں درِ عمانی، عقیق یمنی، لعل بدخشانی، زمرد، زبرجد، یشب، فیروزہ، سنگ ستارہ، سب ان کے لائے ہوئے ہیں

تعمیری پتھروں میں سنگِ مرمر، سنگ سرخ، سنگ سماق،
سنگِ لرزاں، سنگ خارا سب ان کے نکالے ہوتے ہیں۔
خوشبوؤں میں عطر ان کی ایجاد ہے ________" ۴۵

اس طویل فہرست کے اکثر ناموں کا تعارف ابتداً سندھ کی سرزمین ہی سے ہوا پھر وہ ہندوستان کے دوسرے حصّوں میں پہنچے۔ سندھی میں ایسے نام بعض توبعینہٖ اور بعض قدرے تبدیلی کے ساتھ مروج ہیں جو سندھی کے ساتھ اردو کی قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں اور انھیں بھی سندھ میں اردو کے بنیادی پتھر سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

ماضی کی تہہ میں دبے ہوتے ان لسانی بیجوں کو کریدا جائے تو محسوس ہوگا کہ ان کی کونپلیں زمان و مکان کے پردوں میں چھپتی ہوئی صدیوں بعد دلی اور اس کے مضافات میں جاکر پھوٹیں اور ایک تناور درخت بن کر ہندوستان کے گوشے گوشے پر چھا گئیں ______ آج یہ چھتنار درخت پنجاب، گجرات، دکن اور اودھ کی طرح سندھ پر بھی سایہ فگن ہے تو اس میں اسی سرزمین کے ذروں کی بوباس محسوس ہوتی ہے اور تحقیق پر پتہ چلتا ہے کہ یہ تو وہی لسانی مسافر ہے جو بغیر کسی رختِ سفر کے دیبل و منصورہ سے چلا تھا اور صدیوں بعد گھاٹ گھاٹ کا پانی پی کر اپنے ابتدائی مرکز کی طرف پلٹا ہے تو اس کے جسم پر ہندوستان کے مختلف علاقوں کی چھاپ لگی ہوئی ہے مگر مسافر کے ذہن میں بچپن کی یادگاریں محفوظ ہیں۔

---

۴۵ نقوش سلیمانی صفحہ ۲ تا ۳۰ مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی سنہ ۱۹۶۷ء

عرب و ہند کے تعلقات صفحہ ۲۳ تا ۱۸ از سید سلیمان ندوی مطبوعہ کریم سنز پبلشرز جمشید روڈ کراچی سنہ ۱۹۷۶ء

مباحث از ڈاکٹر سید عبداللہ صفحہ ۱۹ مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور سنہ ۱۹۶۵ء

وہ سندھ میں اپنے نقوشِ قدم کو دیکھتا ہے تو اس کو ماضی کی ہر بات یاد آ جاتی ہے اور تاریخی و لسانی آئینے میں وہ خال و خد پوری طرح ابھر آتے ہیں جن سے اس کا ہیولیٰ تیار ہوا تھا۔

دکن، پنجاب اور سواحلِ ہند میں مروج مماثل الفاظ

ان تفصیلات کے بعد یہ حقیقت قطعی اور مسلم ہو جاتی ہے کہ سندھ میں دو قوموں کا اختلاط ہندوستان کی بین الاقوامی زبان کے وجود میں آنے کا موجب ہوا پھر پنجاب میں مسلمانوں کے ورود سے ویسے ہی عوامل ظہور پذیر ہوئے اور پنجاب کے بعد دلی، گجرات، دکن، اودھ اور دوسرے خطوں میں مشترک الفاظ پیدا ہوتے رہے۔

پراکرتوں میں آپس کا ایک قدیمی آہنگ تھا لہٰذا عربی و فارسی کے علیحدہ علیحدہ پراکرتوں سے ملاپ کے باعث جو الفاظ وضع ہوئے، وہ اختلاف زمان و مکاں کے باوجود باہم زیادہ مختلف نہ تھے۔ اسی لئے غزنوی دور سے تغلق عہدِ حکومت تک مختلف علاقوں میں بولی جانے والی "ہندی" پر ایک نظر ڈالی جائے تو الفاظ مستعملہ میں لہجے اور تلفظ کے فرق کے علاوہ کوئی مغائرت نظر نہیں آتی بلکہ بعض لفظ تو سندھ پنجاب، دلی اور دکن ہر جگہ ایک ہی املا اور ایک ہی معنیٰ میں استعمال ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ بعض الفاظ علاقوں کے لسانی مزاج کے تحت کچھ تبدیلی قبول کر لیتے ہیں تو بس اتنی ہی کہ مقامی پراکرت کی انفرادیت ثابت ہو جائے۔

یہ صورت قدیم و جدید دونوں قسم کے لفظوں میں رونما ہے۔ عربی و فارسی لفظوں میں کم اور خالص پراکرتی الفاظ میں زیادہ۔ جہاں تک فارسی اور عربی الفاظ کا تعلق ہے، ان کی حیثیت پراکرتوں کی طرح مخلوط زبان

میں بھی اضافی رہی ہے۔ بنیادی لفظ تو حقیقتاً وہی ہیں جو پراکرتوں سے آئے تھے لہٰذا ان کا جائزہ لیا جائے تو ہم نسل و ہم ردیف الفاظ کی ایک بڑی تعداد مل جاتی ہے جو سندھ، پنجاب، دلی اور دوسرے تمام خطوں میں اساسی سطح کا کام دیتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہندی لفظ پریم کو لیا جائے تو دکن ، پنجاب اور سندھ میں اس کا استعمال یکساں نظر آئے گا۔ پنجاب میں پریم، دکن میں پیم اور پرم ———— اور اس کے سارے مشتقات جیسے پیتم (ہندی کا پریتم)، پیا اور پیو۔ اس کے دوش بدوش سندھی میں پیی، پنجابی میں پیو (قدرے بدلے ہوئے معنی میں) اور ہندی میں پیا۔ اسی طرح بنیادی الفاظ پریہ، میگھ (مینہ) رِکش (ریچھ) کو سنسکرت سے لیا جائے تو اپ بھرنش میں مِھیہ، پیارو اور رِکھ، پنجابی میں مِینہ، پیارا، رِچھ، سندھی میں مینھُن، پرُ، پرَ (پرینِ)، (رِچ) ہندی میں مینہہ، پیارا، ریچھ کا استعمال ملتا ہے۔ ایسے ہی بہت سے لفظ ہیں، پرت (پریت)، پَری (پرے)، پات (پاٹ) جو سندھی کی طرح پنجابی، دکن، گجراتی، اودھی اور ہندی سب میں مستعمل ہیں۔ سینکڑوں الفاظ کی ایک طویل فہرست ہے جو سندھ میں مسلمانوں کی آمد سے سترھویں صدی عیسوی تک مختلف علاقائی زبانوں میں شامل تھے اور جن کی اکثریت آج بھی موجود ہے ان الفاظ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سندھ، پنجاب، دلی، دکن میں کس قدر لسانی ہم آہنگی تھی اور مخلوط زبان کے ابھرنے کے لئے زمین کتنی ہموار تھی۔[۴۶]

---

۴۶ ماخوذ از :-

سندھی اردو لغت مرتبہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۵۹ء

سندھی ربولی جی تاریخ مصنفہ بھیرومل اڈوانی مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ ۱۹۵۶ء

اور بات صرف سندھی، پنجابی اور دکنی ہی کی نہیں بلکہ ملتانی، سرائیکی، اودھی، گجراتی، تلگو، مرہٹی اور دوسری تمام علاقائی زبانوں میں کم و بیش ایسے لفظ موجود تھے جو سارے ملک کی ایک مشترک زبان کا ناگزیر تقاضا بن گئے تھے۔ یہی وہ عوامل تھے جنھوں نے اردو کو جنم دیا اور یہی وہ اسباب تھے جو نوزائیدہ زبان کے مقبول عام ہونے کے موجب ہوئے جس کے بعد اس زبان سے کسی علاقے کا تنافر حق بجانب نہیں رہتا اور سندھ کے بارے میں تو کہا جا سکتا ہے کہ یہاں اس کا نال گڑا ہوا ہے لہٰذا سندھ سے اردو کا رشتہ قدیمی بھی ہے اور فطری بھی جو بہر حال محبت کی دلیل ہوتا ہے۔

سندھی سے اُردو کی لسانی ہم آہنگی

سندھ کی لسانی سطح پر اردو کے نقوش اولیں کو سامنے رکھ کر اگر سندھی زبان کا لسانی تجزیہ کیا جائے تو اس کی بہت سی باتیں اردو سے

بقیہ فٹ نوٹ نمبر ۴۶ :-

اردو سندھی کے لسانی روابط مصنفہ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور سنہ ۱۹۷۰ء۔

سب رس مصنفہ ملا وجہی مطبوعہ مجلس ترقی اردو پاکستان کراچی سنہ ۱۹۶۴ء

کلیات سراج اورنگ آبادی مطبوعہ مجلس اشاعت دکنی مخطوطات جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن سنہ ۱۳۵۷ھ۔

دکن میں اردو از نصیر الدین ہاشمی مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی سنہ ۱۹۶۰ء۔

مقالات محمود شیرانی جلد دوم و سوم مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور سنہ ۱۹۶۶ء۔

پنجاب میں اردو مصنفہ محمود شیرانی مطبوعہ آئینہ ادب لاہور سنہ ۱۹۷۲ء۔

ملتی جلتی ہوں گی اور ہر زاویہ نگاہ سے دونوں میں کوئی نہ کوئی مطابقت ضرور پائی جائے گی جو سندھی اردو میں ایک آہنگ مزید کا ثبوت ہو گی اور سندھی سے اردو کی قرابت مسلم ہو جائے گی کیونکہ دونوں کا عربی اور فارسی سے ایک ہی رشتہ ہے ایسی حالت میں زبانوں کے درمیان کوئی دوری نہیں ہو سکتی۔ پھر بھی حروفِ تہجی کی تعداد میں فرق ہے۔ سندھی میں اکاون حروف ہیں جبکہ اردو میں صرف چھتیس۔ سندھی کے سترہ (۱۷) حرفوں کے متبادل اردو میں حروف نہیں ہیں۔ ضرورت پڑنے پر انھیں کئی حروف ملا کر بنا لیا جاتا ہے۔ ژ کے متبادل سندھی میں کوئی حرف نہیں اور ہ کے بجائے ھ ہی استعمال ہوتا ہے۔

حرفوں کی یہ تعداد عربی اور فارسی دونوں کے حروف سے زائد ہے فارسی میں کل چوبیس حرف ہیں۔ اردو میں اس کے رسم الخط کا اتباع کیا گیا تو تعداد ڈیوڑھی ہو گئی کیونکہ اردو کا اساسی تعلق پراکرتوں سے تھا اور پراکرتوں کے اکثر لفظوں کی صوتی ضروریات صرف فارسی حروف سے پوری نہ ہو سکتیں لہٰذا اردو حروف کا آمیزہ پراکرتی، عربی، فارسی اور ترکی حروف سے تیار ہوا۔

یہی صورت سندھی کے لئے بھی پیش آئی۔ یہ زبان پہلے دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی تھی اور اس پر شورسینی اپ بھرنش کے ساتھ ساتھ سنسکرت کے اثرات غالب تھے لہٰذا انگریزی دور میں جب اس کے لئے خطِ نسخ کی تجویز کی گئی تو مروج الفاظ کی آوازوں کو ملحوظ رکھا گیا اور عربی حروف کو ناکافی قرار دے کر بہت سے مزید حروف مشتقات کے طور پر وضع کئے گئے جو سنسکرتی الفاظ کی ادائی میں ساتھ دے سکتے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انگریزوں نے سندھ کو ہندوستان کے دوسرے حصوں سے اجنبی بنانے کی خاطر اردو کے بجائے سندھی کی

ترویج کی تھی تاکہ فارسی ختم ہونے کے بعد پورے ملک کی زبان اردو ہو تو سندھ اس سے مانوس نہ ہوسکے اور خود سندھی کو عربی رسم الخط تو دیا لیکن حروف میں اتنا اضافہ کر دیا کہ سندھی سے عربی کا کوئی تعلق نہ رہے۔ بھیرو مل اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ:-

"۱۸۵۳ء میں انھوں نے (انگریزوں نے) سندھ کے ہندو مسلمان دانشوروں کی ایک کمیٹی مقرر کی ــــــ اس کمیٹی کے سامنے اردو کا نمونہ موجود تھا مگر اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔" ؎۴۷

صوتیات

اس شاطرانہ سازش کے باوجود سندھی نہ عربی سے زیادہ دور ہوسکی اور نہ اردو سے۔ سندھی کا مزاج بلاشبہ اردو سے مختلف تھا لیکن بیشتر حروف اور اثاثۂ الفاظ کے اشتراک نے درمیانی فصل کو بڑھنے نہ دیا۔ مصوتے کچھ جدا جدا ضرور ہیں مگر اتنے بھی نہیں کہ اردو اور سندھی کے ہم معنیٰ الفاظ کی ادائی ایک دوسرے سے اجنبی ہو جائے۔ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی لکھتے ہیں۔

"اردو اور سندھی کے زیر بحث ہندی الاصل مشترکہ حروف کا یہ جزدی اختلاف صورت وظاہر کا ہے جو نقطوں کا پیدا کردہ ہے ورنہ جہاں تک ان کی آوازوں، ان کے ماخذوں اور محل استعمال کا تعلق ہے، باہم کوئی فرق یا اجنبیت نہیں۔ یہ سب خالص ہندی آوازیں ہیں جنھیں ہماری دونوں زبانوں

؎۴۷ سندھی بولی جی تاریخ صفحہ ۲۶۱ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد ۱۹۷۲ء

نے من وعن اپنا لیا ہے اور ہندی الاصل الفاظ میں استعمال ہوتی ہیں۔ اردو ذرا محتاط ہے اور عربی فارسی الفاظ میں ان آوازوں کو راہ نہیں دیتی۔ سندھی کبھی کبھی ان آوازوں کے استعمال میں اسراف سے کام لیتی ہے اور عربی فارسی الفاظ میں بھی ان کو بار مل جاتا ہے۔" ۴۸ـه

حرکت وسکون کے لئے سندھی اردو کے بنیادی فرق کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر اصلاحی تحریر کرتے ہیں۔

"سندھی متحرک الآخر اور اس کے برعکس اردو ساکن الآخر زبان ہے۔ سندھی میں حروف صحیح پر ختم ہونے والے تمام الفاظ متحرک الآخر ہوتے ہیں جیسا کہ عربی اور سنسکرت میں ہے۔ برصغیر ہند و پاک میں سندھ وہ واحد قابل ذکر زمین ہے جہاں عرب قوم اور عربی زبان براہ راست آئی لیکن خود سنسکرت میں اس خصوصیت کے ہوتے ہوتے یہ امر قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا کہ سندھی کا متحرک الآخر ہونا عربی اثرات کا نتیجہ ہے۔ اس لئے یہ کہنا اقرب الی الصواب ہے کہ سندھی اس باب میں سنسکرت کی پیرو ہے۔ اردو کا ہر لفظ ساکن الآخر ہوتا ہے۔"

"اس ضمن میں ایک اور بات، جس کی طرف اشارہ کرنا مفید ہوگا، یہ ہے کہ سندھی الفاظ کے آخری حروف اگرچہ متحرک ہوتے ہیں، اور ان پر زیر، زبر، پیش میں سے کوئی نہ کوئی حرکت ضرور ہوتی ہے لیکن بات چیت میں اس کو بڑی مشکل

۴۸ـه اردو سندھی کے لسانی روابط صفحہ ۱۱۳ مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور سنہ ۱۹۷۰ء

سے محسوس کیا جا سکتا ہے، خصوصاً پڑھے لکھے اور شہروں میں رہنے والوں کے ہاں یہ فرق اور بھی باریک ہو گیا ہے۔"

"اردو سندھی کے مابین صوتی تبدیلیوں کا ایک مظہر حرکات ثلاثہ کا اشباع ہے، یعنی اردو کے زیر، زبر، پیش سندھی میں طویل ہو کر روی بن جاتے ہیں یا اس کے برعکس۔ اسی طرح حرکاتِ ثلاثہ کا آپس میں تبادلہ بھی عام ہے۔ اس بات کو مختصراً ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک مصوّتہ دوسرے مصوّتے سے بدل جاتا ہے۔ یہ تبدیلی لفظ کے ابتدا میں بھی ہوتی ہے وسط میں بھی اور آخر میں بھی۔" [۴۹]

بالاختصار اردو اور سندھی دونوں زبانیں پراکرتی، عربی، فارسی اور ترکی الفاظ کا مجموعہ ہیں اور پرتگالی، ولندیزی، فرانسیسی اور انگریزی الفاظ بھی داخل ہوئے ہیں لیکن دونوں کے علیحدہ علیحدہ صوتیاتی مزاج کے باعث تلفظ الفاظ یکساں نہ رہ سکا اور بعض لفظوں کا تلفظ بدل گیا تاہم اتنی تبدیلی بھی نہیں ہوئی کہ اصل لفظ پہچانا نہ جا سکے۔

السنہ کے اس جائزے میں بیشتر پراکرتی لفظوں کو جگہ دی گئی ہے لیکن اردو سندھی میں عربی، فارسی، ترکی کے الفاظ مستعملہ ہزاروں کی گنتی میں ہیں جن میں سے کچھ لفظ تو ایسے ہیں جو صرف سندھی میں استعمال ہوتے ہیں، اردو میں نہیں اور کچھ لفظ صرف اردو ہی میں ہیں سندھی میں نہیں ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ الفاظ براہِ راست زبانوں میں داخل ہوئے تو کسی لفظ نے ایک زبان میں مستقل جگہ بنا لی لیکن دوسری میں بار نہ پا سکا۔

۴۹؎ اردو سندھی کے لسانی روابط صفحہ ۲۶۳ تا ۲۶۵، مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ ۱۹

یہ صورت صرف عربی اور فارسی الفاظ ہی کی نہیں ہے سنسکرتی اور پراکرتی لفظوں میں سے بھی بہت سے لفظ سندھی کا جزو بن گئے ہیں مگر اردو اُن سے مانوس نہ ہوسکی یعینہٖ یہی حال سندھی کا بھی ہے کہ اردو میں پائے جانے والے کچھ لفظ سندھی میں نہیں ملتے پھر بھی کثیر تعداد ایسے لفظوں کی ہے جو ہر دو زبان میں مشترک ہیں ۔

"ان الفاظ کا تجزیہ کیا جائے اور ہندی، فارسی، عربی، ترکی اور یونانی لفظوں کی علیحدہ علیحدہ فہرست مرتب ہو تو ایک علیحدہ کتاب درکار ہوگی لہٰذا قدرے اختصار سے اردو سندھی میں مشترک الفاظ کا ایک مجموعہ پیش کیا جا رہا ہے جس کا ہر لفظ مبدّل اور غیر مبدّل صورت میں اردو اور سندھی دونوں میں مستعمل ہے" ۵۰ھ

مطابقت صرف الفاظ ہی تک محدود نہیں، محاورات اور ضرب الامثال میں بھی ویسا ہی اشتراک ہے ۔ اکثر محاورات دونوں زبانوں میں مروّج ہیں اور ایک ہی مفہوم ادا کرتے ہیں ۔ نمونے کے طور پر سندھی کی چند مثالیں دی جاتی ہیں ۔

کھٹ پٹ ، ناچ پڙتال ، کپڙو لتو ، چڱو ڀلو ، گھٹ وڌ ، راتو رات ، بارھٺ سی ، گھر بار ، سوک ٽام ، ٽکو مانو اَب داڻو ، نالو نشان ، آمدرفت ۔

شک شبھو ، عجیب غریب ، شکل شباھت ۔

اڙے چھوکرا (ارے چھوکرے)

۵۰ھ اردو سندھی کے لسانی روابط مصنفہ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی صفحہ ۱۲۳ تا ۱۳۶ مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور سنہ ۱۹۷۰ء

ڳيت ڏٺي ءَجاڪر جي ڳايون (گیت خدا کے مل کر گائیں)

سارے جهان کهاں چڱو هندوستان اسانجو

(سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا)

تنهنجي اهائي سزا اٿئي ڪمبخت (تیری سزا یہی ہے کمبخت)

اَپ سکی تہ جگ سکی (آپ سُکھی تو جگ سُکھی)

ابھ میں تھک اچھلائے سو منھن میں پائے۔

(آسمان کا تھوکا منہ کو آتا ہے)۔

اُٺ جي وات ۾ زيرو (اونٹ کے منہ میں زیرہ)

اَٽي ۾ لوڻ (آٹے میں نمک)

اَپ گهاتي مها پاپي (آپ گھاتی مہا پاپی) [۵]

یہ ہم آہنگی سندھی کے بیس بائیس ہزار الفاظ میں سے پندرہ سولہ ہزار میں ضرور پائی جاتی ہے کیونکہ بھیرو مل مہر چند اڈوانی کے اندازے کیمطابق سندھی میں تین ہزار فارسی، ڈھائی ہزار عربی، ڈھائی ہزار دلیسی اور بارہ ہزار پراکرتی لفظ شامل ہیں جن میں سے عربی و فارسی میں تو صوتی فرق برائے نام ہی ہے، دلیسی اور پراکرتی لفظوں میں البتہ فرق ہے تو وہ بھی ایک تہائی الفاظ سے زائد میں نہیں۔ اس طرح تفرلق کا تناسب ایک

۵۔ ماخوذ از :۔

اردو سندھ کے لسانی روابط از ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی صفحہ ۳۳۵، ۱۳۳۱، ۵۰۴ مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۷۰ء

مضمون "اردو پر قدیم سندھی کا اثر" از ڈاکٹر اسد اللہ شاہ حسینی مشمولہ سندھی ادب تاریخی تدریں حیدرآباد ۱۹۷۳ء

سندھی بولی جی تاریخ صفحہ ۱۸۲ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد ۱۹۷۰ء

تین سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔

حروف، صوتیات، الفاظ و محاورات کے اس توازن و تقابل کے بعد اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ اردو اور سندھی میں اکثر اقدار مشترک پائی جاتی ہیں البتہ زبانوں کے مزاج کچھ الگ الگ ہیں لہٰذا صوتیات میں کہیں کہیں فرق پیدا ہو گیا ہے، اختلاف ماحول کے باعث معنوی تغیر واقع ہو گیا ہے یا بعض الفاظ کا املا کچھ بدل گیا ہے تو اس سے درمیان میں کوئی اختلافی خلیج حائل نہیں ہو جاتی اور یہ صورت حال صرف سندھی ہی میں نہیں ہے، اردو میں بھی الفاظ کے معنی جا بجا بدلے ہوئے ہیں اور بہت سے لفظ تو ایسے ہیں جو عربی، فارسی یا کسی اور زبان سے لئے گئے ہیں مگر اس زبان میں جو مفہوم رکھتے ہیں، اردو میں آکر ان کا مفہوم کچھ اور ہو گیا ہے۔ ایسی صورت میں اگر کسی ایک ہی لفظ کے معنی سندھی میں کچھ اور ہوں اور اردو میں کچھ اور تو کوئی محل استعجاب پیدا نہیں ہوتا ـــــــ مثال میں اگر فارسی کے ایک لفظ "انجام" کو لیا جائے تو اردو میں اس کے معنی ہوں گی "آخر"، "انتہا"، "مآل"، "حشر" لیکن سندھی میں انجام بولا جائے گا تو وعدے کا مفہوم ادا کرے گا۔ اسی طرح کے اور الفاظ ہیں جن کے مآخذ تو ایک ہیں مگر وہ اردو اور سندھی میں داخل ہو کر مختلف المعنیٰ ہو گئے ہیں جیسے آبادی بمعنی فصل، مالی بمعنی مویشی، قلم بمعنی قلم اور قانونی دفعہ، کچہری بمعنی محفل اور نشست۔

ایک اور فرق اردو اور سندھی میں تذکیر و تانیث کا ہے۔ اردو میں بہت سے لفظ مذکر ہیں جب کہ سندھی میں مونث، سندھی میں مذکر ہیں تو اردو میں مونث جیسے نظم، تصویر اردو میں مونث ہیں لیکن سندھی میں مذکر بولے جاتے ہیں۔

یہ جزوی اختلافات فصل زمان و مکاں اور مزاج لسانی کے باعث

پیدا ہو گئے ہیں ورنہ حقیقتاً اردو اور سندھی دو سگی بہنیں ہیں جن کا بچپن ایک ہی خطۂ ارض اور ایک ہی ماحول میں گزرا لیکن اردو کی قسمت میں آوارہ گردی لکھی تھی وہ دربدر خاک چھانتی رہی۔ جوان ہو کر اپنی قدیمی سرزمین پر آئی تو اس کی صورت ہی بدل چکی تھی اور وہ آسانی سے پہچانی نہ جا سکتی لیکن خون کا رشتہ اپنی جگہ پر ہوتا ہے ——— سندھی اور اردو دونوں نے ایک دوسرے کے لئے کشش محسوس کی اور اب جو دیکھا تو ان کے خال و خد اور نسل و رنگ سب ایک تھے اور وہ ایک ہی ماں کی بیٹیاں تھیں۔

"سندھ میں اردو کے سرپرست خانوادے"

سومرو خاندان سے لیکر تالپوروں تک

سندھ میں اردو کا اٹھان ہندوستان کے دوسرے حصوں کی طرح فطری تھا الفاظ خود بخود پیدا ہو رہے تھے اور اظہار خیال کے مشترک محاورے وجود میں آنے جا رہے تھے۔ مخلوط زبان کا کوئی مستقل نام اب تک وضع نہ ہوا تھا مصرعے یا شعر جو زبانوں سے نکل جاتے وہ ہندی یا ہندوستانی کہلاتے مگر آہستہ آہستہ وہ منزل آگئی کہ اس زبان میں شعر کہے جانے لگے۔ ابتداً اس کو ریختہ کہہ کر پکارا گیا پھر اردو نام پڑا اور دلی، دکن، پنجاب، گجرات اور سندھ ہر حصہ میں طبع آزمائی کی جانے لگی۔

امیر خسرو کو اس زبان کا پہلا شاعر مانا جائے یا نہ مانا جائے مگر انھوں نے مستقبل کے جدت پسندوں کے لئے ایک شاہراہ کھول دی تھی جس پر معروف اور غیر معروف لوگ چل پڑے تھے۔ برسوں کے فصل سے عبدالرحیم خانخاناں نے ایک نئے طرز پر ان کا اتباع کیا اور وقت کی عوامی زبان میں اپنے خیالات کو پیش کیا پھر زمانے کی تدریجی ترقی کے ساتھ مخلوط زبان آسان سے آسان تر ہوتی رہی اور عوامی مزاج کی شاعری اس کے دامن میں پرورش پاتی رہی۔

خانقاہیں اور مراکز تبلیغ شروع ہی سے اس زبان کے مستقر تھے۔ محافلِ سماع میں بھی اس کی پذیرائی ہو چکی تھی اور غیر مسلموں میں ذریعہ تبلیغ تو اس کے علاوہ کچھ تھا ہی نہیں۔ اسی لئے حضرت گیسو دراز نے تحریر کے میدان میں بھی اولاً یا ثانیاً اسی کو استعمال کیا۔ شعر گوئی ملک کے مختلف حصّوں میں شانہ بشانہ چل رہی تھی لہٰذا کہا نہیں جا سکتا کہ پہلا شعر کب، کس نے اور کہاں نظم کیا؟ البتہ پنڈت برجموہن کیفی کی تحقیق میں:

"اردو کی پہلی اور مکمل غزل چندر بھان برہمن نے کہی۔" [۱]

برہمن کے ہم عصر اور بھی شاعر ہوں گے مگر ان کے نام ہنوز کسی محقق کے منتظر ہیں۔ چندر بھان برہمن کی اولیت بھی محققین کے درمیان متنازعہ فیہ ہے جس کا فیصلہ مستقبل کے ہاتھ ہے۔

سومروں سے مغلوں تک

تقدیم و تاخیر کی اس بحث کو چھوڑ کر اگر اردو کی بساط شاعری پر پورے ہندوستان کو لایا جائے تو سندھ کی صورت حال پنجاب، دلی اور دکن کسی سے مختلف نہ تھی ——— یہاں بھی عوامی زبان کا مسلسل استعمال کیا جا رہا تھا۔ فارسی دوسرے مقامات کی طرح سرکاری زبان تھی۔ سومرہ دربار سے فارسی شعراء پر انعام و اکرام کی بارش ہو رہی تھی۔ سندھ کی نشاۃ ثانیہ شروع ہو چکی تھی۔ سرائیکی شاعری پروان چڑھ رہی تھی۔ سندھی کسی گنتی میں نہ تھی مگر اس کی جڑیں عوام میں پھیلی ہوئی تھیں لہٰذا بالارادہ یا بلا ارادہ شعراء دوہے الفاظ میں ڈھل رہے تھے۔

---

[۱] کیفیہ، صفحہ ۹۵ مصنفہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی سنہ ۱۹۵۰ء

سومروں کے بعد سموں کا ادب پرور عہد حکومت بھی فارسی اور سندھی نواز رہا پھر سندھ کے مطلع پر ارغونوں کا آفتاب اقبال طلوع ہوا ۔ یہ دور بھی ماضی سے کچھ مختلف نہ تھا اس دور میں بھی افراتفری کے باوجود بعض فارسی شاعروں کی پرورش کی گئی جو عوامی رجحان کو دیکھ کر یا ذوق تازہ کی تسکین کے لئے کبھی کبھی اردو شعر کہتے تھے ۔ پھر بھی اردو یا ہندی کے کسی باقاعدہ شاعر کا سراغ نہیں ملتا ۔ حتیٰ کہ ترخونوں کے عہد تک یہی کیفیت رہی ۔

ارغونوں اور ترخونوں کی حکومت اور کسی اعتبار سے سندھ کو راس آئی ہو یا نہ آئی ہو لیکن اس زمانے میں سندھ کا مرکزی ہندوستان سے ایک مستقل رابطہ ضرور قائم ہو گیا تھا جس کا اثر زبان و ثقافت دونوں پر پڑا اور انجام کار سندھ میں نوزائیدہ زبان کی پذیرائی بڑی شدت سے ہونے لگی ۔ اور یہ اسی پذیرائی کا نتیجہ تھا کہ جب سندھ ترخونوں کے ہاتھ سے نکل کر براہِ راست مغل اقتدار میں چلا گیا تو ایسے افراد ابھر کر سامنے آگئے جو فارسی سندھی اور ہندی میں یکساں دستگاہ رکھتے تھے ۔

"تاریخ معصومی کے شہرہ آفاق مولف میر معصوم بھکری کے بھائی میر فاضل کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہے جو فارسی اور سندھی کے علاوہ ہندی میں بھی شعر کہتے تھے ۔" ۲؎

اسی طرح کے اور لوگ بھی ہوں گے جن کے حالات ہم تک نہ پہنچ سکے ۔ اس قیاس کی بدیہی دلیل یہ ہے کہ مغل گورنر براہ راست مرکز سے متعین ہو کر آتے تھے لہٰذا ان کے روابط سے افراد اور خاندان کا سندھ پہنچنا بعید

۲؎ ۔ خیزۃ الخوانین صفحہ ۱۰۲ مولفہ شیخ فرید بھکری مترجمہ ۔ ڈاکٹر معین الحق مطبوعہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی ۱۹۶۱ء

از قیاس نہیں اور آنے والے لسانی تحائف میں وہ زبان لے کر ضرور آتے تھے جو دلی سے گجرات اور دکن تک عام ہو چکی تھی۔

افسر امرد ہوی اپنے ایک مضمون میں اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ:

"اردو کے بہت سے شاعر باہر سے آکر سندھ میں بس گئے تھے جیسے سید محمود صابر رضوی اُستر آبادی ٹھٹھہ میں اقامت پذیر ہو گئے تھے، میر جعفر علی بے نوا، محسن الدین شیرازی، عماد الملک غازی الدین، سید فضائل خاں بے قید اور محمد سعید راہبر کا شمار بھی انھیں لوگوں میں ہے۔" [۳]

مولانا اعجاز الحق قدوسی نے تذکرہ امیر خانی سندھی سے پیر حسام الدین راشدی کا ایک بیان اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

"مغل گورنروں کی سندھ میں آمد رفت نے ہندوستانی شاعروں کو سندھ سے روشناس کر دیا۔ کئی اردو گو شاعر مغل صوبیداری کی وجہ سے سندھ پہنچے۔ ان شعراء اور ادیبوں سے سندھ کے شعراء کی راہ و رسم بڑھی۔ ان کو دیکھ کر فارسی گو شعراء نے ریختہ جیسی نئی زبان میں شاعری شروع کی۔ محمد سعید گوالیاری (۱۱۳۷ھ تا ۱۱۴۲ھ نواب سیف اللہ خاں۔ میر جعفر علی خاں بے نوا نواب مہابت خاں کاظم کے دور میں ۱۱۴۱ھ تا ۱۱۳۵ھ) ٹھٹھے وارد ہوئے۔ سید فضائل علی خاں بے قید بھی یہاں آنے والے کسی حاکم کے ساتھ ٹھٹھے آیا۔ محسن الدین شیرازی ۱۱۷۳ھ سے کچھ پہلے ٹھٹھے آئے اور میر قانع سے ملے تھے۔

---

[۳] مضمون "سندھ کے اردو شاعر"، رسالہ اردو صفحہ ۵۹۹ مطبوعہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن ۱۹۳۶ء

عماد الملک نواب غازی الدین فیروز جنگ، جن کی یادگار دلی میں عریک کالج نام کی ایک تاریخی عمارت ہے، وہ بھی ٹھٹھے آئے، ان کے علاوہ جلیل القدر ادیب و عالم و شاعر سید عبدالجلیل بلگرامی اور میر غلام علی آزاد بلگرامی وقائع نویسی کے سلسلے میں ۱۱۱۶ھ سے ۱۱۴۰ھ تک سندھ میں رہے۔ یہ بزرگ فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان میں ریختہ میں شعر کہنے کا نیا نیا ذوق پیدا ہوا تھا۔ ابرو، مضمون، ناجی، مظہر جان جاناں اسی ابتدائی دور کے اردو شاعر ہیں۔ ولی گجراتی نے بھی اسی دور میں فروغ حاصل کیا۔

سندھ میں ریختہ شاعروں کا یہ پہلا دور ہے۔ سندھ میں ہندوستان کے ان شاعروں نے اس نئی زبان کی شاعری سے دلچسپی پیدا کی۔ مقالات الشعراء کے ذریعہ ہمیں چند ایسے سندھی فارسی گو شعراء کا پتہ چلتا ہے جنھوں نے تفنن طبع کی خاطر اردو میں طبع آزمائی کی۔ ان میں نواب سیف اللہ خاں کے دور میں شیخ درد، عبدالسبحان فائز ٹھٹھوی (۱۱۳۷ھ ـــ ۱۱۴۷ھ) مخدوم معین بیراگی اُس زمانے کے شاعر ہیں۔ میر حیدر الدین ابوتراب کامل بھی اسی دور کے شاعر ہیں جب اردو میں شعر گوئی کا ذوق بیدار ہوا۔ اسی طرح سندھ کے دار السلطنت میں بھی ان ہندوستانی شعراء کی وجہ سے سندھی شعراء میں اردو شاعری کی تحریک پیدا ہوئی۔"[۴]

رابطہ تحریر میں مولانا اعجاز الحق قدوسی سندھ کے مغل دور پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

---

[۴] تاریخ سندھ حصہ دوم صفحہ ۸۰-۸۱ ۳ مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۷۴ء

دو لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو مغل صوبے
دار، خواہ وہ سندھی ہوں یا ہندی، ٹھٹھہ آئے، ان میں سے
بعض علم و فضل، شعر و ادب اور ذاتی صلاحیتوں کے اعتبار
سے ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ مثلاً ظفر خاں احسن عقل و تدبیر میں
اپنا جواب نہ رکھتا تھا، شاعر تھا، شعراء کا بے حد قدر داں تھا
نواب حفیظ اللہ خاں، نواب احمد یار خاں، نواب مہابت
خاں کاظم، نواب سیف اللہ خاں، میر ابوالبقا خاں، عبدالرزاق
سوری، میرزا عیسیٰ ترخاں ثانی وغیرہ ان سب نے علم و فن، شعر
و ادب کی سرپرستی کی اور ان کی قدردانیوں نے شعر و ادب کو
نئی زندگی بخشی۔" ۵

یہ بیانات بین دلیل ہیں اس بات کی کہ سندھ کے مغل دور میں
شعر و ادب کی خاصی سرپرستی کی گئی۔ فارسی سرکاری زبان تھی مگر ہندی
شعر گوئی بھی اس کے ساتھ ساتھ لگی ہوئی تھی لہٰذا نوازش و اکرام کا اثر فارسی
کے ذیل میں ہندی یا اردو پر پڑتا تھا اور یہ سرپرستی بالواسطہ اردو کی ترویج
میں معین ہوتی تھی۔

پیر حسام الدین راشدی کا خیال ہے کہ سندھی شعراء نے اس دور
میں تفنن طبع کی خاطر اردو میں طبع آزمائی کی۔ یہ خیال کسی مختص شاعر کے
بارے میں، ممکن ہے صحیح ہو لیکن عام حالات میں نہایت ادب کے ساتھ اس
سے اتفاق کرنے کی گنجائش نہیں کیونکہ اردو کی قبولیت اساسی طور پر ہمیشہ
اور ہر ماحول میں وقت کا ناگزیر تقاضا رہی تھی۔ کسی نے اگر اردو لفظ کو
استعمال کیا ہے تو مجبور ہو کر کیونکہ بغیر اس کے مخاطب الیہ کو سمجھایا نہ جا سکتا۔

---

۵ تاریخ سندھ حصہ دوم صفحہ ۳۹ ۳ ۳۸۰/ مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۷۳ء

بعینہٖ شعر و شاعری بھی ہے ۔ وہ زبان جو عوام میں قبول عام حاصل کر رہی تھی ، شاعر مجبور تھا اس زبان میں جودت طبع دکھانے پر کیونکہ بغیر اس کے ایک خاص طبقے میں مقبولیت حاصل نہ ہو سکتی اور یہ خاص طبقہ کسی حد تک حکومت سے متعلق بھی تھا لہٰذا اس میں خراجِ تحسین اور مفاد ذاتی دونوں طرح کی کشش تھی۔ ان سب پر مستزاد وہ عوامی مزاج تھا جس کی رگ و پے میں اردو سرایت کر رہی تھی اور جس میں جگہ بنانے کی تمنا ہر شاعر کو ہوتی ہے ۔

استدلال کی حمایت میں وہ شاعر پیش کیے جا سکتے ہیں جن کا نہ ارباب اقتدار سے کوئی تعلق تھا اور نہ شخصی جاہ و جلال سے بلکہ وہ بے سرو سامانی میں مدہوش رہنے والے لوگ تھے اور انھیں ہر لحاظ سے عوام کا ترجمان کہا جا سکتا ہے ۔ جیسے شاہ عبدالکریم بلڑی ۔

> " سید عبدالکریم بلڑائی سادات میں سے تھے ۔ ۹۹۴ھ میں پیدا ہوئے ۔ ۱۰۳۰ھ میں وفات پائی ۔ ان کے آٹھ فرزند تھے ۔ باپ کا نام سید للو تھا ۔ سندھی میں شعر دوہوں کی طرح ہندی دوہوں کے نمونے پر بنائے ۔ ان کا ایک رسالہ موسومہ " شاہ جو رسالو " ہے ۔ " [۶]

شاہ کریم کا ایک ہندی شعر اس کی تائید میں پیش کیا جا سکتا ہے ۔ اس کے علاوہ آپ کا ہندی کلام نایاب ہے لیکن یہی ایک شعر اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہے کہ سندھ میں مغل دور سے قبل اردو شاعری کا وجود تھا ۔ ترخونی عہد کے اور بھی کچھ لوگوں کے نام لیے جاتے ہیں جنھوں نے ہندی میں ابیات نظم کیں ۔ یہ شعر گوئی باقاعدہ شعر کہنے کی تعریف میں نہیں آتی اور اس کو

---

[۶] تاریخ شعرائے سندھ از ہدایت علی تارک صفحہ ۱۲ مترجمہ حفیظ الرحمٰن حفیظ مطبوعہ عزیز المطابع برقی پریس بہاولپور ۱۳۶۵ھ

یقیناً "تفنن طبع" کہا جا سکتا تھا لیکن ایک صوفی مشرب انسان سے تفنن طبع کی توقع نہیں کی جا سکتی اس لئے پاس ادب کسی تبصرہ کی اجازت نہیں دیتا ــــــ

بہرحال اس بات سے یہ حقیقت مسلّم ہو جاتی ہے کہ دسویں صدی ہجری اور سولھویں صدی عیسوی میں اردو شاعری کا ایک عوامی رجحان موجود تھا جس سے بہر نوع کسی منفعت زر کی امید وابستہ نہ ہو سکتی اور جو ہر اعتبار سے رضا و رغبت کا سودا تھا۔

شاہ عبدالکریم کا زمانہ دکن میں اردو شاعری کے آغاز کا زمانہ تھا اس لئے سندھ میں اردو کی نمائندگی کے لئے ان کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد مغلوں کے دور میں باہر سے آئے ہوتے اور خود سندھ کے بہت سے شاعر پیدا ہو گئے جن کے نام سندھ میں اردو شاعری کے پہلے باب کا سرنامہ ہیں۔

کلہوڑہ خاندان

سیاسی بساط کے یہ سجادہ نشین ایک بڑی مقامی طاقت تھے۔ ان کا ابتدائی نقطۂ عروج میاں نور محمد الملقب بہ خدا یار خاں کو قرار دیا جا سکتا ہے جن کا عہد آفریں دور اگرچہ طوفان خیز تھا لیکن انھوں نے عوامی فلاح و بہبود کے بہت سے کام کیئے۔

"علم و فضل، شعر و ادب کے بھی وہ قدر داں تھے۔ ان کے دور میں علماء شعراء اور ادیب نہایت مطمئن اور خوشحال زندگی بسر کرتے تھے۔ بعض شعراء کے میاں نور محمد نے وظیفے مقرر کیئے تھے۔ اس دور کے جن علماء و شعراء اور مصنفین کا ہمیں پتہ چلتا ہے، ان کے نام یہ ہیں۔

سلیمان بیگ اسلم ایرانی، ابوالحسن خاں ایرانی، ابوتراب منعم خاں،

تراب ابن ابو احمد خاں، جعفر شیرازی ـــــــ داؤد خاں، برادر میاں نور محمد، ذکی کرمانی، محمد زماں، محمد محفوظ سرخوش، میر عبدالجلیل بلگرامی، میر محمد بلگرامی، میر غلام علی آزاد، عاشق اصفہانی، منشی عبدالرؤف بکھری، سیوک رام عطارد، علی رضا، میر قمرالدین عطارد لاہوری، مرزا علی مدد ایرانی، علی گازرونی، اسداللہ غالب، فنا جالندھری، میر علی شیر قانع، قانع سیوستانی، قوی فاروقی، محسن ٹھٹھوی، شیخ مزمل، ہستمند کاشانی، حکیم عبدالرزاق اصفہانی، نجم الدین، میر نسیم امروہوی، محمد وفا سیوستانی، مخدوم معین بیراگی، علامہ مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی، شاہ عبداللطیف بھٹائی، یہ سب علماء و شعراء وادیب و اہل قلم میاں نور محمد کے عہد کی یادگار ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ علم و فضل، شعر و ادب کے لحاظ سے بھی ان کا دور نہایت کامیاب دور تھا۔" [۱]

میاں نور محمد کے بعد محمد مرادیاب، میاں غلام شاہ، میاں محمد سرفراز وغیرہ سریر آرائے حکومت ہوئے پھر میاں عبدالنبی کا دور آیا۔ ان سب نے کسی نہ کسی حد تک علم و ادب کی سرپرستی کی بالخصوص میاں سرفراز اور عبدالنبی کا فیض اس سلسلے میں عام تھا۔

"سندھ کے تمام مورخ اس پر متفق ہیں کہ میاں سرفراز خاں بڑا عالم، سخن فہم، سخن سنج اور شاعر تھا۔ اس کے دربار کی زینت مشہور شاعر اور اس کے دور کے بڑے بڑے عالم تھے۔ سخاوت و فیاضی میں وہ بے مثل تھا۔ علماء و فضلا اور اہل کمال کو ان کے

---

[۱] تاریخ سندھ حصہ دوم مصنفہ مولانا اعجاز الحق قدوسی صفحہ ۸۴۴ مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور سنہ ۱۹۷۴ء

علم و ہنر کے مطابق نوازتا ———— شاہ فقیر اللہ علوی جو سندھ کے مشہور عالم درویش تھے، ان کے بعض مکاتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاہ صاحب سے بعض علمی سوالات کرتا رہتا تھا۔
سندھ کا مشہور مورخ میر علی شیر قانع بھی اس کا بے حد معترف اور معترف نظر آتا ہے۔ اس نے متعدد قصیدے اس کی شان میں کہے ہیں ———— اس کے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ خوش گو شاعر تھا اور سندھی زبان کا تو بہت بڑا شاعر تھا۔
کہتے ہیں کہ سندھی زبان میں نعت و منقبت کی ابتدا اس سے ہوئی ————
میاں عبدالنبی کی حیثیت اپنی چند روزہ فرمانروائی کے زمانے میں شاہِ سطرنج کی سی تھی لیکن جہاں تک کہ اس کے ذاتی اوصاف کا تعلق ہے، وہ اپنے ذاتی اوصاف میں اپنے باپ میاں نور محمد کا نمونہ تھا اور اس نے اپنے مجبورانہ دورِ حکومت میں بھی جہاں تک ممکن ہو سکا، اخلاقی بلندیوں کو پیش نظر رکھا۔
سندھ کے مورخ و شاعر قانع ٹھٹھوی نے بھی اسے اپنے قصائد میں سراہا ہے۔" [شہ]
ان بیانات کی بنیادیں مقالات الشعرا اور تحفتہ الکرام پر رکھی ہوئی ہیں لیکن میر علی شیر قانع نے تحفتہ الکرام اور مقالات الشعرا میں صرف ان ممتاز علما و ادبا کا ذکر کیا ہے جن کے نام اسے معلوم ہو سکے ———— اکابر کے حالات انتہائی اختصار سے لکھے ہیں اور ترتیب ایسی رکھی ہے کہ

شہ تاریخ سندھ حصہ دوم مصنفہ مولانا اعجاز الحق قدوسی صفحہ ۹۳ تا ۱۰۵ مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۷۳ء

سرسری نظر سے دیکھا جائے تو پورا اندازہ نہیں ہو سکتا کہ یہ بیان اہل سندھ کے فضائل کا کتنا بدیع اور نادر مرقع ہے۔ مندرجہ ذیل فہرست میں ان مقامات کے نام درج ہیں جہاں کے اکابر کے حالات بیان ہوئے ہیں۔ اس فہرست کو پیش نظر رکھ کر غور فرمائیے کہ علم کس درجہ عام تھا۔ قصبے نہیں بلکہ قریبے بھی اس لیے بہا ثروت سے معمور تھے۔

دو بجھر، سکھر، روہڑی، الور، سیوی، کھوڑ، سیوستان، دشت باراں، پکہ کارٹیار، بوبکاں، ہالہ کنڈی، بھٹ، بانوٹ، خانوث، جھیجہ، ازپور، کھپرہ، کھٹ جوہری، نصرپور، گجرکوٹ، کاٹیار، اکھم کوٹ، چاچک، ونگہ، دلہار، ایلاسی، تہدی، بلڑی، کلہوٹ، لکرالہ، متعلوی، نیرون کوٹ، اکن پور، پھٹہ، شال، دھری ہنگورہ، کوہ کنجہ، وندی، سوندرہ، گولاب کنجھر، سامرئی، ہنگورجہ، دربلیہ، ردپاہ، پت باراں، لاہری بندر، ٹھٹھہ، مواضعاتِ کنارہ، سانگڑ، شکارپور، بھرالو، کاہاں، سن، یہ سرسری فہرست ہے۔ ممکن ہے بعض کے نام رہ گئے ہوں لیکن یہ فہرست بھی علم کی ہمہ گیری کی ایک روشن دستاویز ہے۔" [۹]

سلسلۂ کلام میں مؤلف تاریخ نے علماء و فضلاء ادبار اور شعراء کے حالات بالترتیب قلم بند کیے ہیں جس سے اس دور کے سندھی اہل علم کا ایک نقشہ سامنے آجاتا ہے اور کلہوڑہ دربار کا ایک خاکہ نگاہوں میں پھرنے لگتا ہے جہاں ان سب کا جمگھٹا لگتا ہوگا اور جو ان میں سے ہر ایک کا کفیل اور مربی تھا۔

---

[۹] تاریخ سندھ صفحہ ۸۰۹ تا ۹۸۰ عہد کلہوڑہ حصہ دوم مولفہ غلام رسول مہر مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ کراچی، حیدرآباد ۱۹۵۸ء

"بلاشبہ یہ لوگ فارسی کے شاعر و ادیب تھے اور ان میں سے ایک تعداد سندھی میں طبع آزمائی کرتی تھی لیکن بعض ہندی میں بھی شعر کہتے تھے جیسے مخدوم معین بیراگی۔"[1]

تاہم ایسے افراد صرف نظیر میں تھے جو طبقۂ امرا سے تعلق رکھتے ہوں اور ہندی کا ذوق شعری رکھتے ہوں ورنہ عموماً اس زبان کا رواج تھوڑا بہت جو کچھ تھا وہ عوامی طبقے میں اور صوفیائے کرام کے گ یں۔ اسی لئے اس دور میں بھی اردو کے جو شاعر پیدا ہوئے وہ خانقاہوں کے صاحب سجادہ یا حلقہ بگوش تھے۔ ان کے علاوہ میر حیدر الدین کامل اور میر محمود صابر کے سے فارسی اور اردو کے جو عظیم شاعر تھے وہ براہِ راست دربار سے واسطہ نہ رکھتے بلکہ مخدوم ہاشم اور محسن ٹھٹھوی جیسے باکمالوں کے ہم جلیس تھے۔ ایسے شعرا کی تعداد مجموعی طور پہ دہائیوں میں تھی جس کی تائید مقالات الشعراء سے ہوتی ہے۔

خانوادۂ تالپور

کلہوڑوں کے بعد سندھ کی عنان حکومت تالپوروں کے ہاتھ آئی۔ یہ خاندان اگرچہ سارے ملک کا مطلق العنان فرمانروا تھا لیکن اس نے نسلی اتحاد و اتفاق کی خاطر سندھ کو تین حصوں میں بانٹ لیا تھا۔ خیرپور، میرپور اور حیدرآباد۔ یہ تینوں علیحدہ علیحدہ حکومتیں تھیں لیکن مرکزیت حیدرآباد کو حاصل تھی اور اس کے حکمران تھے میر فتح علی خاں فاتح سندھ۔

سندھ کا یہ باجبروت حکمران صرف شجاع و مدبر ہی نہ تھا ادیب

---

[1] تاریخ سندھ صفحہ ۱۹۹۰ عہد کلہوڑہ حصہ دوم مولفہ غلام رسول مہر مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ کراچی، حیدرآباد ۱۹۵۸ء

وادب پرور بھی تھا۔

"وہ علمار وشعرار کا بہت قدرداں تھا۔ سفر وحضر میں علمار و شعرار اس کے ساتھ رہتے تھے۔ اس کے ادبی اور شعری ذوق کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس نے "سسّی پنوں" کے قِصّے کو مولانا جامی کی یوسف زلیخا کے طرز پر نئے سرے سے فارسی میں نظم کرایا تھا۔

میر فتح علی خاں کے درباری شعرار میں جس نے غیر معمولی عظمت حاصل کی، وہ میر عظیم الدین عظیم بن سید یار محمد، برادر میر علی شیر قانع ٹھٹھوی صاحب مقالات الشعرار تھا۔" [۱۱]

"میر غلام علی خاں تالپوروں کا دوسرا حکمران تھا۔"

"یہ بھی اپنے بھائی میر فتح علی خاں کی طرح علمار وشعرار کا قدرداں تھا۔" [۱۲]

پھر میر کرم علی خاں کا ولولہ انگیز عہد شروع ہوا جو سولہ سال بعد ۱۸۲۸ء میں اختتام پذیر ہوا۔

"میر کرم علی خاں شعرار اور اہل علم وفضل کا قدرداں تھا اور خود بھی فاضل، صاحبِ ذوق، سخن سنج اور شاعر تھا۔ اس کی تالیفات میں اس کا دیوان "دیوان کرم" کے نام سے موسوم ہے جو ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ اس کی دوسری تالیف "مجموعہ دلکشا"

---

[۱۱] تاریخ سندھ حصہ دوم از مولانا اعجاز الحق قدوسی صفحہ ۶۰۴، ۶۰۵، مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۷۴ء

[۱۲] تاریخ سندھ حصہ دوم از مولانا اعجاز الحق قدوسی صفحہ ۶۱۱، مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۷۴ء

ہے جس میں اس نے اپنے ذوق کے مطابق متقدم اور متاخر شعراء کے اشعار کو جمع کیا تھا۔

میر کرم علی خاں کے دربار سے بہت سے شعراء اہل علم وفضل وابستہ تھے۔ اس کی علمی وادبی سرپرستی کی وجہ سے اس کے دور میں شعر وادب، علم وفضل کو فروغ ہوا۔

ان (میر غلام علی مائل اور میر صابر علی صابر) کے علاوہ اس دور کے شعراء اور اہل علم میں مخدوم نور محمد بوبکانی، آخوند نور محمد ہالائی، میرزا خسرو بیگ چرکس، میر کاظم شاہ سرخوش، سلیمان صباحی، عبدالمجید جوکیو، منشی صاحب رائے آزاد، میر ہوتک افغان، آقا محمد عاشق، میرزا مظہر، سید طباطبائی، منشی دولہ رام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔" ۱۳؎

اس کا جانشین میر مراد علی خاں ہوا جو پانچ سال تک مسند آرائے حکومت رہا۔

"وہ نہایت صائب الرائے، باہوش اور دانا انسان تھا۔ اس نے اپنے حسن تدبیر سے ملک میں کسی شورش وفساد کو ابھرنے کا موقع نہ دیا۔

مراد علی خاں کی شخصیت بحیثیت مجموعی بہت دلکش تھی۔ وہ خود بھی نہایت سخن سنج، سخن شناس اور صاحب علم وفضل انسان تھا۔ علماء، دانشوروں اور ادیبوں کی نہایت قدر افزائی کرتا تھا۔" ۱۴؎

۱۳؎ تاریخ سندھ حصہ دوم از مولانا اعجاز الحق قدوسی صفحہ ۶۴۳ تا ۶۴۴ مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۷۴ء

۱۴؎ تاریخ سندھ حصہ دوم مولفہ اعجاز الحق قدوسی صفحہ ۶۵۴ مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۷۴ء

میر مراد علی خاں کے بعد میر نور محمد خاں اور میر محمد نصیر خاں یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے ۱۸۴۳ء میں انگریزوں سے میروں کا معرکہ ہوا اور سندھ ہندوستان کے دوسرے حصوں کی طرح انگریزی عملداری میں چلا گیا جس کے بعد خیرپور کی ایک چھوٹی سی ریاست باقی رہ گئی اور میرپور اور حیدرآباد کے پاس صرف گزارے کے لائق علاقہ بچ سکا۔

میروں کا زوال وقت کی ایک عبرتناک تاریخ ہے۔ وہ آپس کی پھوٹ اور سازشوں کا شکار ہو گئے ورنہ ان کا ہر فرد ذی ہوش اور صاحب تدبیر تھا۔ میران حیدرآباد میں میر نصیر خاں تالپور ایک تعلیمیافتہ، مستقل مزاج اور فیاض فرمانروا تھا۔ صاحب تکملۂ مقالات الشعراء نے اس کے اخلاق و اوصاف کو سراہتے ہوئے لکھا ہے۔

"شاعری میں "جعفری" تخلص کرتا تھا، صاحبِ تصانیف تھا۔ اس کی تصانیف میں حسب ذیل تصانیف کا پتہ چلتا ہے۔
دیوان فارسی (۱۲۳۳ھ)، دیوان اردو (۱۲۶۱ھ)، سفر نامہ (۱۲۶۰ھ)، مکاتیب جعفری ـــــ مثنوی مرزا و صاحبان، مثنوی مختار نامہ (۱۲۴۱ھ)۔"

"میر حسن علی خاں نہایت ہوشمند اور صاحب علم و فضل تھا۔ اس کی حسب ذیل تصانیف ہیں۔
لسان الحق فی میزان الصدق ـــــ مختار نامہ (منظوم سندھی) دو جلدیں، ردیائے صادقہ (نثر و نظم فارسی)، ہنر البکاء (سندھی سلام و مرثیے)، مثنوی فتح نامہ سندھ ـــــ احسن البیان (اردو نثر) ـــــ ردّ خوارج ـــــ مجموعہ خطوط ـــــ حالات شکار ـــــ مثنوی حملۂ حیدری، دیوان مناجات منقبت، دیوان قصائد، مراثی۔"

"میر عباس علی خاں بن میر نصیر خاں جعفری لقب سرکار شوکت مدار تھا۔ شاعر تھا اور مومن تخلص کرتا تھا۔ اس کا فارسی دیوان تھا جو اس کے بیٹے میر عبدالحسین کی وفات کے بعد ضائع ہو گیا۔ البتہ اس کی ایک مثنوی ملتی ہے۔ جو صاحب تکملۂ مقالات الشعرائ نے کسی خطی بیاض سے تکملۂ مقالات الشعرا میں بجنسہٖ نقل کر دی ہے۔"

"میر حسین علی خاں بن نور محمد خاں بن میر مراد علی خاں کا لقب سرکار دولت مدار اور تخلص حسین تھا۔ نظم و نثر فارسی، سندھی اور اُردو میں مہارت تامہ رکھتا تھا۔ اس کی تصانیف یہ ہیں۔ مناقب علوی (فارسی نثر)، شاہد الامامت (فارسی)، دیوان حسین (فارسی اور اردو)، دیوان حسین (اردو)"

میر صوبدار خاں ——— ماہر سخن: سنج اور بلند پایہ شاعر اور صاحب تالیف و تصنیف تھا۔
دس کتابیں اس کی تصانیف، منظومات اور تالیفات میں تحریر کی گئی ہیں۔"

"میر محمد علی خاں ——— شاعر تھا اور بہرور تخلص کرتا تھا ——— اس کی تصانیف میں دو مثنویاں ہیں۔ داستانِ رزم نادر شاہ، قصۂ رزم نامہ شیر۔"

"میر شہداد خاں حیدری ——— شاعر تھا اور حیدری تخلص کرتا تھا۔ اس کا دیوان دیوانِ حیدری کے نام سے موسوم ہے۔"

"میر یار محمد خاں ——— اگرچہ شاعر نہ تھا لیکن فارسی نثر لکھنے میں اساتذہ کا درجہ رکھتا تھا ——— اس نے ایک کتاب تاریخ سندھ پر لکھی تھی جس میں تالپور عہد حکومت کے حالات

نہایت تحقیق سے لکھے ہیں یہ ۱۵؎

حیدر آباد کے میروں کی طرح میران خیرپور میں بھی صلاحیت کی کمی نہ تھی۔ ان میں بھی بڑے بڑے لائق پیدا ہوئے۔ بالخصوص میر سہراب خان اور میر رستم خان کے جانشین میر علی مراد خان غیر معمولی مدبر، سلیقہ مند، عالی دماغ، مستقل مزاج، اولوالعزم فرماں روا تھے اور ہمارے خیال میں سیاسی سوجھ بوجھ میں وہ تمام میروں پر فوقیت رکھتے تھے۔ علمی حیثیت سے بھی وہ اپنے ہمعصروں میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ اسلامی فنون و تاریخ سے خاص طور پر شغف رکھتے تھے۔ ان کے دربار میں ان کی علم نوازیوں کی بدولت علماء اور شعراء آتے تھے اور وہ ان کی قدر افزائی کرتے تھے۔

اخوند محمد قاسم ہالائی سندھ کا سندھی اور فارسی گو مشہور شاعر اپنے ابتدائی زمانے میں حکومت انگلشیہ میں معمولی منشی کی حیثیت سے ملازم تھا۔ آخر ملازمت ترک کر کے میر علی مراد خاں والئ خیرپور اور میر حسن علی خاں تالپور (حیدر آباد) کے دامن دولت سے وابستہ ہوگیا۔ میر علی مراد خاں نے اس کی دوسو روپے تنخواہ اور میر حسن علی خاں نے اس کا پانچ روپیہ یومیہ مقرر کر دیا۔

مرزا محمد باقر تاج متخلص بہ آصف، جو فارسی کا ایک نغز گو اور شیریں گفتار شاعر تھا، کچھ زمانے تک میر علی مراد خاں کا وزیر رہا تھا۔ میر علی مراد خود بھی شعر و سخن سے مناسبت رکھتے تھے اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔

۱۵؎ تاریخ سندھ حصہ دوم صفحہ ۱۶۱ تا ۱۶۲، مولفہ مولانا اعجاز الحق قدوسی مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۷۴ء

صوفیہ اور اہل دل سے بھی خاص عقیدت رکھتے تھے، خصوصاً
حضرت سچل سرمست سے بہت مانوس تھے۔ ان کا فارسی دیوان
میر علی مراد ہی نے اپنے اہتمام سے طبع کرایا تھا۔[۱۶]

میران میر پور سے شجاعت و جواں مردی کی ان گنت داستانیں منسوب ہیں۔
ان کا نظم و نسق بھی اچھا تھا مگر علم و ادب کی طرف ان کا وہ رجحان نہ تھا
جس کی نظیریں میران حیدر آباد اور میران خیر پور نے قائم کی تھیں پھر بھی مجموعی
طور پر وہ اس خانوادے کے افراد تھے جو "تالپور" کے نام سے آج بھی علم و
ادب کے لیے ایک تاریخی منارۂ فیض ہے۔

"بحیثیت مجموعی تمام تالپور فرماں روا پڑھے لکھے، نکتہ سنج اور بعض
ان میں سے عالم، صاحب تصنیف و تالیف اور شاعر تھے اور
اپنے دور کے علماء و شعراء کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ان کے تعلقات
شریف مکہ، مسقط کے امام اور ایران کے قاچاری فرماں رواؤں
سے قائم ہونے کی وجہ سے حیدر آباد سندھ میں خراسان، ایران
اور عراق کے علماء و شعراء کی آمد و رفت کثرت سے ہوتی تھی اور
ان میں سے بعض میروں کی قدر افزائیوں کو دیکھ کر یہیں رہ پڑتے
تھے۔ مقامی علماء و شعراء کی بھی وہ بڑی قدر کرتے تھے۔
میر کرم علی خاں کے دربار میں سندھ کے بڑے بڑے عالم
اور شاعر اس کی قدر دانیوں کی وجہ سے جمع ہو گئے تھے۔"[۱۷]

---

[۱۶] تاریخ سندھ حصہ دوم صفحہ ۶۱۰، ۶۲۰، مولفہ مولانا اعجاز الحق قدوسی مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۷۴ء

[۱۷] تاریخ سندھ حصہ دوم صفحہ ۸۰، مولفہ مولانا اعجاز الحق قدوسی مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۷۴ء

امرائے تالپور کے بیشتر اہل علم، ادیب اور شاعر تھے اور فارسی سندھی کے ساتھ نہ صرف اُردو سے واقفیت رکھتے بلکہ اس میں لکھتے پڑھتے تھے اور شعر بھی کہتے تھے۔ انہوں نے جن ادیبوں اور شاعروں کی پرورش کی، ان کی اکثریت سندھ کے اُردو شعراء کے شمول میں ہے۔

سنہ ۱۸۴۳ء میں انگریزی اقتدار کے بعد علم و ادب کی یہ سرپرستی ایک طرح سے ختم ہو چکی تھی لیکن ریاست خیرپور اور میر پور د حیدرآباد کے باقیات الصالحات نے اس روایت کو زندہ رکھا بالخصوص خیرپور سندھ علم و ادب کی آخری پناہ گاہ بن کر رہ گیا اور صاحبان فن سندھ کے گوشے گوشے سے سمٹ کر خیرپور میں جمع ہونے لگے۔

سچل سرمست کے لیے میر علی مراد خان کی عقیدت ثبوت کی محتاج نہیں۔ ان کے علاوہ کتنے ہی شاعر اور ادیب تھے جن کی پرورش خیرپور سے ہوتی رہی۔ ان کے بعد میر فیض محمد خاں کا دور بھی کچھ ایسا ہی رہا۔ مقامی شعراء کے علاوہ دہلی کے شعراء دور دراز کا سفر کر کے آئے اور دربار فیض سے مستفیض ہو کر واپس ہوئے اور صرف شاعروں ہی پر منحصر نہیں، علماء اور ادباء پر بھی جود و کرم کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔

داد دہش کا یہ دریا ایک دور سے بہتا ہوا دوسرے میں اور دوسرے سے تیسرے دور میں داخل ہوا تو اس میں کچھ شدت آ گئی اور میر امام بخش خاں نے اپنے عہد میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کا اجلاس خیرپور میں منعقد کرا لیا سنہ ۱۹۱۹ء سندھ کے لیے ایک اہم سال تھا جب ہندوستان کے گوشے گوشے سے مسلم زعماء خیرپور میں جمع ہوئے تھے اور اس سرزمین نے مسلم مفاد کے ساتھ اُردو زبان کا بھی بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کیا تھا۔

اور شاید یہی سبب تھا جو اس کے بعد میر علی نواز خان کے عہد میں فارسی کے بجائے اُردو خیرپور کی درباری زبان بن گئی۔ یہ زمانہ ادب نوازی

اور شعراء پروری کے لیے بہت مساعد تھا کیونکہ میر علی نواز خود ایک بلند پایہ شاعر اور ادیب تھے۔

اسی زمانے میں کئی ذی علم اور ادیب خاندان باہر سے آکر خیرپور میں آباد ہوئے۔ اُردو کی ترویج کے لیے میر علی نواز خاں نے یہ اصول بنایا تھا کہ خاص خاص عہدوں پر اُردو داں افسروں ہی کا تقرر کرتے تھے جس سے اُردو بولنے کا رواج بڑھنے لگا۔

اس بے مثال اُردو پروری کی شہرت لکھنؤ اور دلی پہنچی تو بعض مفلوک الحال شاعر وقتاً فوقتاً میرپور کے عازم ہوئے۔ مشاہیر کو میر علی نواز خود دعوت دیتے تھے چنانچہ مولانا حسرت موہانی اور آغا حشر قزلباش کئی مرتبہ خیرپور پہنچے۔ شمیم امروہوی مرحوم خاص طور پر بلوائے گئے۔ لکھنؤ سے مولانا صفی تشریف لائے۔ خواجہ غلام السیدین، خواجہ حسن نظامی، علامہ حائری، بابائے اُردو مولوی عبدالحق اور دیگر مشاہیر کا آنا بھی ہوا۔ نواب نصیر حسین خیال، حکیم محسن صاحب ادیب، میر اولاد حسین شاعر سے بھی خیرپور کا رابطہ تھا اور وہ بھی اکثر سندھ کا سفر کرتے رہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ موجودہ مشاہیر میں ابوالاثر حفیظ جالندھری اور حکیم احمد شجاع وغیرہ بھی کبھی خیرپور کے وابستگان میں تھے۔

سیرت کے جلسوں اور مجالس میں بھی میر علی نواز خاں نے اُردو کو مروّج کیا۔

مولانا صبغۃ اللہ فرنگی محلی، مولانا بندہ حیدر اور حافظ کفایت حسین کی تقریروں نے اہل سندھ کو بار بار متاثر کیا۔

اس بابرکت عہد میں صرف اتنے ہی پر اکتفا نہیں کی گئی بلکہ مدارس میں بھی اُردو کو جگہ دی گئی اور مشرقی علوم کی بعض درسگاہیں کھولی گئیں جن میں اُردو خصوصی طور پر پڑھائی جاتی تھی۔

آپ کے جانشین میر فیض محمد دوم نے انہیں اصولوں کو برقرار رکھا اور ثانوی مدارس میں اُردو کو لازمی قرار دے دیا اور میر علی مراد خان ثانی نے ۱۹۴۷ء سے پرائمری اسکولوں میں اُردو کو رائج کر دیا۔[۱۸]

یہ وہ زمانہ ہے جب پاکستان بن چکا تھا اور اُردو کو قومی زبان کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔

اُردو کی ترویج میں صوفیائے کرام کا حصّہ

بلاشبہ اُردو کی سرپرستی میں سندھ کے امراء و رؤساء کا بڑا حصّہ ہے لیکن بنظرِ غائر دیکھا جائے تو اُردو کے حقیقی سرپرست، اربابِ اقتدار اور اہلِ دول سے زائد وہ افراد اور وہ مراکز تھے جہاں صرف محبت اور انسانیت کے درس دیئے جاتے تھے۔ جہاں چھوٹے بڑے کا کوئی امتیاز نہ تھا، جہاں پیر و مرید سب دلق پوش اور بوریہ نشین ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شروع سے آخر تک عوامی زبان کے شاعروں کی اکثریت فقراء اور صوفیاء کے مابین نظر آتی ہے۔

اس کا بنیادی سبب سارے ہندوستان کی طرح سندھ میں بھی یہی تھا کہ عوامی سطح پر عوامی بولی کی ضرورت محسوس کی جاتی تھی۔ خواص کی زبان فارسی اور سندھی عوام کی زبان سندھی تھی لیکن ایک صوفی کے دربارِ تصوف میں سندھی، پنجابی، ملتانی، دہلوی، گجراتی، کسی کے آنے پر کوئی پابندی نہ تھی لہٰذا عوامی الفاظ اور عوامی زبان کا استعمال ناگزیر تھا اور اسی ضرورت کے

---

[۱۸] ماخوذ از تاریخ خیرپور از نسیم امروہی مطبع خیرپور پریس ۱۹۵۵ء پچیس سالہ رپورٹ مشاورتی کمیٹی انجمن ترقی اردو کراچی سنہ ۱۹۳۰ء۔

تحت ابتداً ہندی دوہے، ابیات پھر صاف اُردو شعر صوفیائے کرام کی زبانوں پر جاری ہوئے اور اس کے بعد باقاعدہ شاعری کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

دلی، پنجاب اور دکن، ہر جگہ شاعری کا آغاز اسی نہج پر ہوا تھا۔ سندھ میں بھی ایسا ہی کچھ عمل میں آیا اور شاہ عبدالکریم بُلڑی نے اُردو کا نقش اوّل پیش کر دیا۔ ان کے ساتھ میر فاضل بکھری کا نام بھی لیا جاتا ہے جو ایک صوفی منش انسان تھے۔

"شاہ کریم بنیادی طور پر سندھی کے شاعر تھے لیکن انہوں نے فارسی اور اس کے ساتھ ساتھ اُردو میں بھی اشعار کہے ہیں۔ ان کے دیوانوں میں اُردو کے صرف دو شعر ہی ملتے ہیں لیکن یہ اتنی بات ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ سندھ میں اُردو شاعری کا آغاز دسویں صدی ہجری، سولھویں صدی عیسوی میں ہو چکا تھا۔ اسی دور میں میر فاضل بکھروی نے بھی اُردو میں شعر کہے لیکن ان کے اشعار دستیاب نہیں ہیں۔"[۱۹]

یہ تھا افتتاح اُردو شاعری کا خانقاہی حلقے میں جو سندھ میں قطب شاہ اور ولی گجراتی کے دور کی نمائندگی کرتا ہے۔ پھر وقت کی تدریجی ترقی کے ساتھ اس زبان کا ذوق شعری بڑھتا رہتا ہے اور صوفیانہ خیالات اُردو کے سانچے میں ڈھلتے رہتے ہیں۔

سترھویں صدی عیسوی میں ملا عبدالحکیم عطا ٹھٹھوی باقاعدہ اُردو غزل کی شمع روشن کرتے ہیں۔

"اس زمانے میں جبکہ شمالی ہند میں اُردو غزل کی داغ بیل پڑ رہی

۱۹۔ تاریخ شعرائے سندھ صفحہ ۱۶ مولفہ ہدایت علی تارک مترجمہ محمد حفیظ الرحمٰن حفیظ مطبوعہ عزیز المطابع بہاول پور ۱۳۶۵ھ

تھی، سندھ کے دور افتادہ علاقے میں اُردو شاعری کا ایک
اور آفتاب اُبھرا، جو زمانے کے رسم و رواج کے مطابق اگرچہ
فارسی گو شاعر تھا لیکن اس نے اُردو غزل کو اپنایا اس لیے ہم
اس کو سندھ میں اُردو کا محسن اور اُردو غزل گوئی کا پہلا شاعر
قرار دیتے ہیں۔"[۲۰]

دوسرا یا تیسرا نام میر محمود صابر کا لیا جا سکتا ہے جو حقیقتاً استر آبادی
تھے لیکن ٹھٹھہ میں آکر بس گئے تھے۔

"میر محمود کو ٹھٹھہ میں سکونت اختیار کیے ہوئے دس پندرہ برس
گزر چکے تھے یہ وہ وقت تھا کہ مخدوم محمد ہاشم (متوفی ۱۱۷۴ھ)
اور مخدوم محمد معین متوفی (۱۱۶۱ھ) جیسے نامور علماء اور محسن جیسے
سر برآوردہ شعراء علم و فن کی محفلیں گرما رہے تھے۔ اُردو شاعری
میں مخدوم محمد معین ممتاز تھے اور بیراگی تخلص کرتے تھے، گیت
اور دوہوں میں بھی خاص دسترس رکھتے تھے، محسن کو فارسی شاعری
میں کمال حاصل تھا۔"[۲۱]

کلہوڑہ دور کے اس ادبی اور شعری ماحول میں میر محمود صابر نے اُردو
کی طرف توجہ کی تو اس زبان میں بھی اپنا لوہا منوا کے چھوڑا۔

"۱۱۶۱ھ میں مخدوم محمد معین بیراگی فوت ہوئے تو میر محمود صابر
نے ٹھٹھہ میں اُردو شاعری کا چراغ روشن رکھا۔ پر سرام فارسی

---

[۲۰] صوفیائے سندھ اور اردو صفحہ۔، مصنفہ پروفیسر محمد معین الدین دردائی مطبوعہ آل
پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۷۳ء

[۲۱] سندھ میں اردو شاعری صفحہ۔ از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد
۱۹۷۰ء۔

کے شاعر تھے اور منتری تخلص کرتے تھے۔ انہیں اُردو ہندی میں شعر کہنے کا شوق ہوا تو میر محمود کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کر کے بیربل تخلص اختیار کیا ۔۲۲ھ

ہندوستان میں یہ اُردو شاعری کا پہلا دور تھا جس میں آبرو، مضمون اور مظہر جان جاناں وغیرہ ریختہ کو عمر دوام بخش رہے تھے، سندھ اُن کے ناموں اور کاموں سے بے خبر نہ تھا۔ اس نے بھی بیک وقت ابوتراب کامل، روحل فقیر، مراد فقیر زنگیجہ، شاہو خاں زنگیجہ، ثابت علی شاہ، حضرت سچل سرمست وغیرہ کتنے ہی شاعر پیدا کر دیے جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر قادر الکلام تھا اور بیشتر لوگ سندھی اور فارسی میں بھی شاعری کرتے تھے اس لیے ریختہ میں اظہار خیال کی قدرت تحیّر خیز ہے۔

اس گروہ میں اگر شاہ عبداللطیف بھٹائی کو شامل کر لیا جائے جس کے بعض آسان اشعار کو اُردو قرار دیا جاتا ہے، تو سندھی شاعروں کا پلہ ہلکا نہ رہے گا اور بقیہ ہندوستان اس کے مقابلے پر زیادہ بھاری نہ پڑ سکے گا۔

شاعروں کے اس زنجیرے میں میر حیدرالدین ابوتراب کامل ہر لحاظ سے ایک باکمال شخصیت تھے۔

"آپ ایک بلند پایہ ادیب اور شاعر تھے، کامل تخلص کرتے تھے۔ سندھی، اُردو اور فارسی کے صاحب دیوان تھے۔ میر علی شیر لکھتے ہیں کہ میر کامل نے اپنے کلام کے دس ضخیم مسودے تیار کیے جو آپ نے میاں محمد پناہ "رجا" ٹھٹوی

۲۲ھ سندھ میں اردو شاعری صفحہ ۱۱۰ از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۷۰ء۔

سندھ کے اردو شعراء کا تنقیدی جائزہ مصنفہ ریاض صدیقی ۱۹۷۰ء

کو نذر دین کے لیے دیے تھے۔ قانع اور "رجا" ان کے شاگردوں میں سے ہیں"۔ ۲۳ے

فقیر روحل کا دور کامل سے چند سال بعد کا ہے۔

"اپنے معتقدوں کی رہنمائی کے لیے روحل نے ہندی میں شاعری کی اور ہندی اور ان کے دوہا، چوپائی اور شبد وغیرہ تمام اصناف میں شعر کہے جن کو "اگم وارتا" "سرب گیان" "من پربودھ" اور "ادبھت گرنتھ" وغیرہ عنوان کے تحت ایک ضخیم جلد میں جمع کیا گیا ہے۔ روحل نے اپنے ہندی کلام میں توحید اور تصوف کے نکات کو اجاگر کیا ہے۔ خطہ سندھ میں روحل غالباً پہلا شاعر ہے جس نے "ہمہ اوست" کے جذبہ سے متاثر ہو کر خودی کا نعرہ بلند کیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ سچل کے پیش رو ہیں"۔ ۲۴ے

"روحل" کا دائرہ تصوف سندھ میں اُردو کی اساسی تاریخ ہے جس میں شعر گو فقراء کی خاصی تعداد ملتی ہے۔

"مراد فقیر سرائیکی زبان کے فصیح ترین شاعروں میں سے ہیں انھوں نے فارسی میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور مارواڑی اور سندھی آمیز ہندی میں دوہرے، کبت اور بھجن کہے ہیں۔ روحل اور مراد کے اشعار، جو ہندی کے بحور و اوزان میں

۲۳ے سندھ میں اردو شاعری صفحہ ۵ از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سنہ ۱۹۷۰ء

۲۴ے سندھ میں اردو شاعری صفحہ ۲۷، ۲۸ از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سنہ ۱۹۷۰ء

ہندی ہی کے اصناف سخن پر مشتمل ہیں، اُردو کے ابتدائی ارتقائی دور یعنی دورِ ہندی کا ایک مثالی نمونہ ہیں"۔[۲۵]

شاہو خان زنگنجہ رو حل کے صاحبزادے تھے "آپکو سندھی سرائیکی اور ہندی میں خاصی مہارت حاصل تھی اور اکثر ہندی آمیز اُردو میں بھی کلام موزوں فرماتے تھے"۔[۲۶]

اٹھارھویں صدی عیسوی کے اس حلقۂ تصوف سے ہٹ کر دیکھا جائے تو اُردو کے شعراء میں ایک اہم نام ثابت علی شاہ ثابت کا ہے۔

"سندھی میں مرثیہ گوئی کی بنا ڈالنے کا سہرا انہیں کے سر ہے ان کے مرثیے سندھی ادب میں اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ فارسی زبان کے صاحبِ دیوان شاعر تھے اور اُردو سے انہیں خاص ذوق تھا ــــ ان کے فارسی دیوان کے ایک قلمی نسخے میں ان کا کچھ اُردو کلام بھی محفوظ ہے"۔[۲۷]

سلسلے کے متعدد ناموں کے بعد ایک جذبات آفریں نام سچل سرمست کا آتا ہے جو کسی طرح محتاج تعارف نہیں مگر ــــ

"سچل کا اُردو کلام بھی ان کے سندھی اور سرائیکی بیت اور کافیوں کی طرح منتشر ہے اور غالباً اس کا کچھ حصہ ہی جمع ہوسکا ہے

۲۵ء سندھ میں اردو شاعری صفحہ ۳۲ از ڈاکٹر نبی بخش مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۷۰ء

۲۶ء صوفیائے سندھ اور اردو صفحہ ۱۳ از پروفیسر محمد معین الدین دردائی مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۷۳ء

۲۷ء سندھ میں اردو شاعری صفحہ ۷ از ڈاکٹر بخش بلوچ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۷۰ء

"سچل سرمست جو سرائیکی کلام" جس کو حکیم محمد صادق مرحوم رانی پوری نے مرتب کیا، اس کے آخر میں ایک حصہ اُردو کلام کے عنوان سے شامل ہے جس میں پچاس غزلیں شامل ہیں۔ سچل کی زبان صاف ہے۔ فارسی اور اُردو میں یہی رنگ غالب ہے" ۲۸ے

سندھ کے ایک اور ادیب رقمطراز ہیں۔

"فارسی اس وقت کی سرکاری اور سرائیکی حکمرانوں کی زبان تھی۔ لہٰذا سندھی کے ساتھ ان دونوں زبانوں کا یہاں کے علمی حلقوں میں خاصا رواج تھا لیکن اُردو نہ اُس وقت آج کی طرح قومی زبان تھی اور نہ ہی آج کی طرح اس کے بولنے والے سندھ میں ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے، اُردو سندھ میں ہندوستان کے بعض صوفی بزرگوں، سیلانی فقیروں اور مغلوں کے دربار سے تعلق رکھنے والے عمل داروں، فوجیوں اور فنکاروں کے ذریعہ آئی چنانچہ سچل سرمست کے زمانے میں یہاں اُردو جاننے والے ضرور موجود تھے۔ بہر حال یہ ایک مستند حقیقت ہے کہ اپنے ہم عصر پاکستانی (سندھی) شعراء میں سچل سرمست ہی وہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے اُردو میں شاعری کی" ۲۹ے

سندھی بساطِ شاعری کے اس جائزے میں ہندوستانی شعراء کو ترتیب ادوار کے اصول پر اگر اُردو شاعروں کی فہرست مرتب کی جائے تو کئی شاعر پہلے اور دوسرے دور، دونوں میں آتے ہیں اور سندھ کی سیاسی

۲۸ے سندھ میں اردو شاعری صفحہ ۹۴ از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سنہ ۱۹۷۰ء۔

۲۹ے مضمون سچل سرمست از ظہر حیدری صفحہ ۲۳ ماہِ نو کراچی جنوری سنہ ۱۹۶۸ء جلد ۲، شمارہ ۱۔

تاریخ کو دیکھا جائے تو بعض نے کلہوڑوں اور تالپوروں دونوں کے عہود کا احاطہ کیا ہے لہٰذا ایسی کسی قید کے بغیر زمانے کی تقدیم و تاخیر کے لحاظ سے صوفی شعراء کا اجمالی تعارف کرایا جا رہا ہے جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ شاہ عبدالکریم بُلڑی سے روحل فقیر تک اُردو کی جو سج دھج تھی، اٹھارھویں صدی عیسوی میں اس میں کس قدر تبدیلی ہوئی۔ اس سلسلے میں روحل کے بیٹے غلام علی زنگیجہ کے کلام کو دیکھا جائے تو الفاظ کی ساخت میں کافی صفائی نظر آتی ہے۔

انہوں نے سندھی، سرائیکی اور ہندی میں اشعار کہے ہیں۔ سندھی اور سرائیکی میں ان کی کافیاں محبت سے بھری ہوئی ہیں جن میں انہوں نے اپنے مرشد "شاہو سائیں" کے فیض و عرفان کا ذکر کیا ہے۔ بعض سرائیکی کافیوں کے مطلعوں میں اُردو زبان کے الفاظ اور فقرے نظم کیے گئے ہیں ـــــ روحل اور مراد کی تقلید میں غلام علی نے بھی ہندی زبان میں شاعری کی "۔[۱۳۰]

"روحل کے تیسرے بیٹے دریا خاں زنگیجہ تھے جو سندھی اور سرائیکی کے ساتھ اُردو میں بھی اشعار کہتے ہیں۔ آپ کا کلام معرفت اور تصوف کے نکات سے پُر ہوتا ہے۔ اپنے والد اور بھائی کی تقلید میں حضرت دریا خاں نے اپنی زبان ریختہ ہی رکھی، وہی سندھی اور ہندی الفاظ پر مشتمل زبان "۔[۱۳۱]

"دریا خاں کے ایک بھائی خدا بخش سائیں تھے۔ ان کے متعلق

---

[۱۳۰] سندھ میں اردو شاعری از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صفحہ ۷۰ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سنہ ۱۹۷۰ء

[۱۳۱] صوفیائے سندھ اور اردو از محمد معین الدین دردائی صفحہ ۴۳ مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی سنہ ۱۹۷۳ء

شعر گوئی کا پتہ نہیں چلتا مگر خدا بخش کے بیٹے نظر علی زنگیجہ نے
اس خاندانی روایت کو زندہ رکھا۔ انھوں نے سندھی، سرائیکی،
اور اُردو زبان میں کافی اشعار کہے ہیں، فارسی اور عربی کے اچھے
عالم تھے۔ آپ کو اُردو زبان پر جو قدرت حاصل تھی، اس کا
اندازہ ان کے اُردو اشعار ـــ سے ہوتا ہے۔" ۳۲

متصوفانہ شاعری کا یہ کارواں قید زمان کو توڑتا ہوا آگے بڑھتا ہے
تو کچھ لوگ زندگی کی بے وفائی سے تھک ہار کر پیچھے رہ جاتے ہیں اور
بعض نئے لوگ مسلک تبلیغ و اشاعت میں شامل کارواں ہو جاتے ہیں
اب اس میں کچھ نئے چہرے بھی ہیں اور کچھ وہ لوگ بھی جنھوں نے اٹھارویں
صدی کے باعظمت صوفیا سے رشد و ہدایت حاصل کی تھی۔ سجادہ ہائے
تصوف اگرچہ پہلے دن سے اُردو کا مستقر رہے تھے مگر اب ان کی وسعت
بڑھ رہی تھی چنانچہ اٹھارہویں صدی کے صوفیوں میں ایک نام قنبر علی شاہ
کا دکھائی دیتا ہے جس کی شاعری انیسویں صدی عیسوی میں نقطۂ عروج
پر پہنچی۔

"قنبر علی شاہ سندھی زبان کے سربراوردہ شعراء میں سے تھے اور
شریف تخلص کرتے تھے حضرت شاہ عبداللطیف کی نہج پر بیتوں اور
وائیوں پر اپنے رسالے کو منظوم کیا اس رسالے کے "سربیراگ
ہندی" کے تحت انھوں نے ہندی میں دوہے نظم کیے جن میں
سے اکثر ضائع ہو چکے ہیں" ۳۳

---

۳۲ سندھ میں اردو شاعری از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صفحہ ۸۲ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۷۰ء

۳۳ صوفیائے سندھ اور اردو از محمد معین الدین دردائی صفحہ ۱۴۸ مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل
کانفرنس کراچی ۱۹۷۳ء

اسی دور کے ایک شاعر محمد یوسف فقیر ہیں جو حضرت سچل سرمست کے مرید تھے۔

"بیعت لیتے وقت وہ مرید سے اُردو میں یہ الفاظ کہتے تھے۔ تم بھی سچے کا۔ میں بھی سچے کا"[۳۴] ان کی بعض سندھی کافیوں کے مطلعے اُردو میں ہیں۔

انیسویں صدی کے صوفی شاعروں میں غلام شاہ لغاری ایک صاحب طرز شاعر تھے۔

"آپ سندھی، سرائیکی اور اُردو میں زیادہ تر کافیاں ہی لکھتے تھے۔ آپ کے کلام پر مشتمل دو ضخیم بیاضیں آپ کے خاندان میں محفوظ ہیں جن کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُردو اشعار میں آپ سندھی اور ہندی الفاظ کا کافی استعمال کرتے ہیں اور غالباً اسی آمیزش کی وجہ سے انہوں نے اپنے اُردو کلام کو اپنی بیاض میں ہر جگہ ریختہ کا نام دیا ہے۔"[۳۵]

لغاری خاندان کے دوسرے شاعر خلیفہ نبی بخش ہیں "سندھی اور سرائیکی کے علاوہ خلیفہ صاحب کا اُردو کلام بھی مختلف اصناف سخن پر مشتمل ہے۔ سندھ کے حلقہ صوفیا میں اس دور کے اُردو شاعروں کی تعداد کافی ہے لیکن بہت سے نام ابھی گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں"[۳۶]

۳۴۔ سندھ میں اردو شاعری از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صفحہ ۸۵ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سنہ ۱۹۷۰ء

۳۵۔ صوفیائے سندھ اور اردو از محمد معین الدین دردائی صفحہ ۱۵۶ مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی سنہ ۱۹۷۳ء

۳۶۔ سندھ میں اردو شاعری از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صفحہ ۹۰ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سنہ ۱۹۷۰ء

جن لوگوں کا سراغ لگ سکا ہے، ان میں قادر بخش بیدل" ایک بلند پایہ عالم، صوفی، شاعر اور مصنف تھے ـــ بیدل نے عربی فارسی، سندھی، سرائیکی اور اردو میں شاعری کی۔ وہ ایک صاف دل صوفی تھے۔ ان کا کلام عارفانہ نکات کا حامل ہے۔ اُردو میں صاحب دیوان تھے۔" [۳۷]

"کافی گو شاعروں میں ابراہیم شاہ کو ایک خاص مقام حاصل تھا۔ تخلص فقیر اور صوفی کرتے تھے۔ اُردو میں بھی کافیاں کہیں۔ ان کا اکثر کلام ضائع ہو چکا ہے۔" [۳۸]

فتح دین شاہ جہانیاں پوٹہ اور قطب الدین شاہ جہانیاں پوٹہ بھی اسی سلسلے کے شاعر تھے۔ دونوں فارسی، سندھی اور اُردو کے ماہر تھے۔" فتح دین فتح کا ۴۴ غزلوں پر مشتمل ایک فارسی دیوان موجود ہے ـــ اُردو میں ان کی ایک کافی ملتی ہے۔" [۳۹]

"حضرت قطب الدین شاہ سندھی کے بہت اچھے شاعر تھے اور قطب تخلص فرماتے تھے۔ اُردو میں بھی ان کے کچھ اشعار کافی کے رنگ میں ملتے ہیں۔" [۴۰]

۳۷۔ سندھ میں اردو شاعری از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صفحہ ۱۰۶ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سنہ ۱۹۷۰ء

۳۸۔ سندھ میں اردو شاعری صفحہ ۱۱۱ از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سنہ ۱۹۷۰ء

۳۹۔ سندھ میں اردو شاعری صفحہ ۱۱۳ از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سنہ ۱۹۷۰ء

۴۰۔ صوفیائے سندھ اور اردو صفحہ ۱۸۰، از معین الدین دردائی مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی سنہ ۱۹۷۳ء

"حمل خاں سندھی اور سرائیکی زبانوں کے بلند پایہ شاعر تھے ان کا سندھی اور سرائیکی کلام مدح، معجزہ، منقبت، مثنوی، سہ حرفی، غزل، بیت، کافی اور معما وغیرہ اصناف سخن پر مشتمل ہے۔ حمل خاں نے اُردو میں اشعار کہے جس میں سے تھوڑا دستیاب ہوا ہے" ۱۴۱ے

"مہدی شاہ نے اپنی بعض سندھی کافیوں میں اُردو الفاظ، فقرے اور مطلعے استعمال کیے ہیں" ۱۴۲ے

"فقیر محمد محسن (بے کس) نے سندھی، سرائیکی اور فارسی میں اشعار کہے۔ سرائیکی میں جو کافیاں نظم کی ہیں۔ ان میں بعض مصرعے اور فقرے ایسے ہیں کہ ان کو اُردو کہا جا سکتا ہے ــ نظمیں بیشتر اُردو میں کہی ہیں" ۱۴۳ے

"نواب اللہ داد خاں ایک باوقار اور صوفی منش بزرگ تھے فارسی میں صاحب دیوان تھے۔ اس کے علاوہ قصہ تسکین و شیدا، مثنوی اصغر، مثنوی مسکین فارسی میں لکھیں۔ سندھی، سرائیکی اور اُردو میں بھی ان کا کلام موجود ہے" ۱۴۴ے

۱۴۱ے سندھ میں اردو شاعری صفحہ ۱۲۸، از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سنہ ۱۹۷۰ء

۱۴۲ے سندھ میں اردو شاعری صفحہ ۱۳۰ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سنہ ۱۹۷۰ء

۱۴۳ے سندھ میں اردو شاعری صفحہ ۱۳۴، از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سنہ ۱۹۷۰ء

۱۴۴ے سندھ میں اردو شاعری صفحہ ۱۳۸، از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سنہ ۱۹۷۰ء

"مخدوم امین محمد صاحب سندھی زبان کے اچھے شاعر تھے ـــ
اُردو میں بھی شعر کہتے تھے اور امین تخلص کرتے تھے۔"[۴۵]

"غلام حیدر عالی ہمت اور بلند حوصلہ کے مالک تھے، خود کے
لیے "تیرھا" یعنی شہباز کا تخلص اختیار کیا ـــ اُردو کلام بھی
پایا جاتا ہے۔"[۴۶]

(نواب غلام اللہ خاں لغاری) "ذوق شعر و ادب انہیں ورثہ میں
ملا تھا۔ سندھی، سرائیکی اور ہندی میں آپ کا اچھا خاصا کلام
موجود ہے، مسکین تخلص کرتے تھے۔" "تبلیغ و ہدایت کے لیے
انھوں نے زبان ہندی میں انہی اصناف پر طبع آزمائی کی جن سے
ہندو مانوس تھے ـــ ایسا کلام جو نسبتاً زیادہ اُردو آمیز ہے۔"[۴۷]

(محمد ابراہیم خلیل ٹھٹوی) "خلیل کو سید غلام محمد شاہ گدا کی
صحبت میں اُردو کا ذوق پیدا ہوا۔"[۴۸]

"پیر نصیر الدین کا سندھی اور فارسی میں کلام موجود ہے۔ ان
کی سندھی کافیاں مشہور ہیں۔ اُردو میں بھی ان کا کلام پایا

---

۴۵ سندھ میں اردو شاعری صفحہ ۱۴۱، از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی
حیدرآباد ۱۹۷۰ء

۴۶ سندھ میں اردو شاعری صفحہ ۱۴۷، از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی
حیدرآباد ۱۹۷۰ء

۴۷ سندھ میں اردو شاعری صفحہ ۱۴۵، از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی
حیدرآباد ۱۹۷۰ء

۴۸ سندھ میں اردو شاعری صفحہ ۱۴۸، از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی
حیدرآباد ۱۹۷۰ء

جاتا ہے"۔[۴۹]

"سید غلام محمد شاہ بن حسن علی شاہ کا خاندان اصل مشہدی سادات تھا۔ سندھی، فارسی اور اُردو کے بلند پایہ شاعر تھے۔ "سائل" نے اپنے ایک سندھی شعر میں گدا کو اُردو کا آتش ثانی قرار دیا ہے"۔[۵۰]

(غلام مرتضیٰ شاہ مرتضائی) "مرتضائی سندھی کے بلند پایہ غزل گو شاعروں میں سے تھے۔ گزشتہ روایت کے مطابق انہوں نے فارسی میں بھی شعر کہے اور ان کی فارسی غزلیں دیوان مرتضائی کے آخر میں موجود ہیں مگر مرتضائی نے عمداً اور ارادۃً فارسی کو چھوڑ کر سندھی میں شاعری کی اور خوب کی۔ بعد میں فارسی کے بجائے وہ اُردو کی طرف متوجہ ہوئے"۔[۵۱]

"حضرت پیر حزب اللہ شاہ تخت والا بڑے خدا رسیدہ اور صوفی با صفا بزرگ تھے —— فارسی اور اُردو میں اشعار موزوں فرماتے تھے"۔[۵۲]

۴۹؎ سندھ میں اردو شاعری صفحہ ۱۷۱ از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۷۰ء

۵۰؎ سندھ میں اردو شاعری صفحہ ۱۷۲ از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۷۰ء

۵۱؎ سندھ میں اردو شاعری صفحہ ۱۸۲ از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۷۰ء

۵۲؎ صوفیائے سندھ اور اردو از معین الدین دردائی صفحہ ۲۰۹ مطبوعہ آل ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۷۳ء

"سوبھا فقیر کا مجموعۂ کلام "دیوان ذرد عشق" چھپ چکا ہے جس میں ان کی سندھی اور سرائیکی کافیاں اور نظمیں شامل ہیں۔ سرائیکی کافیوں کے بعض مطلعے اُردو میں ہیں۔"[۵۳]

"پیر کمال الدین ایک فقیر منش صوفی تھے۔ انہوں نے سندھی اور سرائیکی میں کافیاں، ابیات اور سی حرفیاں کہی ہیں جن میں اپنا نام کمال لائے ہیں۔ ان کے مجموعہ کلام کا ایک قلمی نسخہ جو خود ان کا اپنا نسخہ تھا، ــــ موجود ہے جس میں بعض کافیوں کے مطلعے یا مصرعے اُردو میں ہیں۔"[۵۴]

"نواب فقیر ولی محمد کو شاعری کا شوق جوانی میں اس وقت پیدا ہوا جب وہ فقیری کی طرف مائل ــــ سندھی، سرائیکی، اُردو اور فارسی میں ان کا کلام موجود ہے جس پر صوفیانہ رنگ غالب ہے۔"[۵۵]

"مصری شاہ نے سندھی، سرائیکی، اُردو اور فارسی میں شاعری کی۔ وہ سندھی کافی کے بلند پایہ شاعر تھے اور کافی کو انہوں نے غزل کا ہم دوش بنا دیا۔ اُردو اور ہندی میں بھی کافیاں

---

۵۳ سندھ میں اردو شاعری صفحہ ۱۹۲ از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۷۰ء

۵۴ سندھ میں اردو شاعری صفحہ ۱۹۹ از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۷۰ء

۵۵ سندھ میں اردو شاعری صفحہ ۲۰۵ از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۷۰ء

ہی منظوم کیں ۔ ۵۶؎

"پیر بھادن علی شاہ ساقی تخلص کرتے تھے۔ سندھی کے علاوہ فارسی اور اُردو میں بھی شعر کہتے تھے"۔ ۵۷؎

"پیر جمال الدین نے فارسی، سندھی اور اُردو میں شاعری کی"۔ ۵۸؎

"(کلیم اللہ شاہ) طبع موزوں پائی تھی۔ سندھی، سرائیکی، فارسی اور اُردو میں آپ کا کلام موجود ہے"۔ ۵۹؎

"حضرت سائیں عبدالغنی اُردو کے قادر الکلام شاعر تھے۔ آپ کے کلام کا مجموعہ "کلام عرفان غنی" کے نام سے چھپ چکا ہے"۔ ۶۰؎

"قائم فقیر غلام حیدر فقیر کے دوسرے فرزند تھے ــــ قائم فقیر نے بھی فارسی اور سندھی کے ساتھ ساتھ اُردو میں شاعری

۵۶؎ سندھ میں اردو شاعری صفحہ ۲۱۳، از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سنہ ۱۹۷۰ء

۵۷؎ سندھ میں اردو شاعری صفحہ ۲۱۶ از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سنہ ۱۹۷۰ء

۵۸؎ سندھ میں اردو شاعری صفحہ ۲۴۷، از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سنہ ۱۹۷۰ء

۵۹؎ سندھ میں اردو شاعری صفحہ ۲۶۵، از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سنہ ۱۹۷۰ء

۶۰؎ صوفیائے سندھ اور اردو صفحہ ۲۵۰، از معین الدین دردائی مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی سنہ ۱۹۷۰ء

کی ہے اور اُردو شاعری بھی ان کی سندھی اور فارسی شاعری کی طرح صوفیانہ لہجہ لیے ہوئے ہے۔" ۱۶۱؎

یہ ہے اُردو کے سلسلے میں صوفیائے سندھ کے ذوق شعری کا مختصر سا تعارف جو سن عیسوی کے حساب سے تین صدیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور تقریباً اُس پورے دور کا احاطہ کرتا ہے جس میں اُردو دلی اور دکن میں پروان چڑھی۔

ہندوستان میں خانقاہیں اور تبلیغی مراکز اُردو کی پرورش گاہ تھے سندھ کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ یہاں کے حالات بقیہ ہندوستان سے مختلف تھے۔ یہاں ایک عوامی زبان سندھی موجود تھی لہٰذا ہندوستان کی بین الاقوامی زبان کی ضرورت محسوس نہ کی جاتی ہوگی، لیکن مندرجہ بالا مشاہدات کی روشنی میں یہ خیال باطل ٹھہرتا ہے۔ سولھویں صدی عیسوی سے لے کر انیسویں صدی تک شاید ہی کوئی صوفی ایسا گزرا ہو جس نے اُردو کی طرف توجہ نہ کی ہو بلکہ اس میں اظہار خیال کی ضرورت کا احساس نہ کیا ہو۔

اسباب بالکل وہی تھے جنھوں نے ہندوستان کے صوفیائے کرام کو مجبور کر دیا تھا۔ فارسی کے بجائے اس زبان کے اپنانے پر۔ دلیل کے طور پر نواب غلام اللہ خاں لغاری کے سلسلے میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے الفاظ پیش کیے جاتے ہیں۔

"فقیر نواب غلام اللہ کے اعلیٰ اخلاق اور انسان دوستی سے

۱۶۱؎ سندھ میں اردو شاعری کا ارتقاء صفحہ ۱۱۹ مطبوعہ الحمرا اکیڈمی لاہور سنہ ۱۹۶۲ء بحوالہ مقالہ غلام حیدر فقیر برائے ایم اے سندھ یونیورسٹی حیدرآباد (صفحہ ۴۵)

متاثر ہو کر نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو بھی ایک کثیر تعداد میں آپ کے معتقد ہوئے بلکہ مریدوں کے زمرہ میں شامل ہو گئے۔ ان کی تبلیغ اور ہدایت کے لیے انھوں نے زبان ہندی میں انھی اصناف پر طبع آزمائی کی جن سے ہندو مانوس تھے اور جو ان میں مقبول تھیں۔ ان کے ہندی کلام کا زیادہ تر حصہ شبدوں اشلوکوں اور پوڑیوں پر مشتمل ہے۔ اس نصیحت آمیز کلام میں انسانی اخلاق کی بلندی، توحید اور معرفت کی تبلیغ کی گئی ہے۔ ایسا کلام جو نسبتاً زیادہ اُردو آمیز ہے''۔ [۲۶]

ڈاکٹر صاحب نے یہ حالات ایک لغاری صوفی کے بارے میں پیش فرمائے ہیں لیکن اگر ان کا اطلاق حضرت گیسو دراز پر کیا جائے تو سر مو کوئی فرق نہ نکلے گا۔ اس کا مطلب واضح طور پر یہی ہے کہ ہندوستان میں اُردو کی ترویج میں جن عوامل کی کارفرمائی تھی، وہی عوامل لگ بھگ سندھ میں بھی موجود تھے۔ ماحول البتہ کچھ مختلف تھا اسی لیے شعراء کی وہ کثرت نہیں تھی۔ جو شمالی ہندوستان میں پائی جاتی تھی۔ پھر بھی سندھ نے ہر دور میں ایسے باکمال پیدا کیے جو شاعری کی کسی سطح پر بھی دلی اور دکن والوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور خانقاہوں کی حد تک تو پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اُردو کی وہی خدمت کی جو خدمت کرنے کا حق ہے۔

سندھ کے دینی مدارس اور اُردو

صوفیائے کرام اور علماء کے تسلسل میں متجسس نگاہ خود بخود ترتیب و

---

[۲۶] سندھ میں اردو شاعری صفحہ ۴۳ از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۷۰ء

اداروں اور ابتدائی تعلیم گاہوں پر جاکر ٹھیر جاتی ہے اور غیر ارادی طور پر عربی فارسی اور سندھی کے جلو میں اُردو کے نقوش ڈھونڈھنے کی کوشش کرنے لگتی ہے لیکن اسے کامیابی نہیں ہوتی۔ اس کوشش میں زمانے کی تاریخ ورق پر ورق الٹتی رہتی ہے اور ایک منظر کے بعد دوسرا منظر نظروں سے سامنے سے گزر جاتا ہے۔ عربوں کا ورود، سلطان محمود کے حملے، شہاب الدین غوری کی یلغار، سومروں کا استقرار حکومت، ارغونی اور ترخونی دور کی سیاست اور سندھ کا ہر انقلاب، جس سے سندھ کی ثقافت متاثر ہوتی رہی، چشم تصور میں جگہ لے لیتا ہے لیکن مدرسوں کی نوعیت ہر دور میں یکساں دکھائی دیتی ہے، ان میں کوئی تبدیلی محسوس نہیں ہوتی۔

ملاؤں کے مکتبوں، مساجد کے حجروں اور بیٹھکوں میں انفرادی تعلیم، جو غزنی، لاہور اور دلّی میں تھی، وہی دیبل، منصورہ اور ملتان میں نظر آتی ہے اور صدیوں پر صدیاں بیت جاتی ہیں ــــ جس کا بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر ایچ ٹی سورلے رقم طراز ہیں۔

"ٹھٹھہ، روہڑی، ٹیاری اور دوسرے مقامات میں، جہاں سادات بستے تھے وہاں یہ ایک عام رواج تھا کہ کوئی دولت مند آدمی اپنے بچوں کے لیے کسی اخوند یا معلم کی خدمات حاصل کر لیتا اور محلے کے ہمسایہ بچوں کو بھی اس سے استفادہ کرنے کی اجازت دے دیتا۔ بعض مقامات پر مقدس علماء جمعہ جمعہ اخلاقیات اور معرفت الٰہی کے درس دیا کرتے اور عربی فارسی کے حوالوں سے اپنے مفہوم کی صراحت کرتے تھے۔ معاوضۂ تدریس میں بچے جو کچھ لے آتے وہ لے لیا کرتے ورنہ ان کا صحیح معاوضہ وہی ہوتا جو عید کے موقع پر تحائف کی شکل میں ملتا تھا یا جب کوئی بچہ اس درس کے ابتدائی دس اسباق پر

عبور حاصل کر لیتا تو اس کے ہاتھ سند کے طور پر ریشمی رومال سے باندھ دیے جاتے اور وہ بستی کا ایک چکر لگا کر اپنے معلم کے لیے نذرانہ جمع کیا کرتا تھا۔

فارسی مسلمانوں کی ادبی اور کاروباری زبان تھی مگر جو ہندو حکومت کی ملازمت کے خواہاں ہوتے وہ بھی اس کو انہیں ذرائع سے حاصل کرتے تھے، اس کے علاوہ سیکڑوں مولوی مساجد کے صحنوں یا درختوں کے نیچے بیٹھ جایا کرتے اور لڑکے لڑکیوں کو کلام پاک کی تلاوت کرایا کرتے تھے، جس کے بدلے انہیں غلہ اور بعض دوسری چیزیں ملا کرتی تھیں۔ ۱۸۵۳ء میں کراچی، حیدرآباد، شکارپور اور ان کے مضافات میں کوئی چھ سو سے زائد ایسے مدرسے ہوں گے۔ سندھی عوامی زبان تھی جو حصول علم اور خط و کتابت کے لیے موزوں تھی۔ ہندو اس کو دیوناگری میں لکھتے تھے اور اسی میں اپنا کاروباری حساب لکھتے تھے جس کو وہ عموماً گھر پر پڑھتے ورنہ بعض ادارے بھی تھے جو اس کو سکھاتے تھے۔" [۶۳]

یہ ہے تدریسی ڈھانچہ تالپوری عہد کا جو انگریزوں کے ابتدائی دور تک باقی رہا۔ اس سے قبل بھی تعلیم کا کچھ ایسا ہی طریقہ تھا جس کا آغاز عربوں کے زمانے میں ہوا تھا اور پھر ہر دور میں اس کی متابعت کی جاتی رہی تھی کہ سومروں کے بعد سموں کا زرین عہد شروع ہو گیا۔

---

۶۳ THE GAZETTEER OF W. PAKISTAN THE FORMER PROVINCE OF SIND PAGE 675 (1968)

"سمّوں سے پہلے اسلامی طریقے کے مطابق مدارس مسجد میں قائم تھے مگر سمّوں کی حکومت کے زمانے میں مدارس کیلیے علیحدہ عمارتیں تعمیر ہوئیں جن میں اپنے وقت کے جلیل القدر محدث اور بلند پایہ ادیب تعلیم دیتے تھے۔ صرف ٹھٹھہ میں مدارس کی تعداد ہزار کے قریب تھی۔ اس کے علاوہ بھکر، سیوہن اور کاہان تعلیمی مرکز تھے۔"[۶۴]

ارغونوں، ترخونوں اور مغلوں کے دور میں بھی طریقۂ تعلیم پہلا جیسا رہا۔ کلہوڑوں نے اس کی طرف خاص توجہ کی۔ مولانا غلام رسول مہر نے کپتان ہملٹن کا بیان نقل کیا ہے جو ۱۶۹۹ء میں ٹھٹھہ میں آیا تھا۔

"شہر ٹھٹھہ دینیات، لسانیات اور سیاسیات کی تدریس و تعلیم کے سلسلے میں خاصی شہرت کا مالک ہے۔ وہاں چار سو کالج ہیں جن میں نونہالوں کو ان علوم کی تعلیم دی جاتی ہے۔"[۶۵]

اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں کہ کالجوں سے مراد غالباً ویسے کالج نہیں جیسے ہمارے زمانے میں موجود ہیں۔ ان سے مراد بہر حال درسگاہیں ہیں لیکن پرانے زمانے میں ایسی ہی درس گاہیں ہر جگہ قائم تھیں یہی ہمارے ہاں نشر و اشاعت علوم کا ذریعہ تھیں اور علوم کی ہر دل عزیزی کا یہ حال تھا کہ شاہ جہاں نے ایک موقع پر فخریہ کہا تھا، پورب ہمارا شیراز ہے۔ اکثر درس گاہوں کو حکومت کی طرف سے امداد ملتی تھی۔ بعض ایسی

۶۴ؔ تاریخ سندھ مولفہ مولانا اعجاز الحق قدوسی حصہ اول صفحہ ۳۸۵ مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور سنہ ۱۹۷۶ء

۶۵ؔ تاریخ سندھ حصہ دوم (عہدہ کلہوڑہ) مولفہ مولانا غلام رسول مہر صفحہ ۷۷۹ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ کراچی حیدرآباد سنہ ۱۹۵۸ء

بھی تھیں جو مختلف علماء کرام کی سعی و ہمت کی بدولت چل رہی تھیں۔ ہمارے ملک میں جن اصحاب نے علمی لحاظ سے درجۂ شہرت و اختیار حاصل کیا، وہ انہیں درسگاہوں سے اُٹھے تھے۔

اسی سلسلے میں مولانا نے ذخیرۃ الخوانین سے فرید بھکری کا بیان شہادت میں پیش کیا ہے۔

"ٹھٹھے کے اولیاء، علماء اور شعراء کی گنتی محال ہے۔ یہاں صرف و نحو، دینیات اور شاعری عام ہے۔ مختصر یہ کہ ٹھٹھہ کو عراق ثانی سمجھنا چاہیئے۔"

تالپور کلہوڑہ کے جانشین تھے اور علم دوستی میں بھی انہوں نے سندھ کی روایات برقرار رکھی تھیں۔

"انہیں اپنے زمانے میں تعلیم کو عام کرنے سے بڑی دلچسپی تھی انہوں نے اپنے اپنے علاقوں میں عوام کی تعلیم کے لیے جابجا مکاتب اور مدارس قائم کیے تھے۔ ان کے عہد میں خصوصاً سندھ میں علمی مرکز مشہور تھے

(۱) سیوہن، (۲) ٹلٹی، (۳) کھرڑا، (۴) مٹیاری (۵) مہڑ (۶) عمرکوٹ۔

اس کے علاوہ انہوں نے گاؤں گاؤں اور شہر شہر شاہی خزانے سے روپیہ خرچ کر کے مکاتب کھولے تھے۔ بڑے بڑے مدارس کے نصاب میں صرف و نحو، منطق، فقہ، تفسیر، حدیث، معانی بیان وغیرہ فنون پڑھائے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ تالپور خاندان کی بیگیات بھی تعلیم کے پھیلانے میں بڑی دلچسپی رکھتی تھیں۔ شہزادی خیراں نے ایک مدرسہ قائم کیا تھا اور اس کے سارے اخراجات وہ خود

اٹھائی تھیں۔[۶۶]

لیکن جہاں تک ابتدائی سطح پر طریقۂ تعلیم کا تعلق ہے وہ وہی تھا جو ہمیشہ سے چلا آیا تھا اور جس کا مشاہدہ انگریزی عملداری میں کیا گیا۔

خلاصہ ان تفصیلات کا یہ ہے کہ انیسویں صدی کے وسط تک سندھ میں ابتدائی مدارس اور اعلیٰ درس گاہیں دوش بدوش چل رہی تھیں۔ ابتدائی مدارس میں کلام پاک، دینیات اور معمولی فارسی اور سندھی پڑھائی جاتی تھی۔ اعلےٰ درسگاہوں میں مختلف علوم کی تعلیم دی جاتی جس میں عربی، فارسی، فقہ، منطق و فلسفہ وغیرہ سب کچھ شامل تھا۔

بدیہی طور پر اُردو کا تعلق اگر ہو سکتا ہے تو اعلیٰ سطح کی درس گاہوں سے جہاں ابتدائی مدرسوں کی طرح ہر متعلم کو علیحدہ علیحدہ درس دیا جاتا تھا ۔۔۔ اُردو جب تک صرف بولی کی تعریف میں تھی، اس وقت تک سندھ کے بڑے مدرسوں اور مراکز تبلیغ میں صرف اس کے فقروں کا استعمال ہوتا رہا۔ جس کی نظیریں ذخیرۃ الخوانین مولفہ شیخ فرید بھکری کے حوالے سے سابقہ ابواب میں پیش کی جا چکی ہیں۔ اس کے بعد وہ زمانہ آجاتا ہے جب شاہ عبدالکریم بلڑی اور میر فاضل نے اُردو شاعری کی بنیاد ڈالی جو ایک واضح دلیل ہے اس بات کی کہ اُس دور میں لوگ اُردو سے واقف تھے کیونکہ شاعر اُس وقت تک شعر نہیں کہتا جب تک اس کے سمجھنے والے موجود نہ ہوں ۔۔۔ اور یہ سخن فہم حلقہ بغیر تدریس کے پیدا نہ ہو سکتا جو دینی مدارس کے علاوہ کہیں ممکن نہ تھی۔ سندھی کا رسم الخط سمہ عہد سے عربی تھا مگر وہ دیوناگری اور عربی نما نستعلیق میں بھی لکھی جاتی تھی اور اُردو شروع ہی سے

---

[۶۶] تاریخ سندھ حصہ دوم از مولانا اعجاز الحق قدوسی صفحہ ۹، مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۷۴ء

نستعلیق میں لکھی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنا چاہیئے کہ بہت سے اُردو الفاظ سندھ میں بولے اور سمجھے جاتے تھے لہٰذا اعلیٰ تدریسی ماحول میں اس کا سیکھنا چنداں مشکل نہ تھا۔ کلہوڑوں اور میروں کے ادوار میں مختلف مقامات پر عظیم درس گاہوں کا ثبوت ملتا ہے مگر کسی تاریخ یا تذکرے میں اس کی صراحت پائی نہیں جاتی کہ وہاں اُردو بحیثیت مضمون پڑھائی جاتی ہو۔ لیکن دلّی سے سندھ کا باضابطہ رابطہ مغل دور حکومت سے قائم ہو چکا تھا اور ہندوستان کے بہت سے خاندان سندھ میں آکر بس گئے تھے جو اُردو داں اور اُردو خواں تھے اور خود سندھ کے قدیم باشندوں میں بھی اہل علم کی بڑی تعداد موجود تھی جو شعر و ادب میں دستگاہ رکھتی تھی تو ایک فطری سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان سب نے اُردو کیونکر پڑھی ظاہر ہے کہ طریقۂ تعلیم ہر شخص کے لیے استاد سے علیحدہ علیحدہ پڑھنے کا تھا لہٰذا جو لوگ اُردو سے دلچسپی رکھتے تھے، وہ اُردو داں استادوں سے اکتساب علم کرتے ہوں گے تب ہی فارسی اور سندھی کا ہر بڑا ادیب و شاعر اُردو کا شاعر بھی ہوتا تھا۔

اس رواج میں وقت کے ارتقاء کے ساتھ اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ کلہوڑہ عہد میں اُردو شاعروں کی تعداد بڑھ گئی اور میروں کے دور میں تو مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی ہوئی جو بہر طور اس حقیقت کی بین دلیل ہے کہ اس زبان کے جاننے والے سندھ میں کثرت سے تھے اور اس کثرت کے پس پردہ یقیناً تدریسی اداروں اور تعلیمی افراد کی کارگزاری شامل ہوگی۔

یہ ادارے اگر باقی رہتے اور ہندوستان سے سندھ کے رابطے میں استواری ہوتی تو اُردو کا مستقبل سندھ میں بھی وہی تھا جو ہندوستان کے دوسرے حصوں میں لیکن ۱۸۴۳ء میں انگریز اس علاقے پر بھی قابض ہو گئے اور ۱۸۵۲ء میں انہوں نے فارسی کو ختم کر کے سندھی کو عربی کا رسم الخط دے

دیا۔ اس سیاسی انقلاب نے سندھی مسلمانوں کو جتنا بھی نقصان پہنچایا ہو وہ تو پہنچا ہی مگر تعلیم و ثقافت تباہ ہو کر رہ گئی جس کا الزام انگریزوں تے میروں کے سر ڈال دیا۔

بڑی بڑی درسگاہیں ختم ہوگئیں ملاؤں کے مکتب کس مپرسی کی نذر ہو گئے اور سندھ لسانی اعتبار سے جہالت کی تاریکی میں جا پڑا مگر سندھ کے لیے نامساعد حالات سے گزرنا کوئی نئی بات نہ تھی۔ یہ خطّہ ہر دور میں مردم خیز رہا تھا۔ اس میں جذبۂ حریت کی کمی کسی زمانے میں پائی نہیں گئی اس نے اکثر مذہبی اور اصلاحی تحریکوں کو لبیک کہا چنانچہ ولی اللہی تحریک میں بھی اس کا ایک کردار ہے۔

"بارھویں صدی ہجری میں جب دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنی اصلاحی اور علمی تحریک شروع کی تو اس زمانے میں سندھ میں مخدوم ابوالقاسم نقشبندی، مخدوم محمد ہاشم، شاہ عبداللطیف بھٹائی، مخدوم محمد معین ٹھٹھوی اور خواجہ محمد زمان لواری والے جیسے علماء علم و عرفان کی شمع روشن کیے ہوئے تھے۔ جب شاہ ولی اللہ اور سندھ کے بزرگوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں تین جلیل القدر فضلاء کے نام ملتے ہیں کہ جن سے شاہ ولی اللہ کے براہ راست تعلقات تھے۔ ان میں پہلے شخص شیخ القراء قاری محمد فاضل سندھی ہیں جو فن قرأت میں شاہ ولی اللہ کے استاد ہیں ۱۱۵۴ھ میں شاہ صاحب نے ان سے استفادہ کیا، دوسرے مخدوم محمد معین سندھی ہیں جنہیں شاہ ولی اللہ نے حدیث کی اجازت مرحمت فرمائی تیسرے بزرگ محمد شریف بن حسین سندھی ہیں جنہوں نے شاہ صاحب سے خرقۂ خلافت حاصل کیا ہے۔[۴۶]

حاشیہ بر صفحہ آئندہ

شاہ ولی اللہ کی تحریک سے اُردو کو جو فائدہ پہنچا، وہ اظہر من الشمس ہے اور سندھ کی حد تک تو یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ محولہ اصحاب میں سے تقریباً ہر ایک اُردو کا شاعر تھا اور جو شاعر نہیں تھا، وہ زبان داں ضرور تھا۔

"پھر کچھ ایسے ہی حالات تھے کہ سید احمد شہید نعرۂ جہاد لے کر اٹھ کھڑے ہوئے ـــــ لیکن یہ تحریک بالاکوٹ کی ناقابلِ فراموش یادگار بن کر رہ گئی مگر یہ آگ جو اخلاص اور حمیتِ دین سے لگائی گئی تھی، بجھنے والی نہ تھی۔ گو چند دنوں کے لیے بظاہر دب سی گئی۔ پھر شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی نے نہایت رازداری سے "ریشمی رومال" کے نام پر یہ تحریک جاری رکھی اور شاہ ولی اللہ کے روحانی تعلق سے اس میں جان ڈال دی۔ مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم اسی تحریک کے خاص رکن تھے۔" [۶۶]

یہ تحریک بھی غیر محسوس طریقے پر سندھ سے اُردو کے رابطہ میں معین ہوئی۔ تحریکِ خلافت میں بھی سندھ نے برابر کا حصہ لیا ـــــ اور چونکہ ان تحریکوں کے پیچھے ان مسلم زعماء کا ہاتھ ہوتا تھا جو اُردو کے

۶۵؎ مسلمانانِ کراچی و سندھ کی تعلیم، از سید مصطفیٰ علی بریلوی صفحہ ۴۲ مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۶۸ء بحوالہ مضمون "پونے دو سو سال پہلے کا ہندوستان ایک سندھی کے قلم سے"، مطبوعہ ماہنامہ الرحیم حیدر آباد جون ۱۹۶۶ء

۶۶؎ مضمون مجھول بسری شخصیتیں، از مولوی بشیر احمد صدیقی مطبوعہ العلم سہ ماہی کراچی صفحہ ۸۴ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۷۱ء

پشت پناہ تھے لہٰذا سندھ میں اُردو کے اثرات کا بڑھ جانا ناگزیر تھا۔

"انگریزوں نے بلاشبہ سندھ کے تدریسی میدان کو پامال کر کے رکھ دیا تھا اور اوّل دن سے اہلِ سندھ کو سندھی کے بہانے انگریزی کی ڈگر پر لانے کی کوشش شروع کر دی تھی لیکن انہیں کامیابی نہیں ہوئی ۱۸۵۳ء میں حساب، تاریخ اور جغرافیہ کی جو کتابیں فارسی، اُردو، مرہٹی اور گجراتی سے سندھی میں ترجمہ ہو کر چھپی تھیں اور انگریزوں نے جو نئے اسکول قائم کیے تھے ان میں پڑھنے والے نہ ملتے تھے۔" [۶۹]

یہ تھا ردِّ عمل سندھیوں کو فارسی سے چھڑا دینے کا اس تعطّل کی معیاد اگرچہ زیادہ طویل نہ تھی مگر دو تین دہائیاں تو بیت ہی گئیں اور وہ وقت آ گیا کہ سرسید کی آوازِ بازگشت سندھ میں سنائی دینے لگی، جس سے اکابرِ قوم حرکت میں آئے اور انھوں نے بادلِ ناخواستہ تقاضائے وقت کے سامنے سر جھکا دیا۔ علمی ماحول کا جو حشر ہوا تھا اُس کے لیے ڈاکٹر سداگرانی کے الفاظ کافی ہوں گے۔

"اس صدی کے آغاز میں نئی سوشل سیاسی اور اقتصادی قوتوں کے بروئے کار آنے کے نتیجے میں مغرب کے اثرات اس علاقے پر چھا گئے جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ وہ پرانا علمی ماحول، جس میں متعدد بلند پایہ عالم پیدا ہوئے اور جو غیر مناسب فضا کے باوجود کسی نہ کسی طرح چل رہا تھا، سیلابِ فنا میں بہہ گیا۔ ۱۹۰۵ء میں فارسی میں ہفت روزہ اخبارات

---

۶۹ THE GAZETTEER OF W. PAKISTAN THE FORMER PROVINCE OF SIND PAGE 679 (1968)

کے بند ہونے، نیز صوبائی حکومت کی زبان (سندھی و انگریزی) تعلیمی زبان قرار پانے کے نتیجے میں فارسی کی قانونی حیثیت قرار پا گئی۔ بالآخر سندھ کے عالم بھی اس زبان کی طرف سے لاپرواہی برتنے لگے اور اس طرح سندھ کے اُس تابناک علمی دور کا خاتمہ ہوگیا جو فارسی زبان کی بدولت جاری تھا۔ ؎

انگریزوں کی لسانی پالیسی کے خلاف ہندوستان کے عام مسلمانوں میں جو تاثر پایا جاتا تھا، سندھ کے مسلمان اس کی ایک ارتقائی نظیر تھے جس کا ردعمل دردمندان قوم میں بڑی شدت کے ساتھ ہو رہا تھا لہٰذا سندھی اکابر کی طرف سے سرسید کی تحریک کا پُرجوش خیر مقدم کیا گیا، اور ۱۸۸۵ء میں سندھ مدرسۃ الاسلام کا قیام وجود میں آگیا۔ اس کا سہرا اگرچہ حسن علی آفندی کے سر بندھتا ہے لیکن اس میں کئی پُرجوش اور باعمل سندھی رہنما شامل تھے ــــــ ۱۹۰۱ء میں اسکی ایک شاخ لاڑکانہ میں پھر ایک شاخ منہار میں کھولی گئی۔

یہ مدرسہ بھی سندھ میں ایک روشن منارے کی حیثیت رکھتا ہے۔

ادھر ہندوستان میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا فعال دور بھی ہندوستان کے دوسرے حصوں کی طرح سندھ کو متاثر کر رہا تھا چنانچہ ۱۹۰۷ء میں اس کا اجلاس مولانا حالی کی زیر صدارت کراچی میں منعقد ہوا جس میں سندھ کی بڑی بڑی شخصیتیں شریک ہوئیں۔ علی گڑھ یونیورسٹی نے بھی سندھ کو کسی حد تک متاثر کیا ہے جس کا اجمالی جائزہ

؎ انگریزوں کی لسانی پالیسی از سید مصطفیٰ علی بریلوی صفحہ ۳، ۴ مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۷۰ء

ایک سندھی عالم نے لیا ہے۔

"جس زمانے میں حالی نے مسدس مدوجزر اسلام لکھا تو اس نے تمام مسلمانوں کے قلوب میں قومی محبت کی آگ بھڑکا دی یہاں تک کہ جب اس کا اثر سندھ تک پہنچا تو اس کے ردعمل ہوئے۔

پہلا ردعمل یہ تھا کہ مولانا اللہ بخش ابوجھو نے اس کے بڑے حصے کا نظم ہی میں ترجمہ کیا جس کا وہی نتیجہ نکلا، جو دوسرے صوبوں میں دیکھا گیا یعنی اس ترجمے نے مسلمانان سندھ کے قلوب گرما دیے اور ان میں ایک قومی ولولہ پیدا کر دیا۔

دوسرا ردعمل یہ تھا کہ اسی مسدس حالی کے خطوط پر اسی بحر میں مقامی تقاضوں کے مطابق اور بھی مسدس لکھے گئے اور دوسری قومی نظمیں بھی اسی مسدس حالی کا ردعمل تھا۔ اس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ اُردو زبان اور قومیت کا اثر سندھ کس شدت سے محسوس کرتا ہے اور اس کا عملاً نتیجہ ہمیشہ مفید قوم و ملت نکلا۔ نہ بھولنے والی باتوں میں ایک یہ حقیقت بھی ہے کہ کراچی میں جب سالانہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا انعقاد ہوا تو اس میں زیادہ تر تقریریں اُردو زبان ہی میں ہوئیں اور اس میں فرزندان سندھ کا اچھا خاصا حصّہ تھا۔ اسی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سندھ مدرسۃ الاسلام کی بنیاد مضبوط ہوئی اور مولانا اللہ بخش ابوجھو، رئیس شمس الدین بلبل، حکیم فتح محمد سیوہانی اور مرزا قلیچ بیگ وغیرہ بزرگوں نے سندھی زبان میں نظموں کے دریا بہا دیے یہ پوری تحریک اُردو زبان ہی کا نتیجہ تھی اس لیے انکار کرنے

کی کہ ان کے بقول وجہ نہیں ہے کہ آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کی زبان اُردو تھی۔"

"۱۹۲۵ء میں جب میں سندھ میں رہ پڑا تو اُردو زبان کی تحریک کا اثر سندھ میں نمایاں طور پر پایا جاتا تھا۔ چنانچہ بزرگانِ سندھ نے متحد و متفق ہو کر انجمن ترقی اُردو کی بنیاد ڈالی۔ یہ خاکسار بھی ان اراکین میں سے ایک ہے۔"[1]

پھر انہوں نے ایک حقیقت کو اور واضح کیا ہے۔

"اگر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے افادات میں سے ایک نکتہ بیان نہ کروں تو حقیقت پوشی کا مجرم کہا جا سکتا ہوں۔ سندھ کے خوش حال طبقہ کے مسلمان اپنی ہونہار نسل کو اعلیٰ تعلیم کے لیے ایم اے او کالج علی گڑھ اور اس کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھیجا کرتے تھے چنانچہ ایسے طالب علموں میں سے مرحوم نور محمد بانی نور محمد ہائی اسکول تھے۔ علی گڑھ کی قوم دوستی اور اُردو ادب کے شدید اثر ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ مرحوم نے ہندوؤں کے خوشحال طبقے کے مقابلے میں، جہاں ان کے بہت سے ہائی اسکول اور کالج تھے، نور محمد ہائی اسکول کی بنیاد ڈالی۔ راقم الحروف بھی اس کے بنیادی اراکین میں سے ہے۔"

آج یہ سلسلۂ کلام غیر مربوط معلوم ہوگا کہ مدرسہ کو، جو ایک تعلیمی

---

[1] مضمون "قومی زبان کے متعلق بعض حقائق" از ڈاکٹر محمد ابراہیم خلیل صفحہ ۳۰ مطبوعہ ادبی رشتے، لسانی رابطے، مرتبہ اختر انصاری اکبرآبادی مطبوعہ مجلس ادب حیدرآباد ۱۹۷۰ء

سلسلے کی چیز ہے، اُردو زبان سے کیا تعلق مگر اس زمانے
کے بزرگ اس مدرسے اور اُردو کا تعلق وہی سمجھتے ہیں جو
ناخن اور گوشت کا ہے ــــ اس کوشش کا تعلق نور محمد ہائی
اسکول کے قیام سے وہی تھا جو چراغ اور روشنی میں ہے۔[۴۲]

علامہ آئی آئی قاضی سندھ کی ایک عظیم تعلیمی شخصیت تھے۔
انھوں نے سندھ میں اُردو کی حیثیت متعین کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"جو شخص اسے (اُردو کو) اجنبی سمجھتا ہے اور بیسویں صدی
میں رہتے ہوئے مہابھارت کی زبان بولنا چاہتا ہے اور ان
الفاظ میں اضافہ کو گوارا نہیں کرتا جو ماضی قدیم میں اس زبان
میں رائج تھے، اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں، وہ ایک
تنگ نظر اور غیر روادار ذہن رکھتا ہے اور اس کے نزدیک
قومیت اور بین الاقوامیت دونوں بے معنی ہیں بلکہ میں یہاں
تک کہوں گا کہ وہ روشنی سے نفرت کرتا ہے اور اُلو کی طرح
سورج سے بچتا ہے۔"[۴۳]

سندھی زعماء کی یہ تحریریں مجموعی طور پر سندھ پر اُردو کے اثرات

---

[۴۲] مضمون "قومی زبان کے متعلق بعض حقائق" از ڈاکٹر محمد ابراہیم خلیل صفحہ ۶۵ مطبوعہ "ادبی رشتے، لسانی رابطے" مرتبہ اختر انصاری اکبر آبادی مطبوعہ مجلس ادب حیدرآباد ۱۹۷۱ء

[۴۳] خطبہ صدارت علامہ آئی آئی قاضی، یوم اردو منعقدہ خالق دینا ہال کراچی مورخہ ۱۵ دسمبر ۱۹۳۸ء مترجمہ الیاس عشقی۔ "ادبی رشتے، لسانی رابطے" صفحہ۔ ا مرتبہ اختر انصاری اکبر آبادی مطبوعہ مجلس ادب حیدرآباد ۱۹۷۱ء

کی ترجمانی میں لیکن حقیقتاً موضوعِ بحث یہ ہے کہ انگریزوں کی لسانی ریشہ
دوانی کا انجام اُردو کے سلسلے میں کیا ہوا ہے؟ اس کا جائزہ فارسی کے
دوش بدوش لیا جائے تو نتیجہ بہر صورت یہی نکلے گا کہ فارسی کو اگرچہ مکمل
دیس نکالا مل چکا تھا لیکن اہلِ سندھ نے اس کو بمشکل قبول کیا اور برسوں کے
فصل سے جب تعلیمی بیداری کا ایک دور پھر شروع ہوا تو اُردو کی جڑیں
سندھ میں پہلے سے زائد مضبوط ہو چکی تھیں اور اس کے عوامل میں مذہبی اور
قومی تحریکوں کی کارفرمائی تھی۔

اب سندھ صوبۂ بمبئی کا ایک حصہ تھا اور اس میں تعلیمی جمود کو توڑنے
کے لیے انگریزی اسکولوں اور کالجوں کی تعداد بڑھ رہی تھی، پرانے ڈھب
کے مدرسے جو بند ہو چکے تھے، انہیں از سرِ نو قائم کرنے کی کوششیں جاری
تھیں اور مشرقی علوم کے بعض نئے مدرسے بھی کھل رہے تھے۔ کراچی کے
مظہر العلوم اور احیاء الاسلام اسی طرز کے مدرسے ہیں۔

اُردو نصابی سطح پر کسی شمار قطار میں نہ تھی لیکن "اُردو فارسی کا
چولی دامن کا ساتھ ہے اسی واسطے قیامِ پاکستان سے قبل اُردو
اسکولوں کے اجراء اور ترقی میں سندھی مسلمان غیر مسلموں سے
برابر ٹکر لیتے رہتے تھے جس کے شاہد کراچی کے سیکڑوں پرائمری
اسکولوں کے اساتذہ ابھی تک زندہ و سلامت ہیں۔"[۴۳]

غیر مسلم حقیقتاً سندھ میں اُردو کو برداشت کرنے پر تیار نہ تھے اس کا
سبب شاید یہ ہو کہ مسلمانانِ ہند کی جتنی تحریکیں تھیں، ان سب میں اُردو کو
دخل تھا اور انہیں کے نتیجے میں سندھ کے مسلمان کچھ بیدار ہوئے تھے مگر

---

۴۳ مسلمانانِ کراچی و سندھ کی تعلیم از سید مصطفیٰ علی بریلوی صفحہ ۹ مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل
کانفرنس کراچی ۱۹۶۸ء

ہندوؤں کی کچھ نہ چلی۔

"مسلمانانِ بمبئی اور سندھ کی پیہم چیخ و پکار کے بعد ۱۹۱۸ء میں گورنمنٹ نے اُردو پرائمری اسکولوں کے واسطے اسپیشل اسٹینڈرڈ مقرر کیا۔ پہلے قسم کے اسکولوں میں مسلمان طلباء کا ذریعہ تعلیم عموماً اُردو ہوتا تھا، اور وہ کوئی ایک مقامی زبان بھی حاصل کرتے تھے۔ دوسرے طرز کے اسکولوں میں ایک مقامی زبان ذریعہ تعلیم اور اُردو کو دوسری زبان کی حیثیت حاصل ہوتی تھی۔

صوبہ سندھ اور کراچی میں اُردو دوستی کا جذبہ اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ تعجب ہوتا ہے۔ صوبۂ بمبئی کے "اُردو آمیز" اور خالص اُردو اسکولوں کی مشترکہ تعداد ۸۰۴ تھی جن میں سے ۵۰۵ اسکولوں نے اُردو کو اولیت کا درجہ دیا۔ ۲۹۵ اسکولوں نے اُردو کو دیگر زبان کی حیثیت سے قائم رکھا۔" [۵]

اس کوشش میں لگ بھگ پوری مسلم قوم ہم آواز تھی اور
"مسلمانوں کی بعض جماعتوں نے حکومتی پالیسیوں سے قطع نظر کرکے تعلیمی میدان میں جدوجہد کی۔ اوکھائی میمن جماعت کی تعلیمی سرگرمیاں ۱۹۱۰ء میں شروع ہو گئی تھیں اس طرح طیب علی علوی مرحوم نے اپنی تعلیمی مساعی کے نتیجہ میں جو حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کیں، اس کا ہلکا سا اندازہ مورس والا گرلز ہائی اسکول، شیخ جیون جی ابراہیم جی گرلز پرائمری

---

[۵] مسلمانانِ کراچی و سندھ کی تعلیم از سید مصطفیٰ علی بریلوی صفحہ ۱۲، مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۶۰ء

اسکول کی شکل میں ہمارے سامنے ہے "[76]

"طیب علی علوی کراچی میونسپل کارپوریشن اسکول بورڈ کے چیئرمین کی حیثیت سے اردو اسکول کھولنے کے واسطے اکثر اپنی حدود سے تجاوز کر جاتے تھے۔" [77]

"اگرچہ وہ گجراتی تھے لیکن وہ اُردو کو مسلمانان ہند کی یک جہتی کا نشان سمجھتے تھے۔" [78]

ان حقائق سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ بیسویں صدی شروع ہونے سے قبل یا کچھ بعد سندھ کے اسکولوں میں اُردو کو جگہ مل گئی تھی اور محکمۂ تعلیمات نے جو انتظام کیا تھا اس کے تحت

"۱۹۰۶-۷ء میں ہر ڈویژنل انسپکٹر کے تحت ایک ڈپٹی ایجوکیشنل انسپکٹر تعینات تھا اور ہر ضلع کے واسطے ڈپٹی ایجوکیشنل انسپکٹر کے تحت تین اسسٹنٹ ڈپٹی انسپکٹر مقرر کیے جاتے تھے۔ ان میں سے ایک سب ڈپٹی انسپکٹر عام طور پر مسلمان ہوتا تھا۔ یہ مسلمان سب انسپکٹر تعلیمات بھی محض اُردو اسکولوں کی دیکھ بھال کے واسطے مخصوص تھا۔" [79]

---

[76] مسلمانان کراچی و سندھ کی تعلیم از سید مصطفیٰ علی بریلوی صفحہ ۱۱۹ مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۶۰ء

[77] مسلمانان کراچی و سندھ کی تعلیم از سید مصطفیٰ علی بریلوی صفحہ ۱۰ مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۶۸ء

[78] مسلمانان کراچی و سندھ کی تعلیم از سید مصطفیٰ علی بریلوی صفحہ ۱۱ مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۶۸ء

[79] مسلمانان کراچی و سندھ کی تعلیم از سید مصطفیٰ علی بریلوی صفحہ ۱۲۹ مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۶۰ء

تعلیم کا یہ دور ۱۹۳۶ء تک چلتا رہا۔ پھر سندھ کو صوبہ بمبئی سے
الگ کر کے ایک علیحدہ صوبہ بنا دیا گیا جو سر شاہ نواز بھٹو اور
دوسرے اکابر سندھ کا کارنامہ ہے۔ اس کے بعد ۱۹۳۷ء
سے مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ عمل میں آگئی اور مسلمانوں کی جداگانہ
جدوجہد آزادی شروع ہو گئی اس وقت انجمن ترقی اردو کے
محاسبہ کی رُو سے کراچی کے اسکولوں میں اُردو کے طلبہ کی تعداد
لگ بھگ دس ہزار تھی "۔ ؎۸۰

تحریک آزادی اور حصول پاکستان میں اُردو کا کردار کسی ثبوت کا
محتاج نہیں۔ ڈاکٹر محمد ابراہیم خلیل اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"جب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے جتھے پاکستان کے پروپیگنڈے
کے لیے ہندوستان کے تمام صوبوں میں پھیل گئے تو یہ کیسے
ممکن تھا کہ صوبہ سندھ ان برکتوں سے مستثنیٰ رہتا۔
مسلم طلباء اور بڑے بڑے مسلم زعماء حیدر آباد، کراچی، سکھر
اور سندھ کے مشہور شہروں میں پہنچے اور بڑے بڑے سیاسی
جلسے منعقد کیے تو کون نہیں جانتا کہ ان میں جتنی تقریریں ہوتی
تھیں، سب اُردو زبان میں ہوتی تھیں اور جتنی ولولہ انگیز
نظمیں پڑھی جاتی تھیں وہ سب اُردو زبان میں ہوتی تھیں۔
اور مقررین اور نظم پڑھنے والوں میں بہت سے مقامی
لوگ ہوتے تھے جو اُردو کو ہی اپنے اظہارِ خیال کا ذریعہ بناتے
تھے۔ بہت سے جوشیلے سندھی نوجوان ایسے بھی تھے جو اُردو کی

؎۸۰ پچیس سالہ روداد انجمن ترقی اردو کراچی صفحہ ۲ مرتبہ افسر صدیقی ۱۹۴۰ء

نظمیں پلیٹ فارم پر خوش الحانی سے پڑھتے تھے اور دلوں
میں پاکستان کے تصور اور جوش اسلام کو بھڑکاتے تھے۔
یہ اُردو زبان کے متعلق میرا عام مشاہدہ اور تجربہ ہے میں
اس سلسلے میں مزید عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اُردو اخبارات
اور رسائل کی وجہ سے ۱۹۴۶ء کا انتخاب مسلم لیگ نے جیتا،
اور پاکستان کی کامیابی کی بنیاد پڑی "۔ ۱۸؎

ان حالات کا اثر بھی اُردو کی ترویج پر پڑا اور شہروں کے ساتھ ساتھ
مضافاتی آبادیوں میں بھی اُردو چھوٹی بڑی درس گاہوں کی ایک تعلیمی زبان
بن گئی جس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ پاکستان بننے کے
وقت پڑھے لکھے سندھیوں میں دو تہائی سے زائد افراد اردو دان تھے
اور ان پڑھ لوگوں میں صدفی صد افراد اُردو سمجھ سکتے تھے۔

پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد عام تعلیمی مراکز نے بھی دینی
مدارس کے دوش بدوش اُردو کی ترویج میں حصہ لیا جن میں بڑے
شہروں کے ساتھ چھوٹے مقامات کی درس گاہیں بھی شامل ہیں اور سندھ
یونیورسٹی نے تو واقعی بڑا اہم کردار ادا کیا۔

اس کا سنگِ بنیاد ۲ اپریل ۱۹۴۷ء کو کراچی میں رکھا گیا تھا اور
اے بی حلیم اس کے پہلے وائس چانسلر ہوئے تھے لیکن اس کا فعال دور
اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب ۱۹۵۱ء میں وہ حیدرآباد منتقل
ہوئی۔ اُردو کا شعبہ اس یونیورسٹی میں ۱۹۵۲ء ہی میں قائم ہو گیا تھا
لیکن اس میں جان ۱۹۵۶ء میں پڑی، جبکہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں شعبہ

۱۸؎ قومی زبان کے متعلق بعض حقائق - مضمون ڈاکٹر ابراہیم خلیل، ادبی رابطے، لسانی رشتے
صفحہ ۴۴، مطبوعہ مجلس ادب حیدرآباد ۱۹۸۳ء

اُردو کے سربراہ ہو کر پہنچے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی زیر نگرانی
پی۔ ایچ۔ ڈی اور ایم۔ اے کے لیے جو مقالے لکھے گئے ان کی گنتی
کی جائے تو تعداد سیکڑوں تک پہنچے گی اور ان میں سے بیشتر وہ ہیں جن
کے موضوع کا تعلق صوبہ سندھ کی اُردو خدمات اور اُردو سندھی کے
باہم رشتوں سے ہے۔

سندھ میں اُردو کے علمی و ادبی ذخائر و رسائل

صحافت اور پریس

شعر و شاعری اور اُردو نثر نگاری کی طرح سندھ میں اُردو صحافت کا آغاز بھی ہندوستان سے کم و بیش نصف صدی بعد ہو سکا۔ اس کی وجہ بھی تعلیم کی بدحالی تھی۔

انگریزوں کے ابتدائی دور میں ہر طرف ایک یاس و ہراس کا عالم تھا ایسے میں اہل سندھ سے نہ کسی ادبی کاوش کی توقع ہو سکتی اور نہ سیاسی شعور کی جس کو محسوس کر کے انگریزوں نے اپنے مقاصد کی خاطر ۱۸۵۴ء میں ایک انگریزی اخبار موسومہ سندھین کا اجراء کرایا۔ جس کا ایڈیٹر ایک انگریز مسٹر ای ڈبلیو اسٹرینج تھا؎ یہ اخبار کس پریس میں چھپتا تھا؟ اس کے متعلق تحقیق سے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ قرینہ کہتا ہے کہ گورنمنٹ پرنٹنگ پریس کراچی میں چھپتا ہو گا کیونکہ ۱۸۸۳ء کی کراچی گائڈ میں جن قدیم پریسوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان میں گورنمنٹ پرنٹنگ پریس کمشنر آفس کراچی، سندھ گورنمنٹ کمرشیل پرنٹنگ پریس بندر روڈ کراچی، مرکنٹائل پریس الفنسٹن

؎ مضمون "سندھی لیتھوگرافی" از مولانا غلام محمد گرامی مشمولہ سندھی ادب نمبر "نئی قدریں" حیدرآباد صفحہ ۱۹ مطبوعہ ۱۹۷۳ء

روڈ کراچی، نوکس پریس کیمبل روڈ کراچی، ہوکٹھڈیہ پریس الفنسٹن روڈ کراچی اور آرین ورناکیولر پریس کیمبل روڈ کراچی شامل ہیں۔

لیکن ڈاکٹر عبدالمجید میمن اس خیال سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کی تحقیق ہے کہ سندھ کا پہلا انگریزی اخبار ہفتہ وار سندھ ایڈورٹائزر ہے جو ۱۸۴۵ء میں کراچی کے پہلے پرنٹنگ پریس سے چھپنا شروع ہوا تھا[1]۔

ان مختلف بیانات سے یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ انگریزوں نے استقرار حکومت کے چوتھے سال پہلا انگریزی ہفتہ وار سندھ ایڈورٹائزر نکالا پھر دس سال بعد ۱۸۵۴ء میں باقاعدہ اخبار سندھین کا اجرا کیا۔

سب سے پہلا فارسی اخبار مفرح القلوب ہے جس کو مرزا مخلص علی نے ۱۸۵۵ء میں جاری کیا جو اسی نام کے پریس یعنی مفرح القلوب لیتھو پریس کراچی میں چھپتا تھا۔ اس سے مولانا غلام محمد گرامی اور ڈاکٹر عبدالمجید میمن دونوں متفق ہیں لیکن اس اخبار میں کبھی کبھی اُردو اشعار کا شائع ہونا صرف ڈاکٹر میمن کی تحقیق ہے۔ یہ اخبار ہر اتوار کو چھپتا تھا اور ۱۹۰۴ء تک چھپتا رہا۔

سندھی کا پہلا اخبار مطلع خورشید تھا جس کو مرزا مخلص علی نے ۱۸۶۰ء میں سکھر سے نکالا تھا اور مطلع خورشید ہی نام کا ایک لیتھو پریس قائم کیا تھا جو سکھر کا پہلا پریس تھا۔ چونکہ اب تک فارسی کی برتری سندھ میں برقرار تھی اس لیے اس اخبار میں ایک کالم فارسی میں ہوتا اور دوسرے کالم میں اس کا سندھی ترجمہ چھاپا جاتا تھا۔

اس کے بعد کراچی سے ایک فارسی اخبار اکلیل نام کا جاری ہوا جو اکلیل پریس بندر روڈ میں طبع ہوتا تھا اور پیر کو شائع ہوتا تھا جس کو مرزا مخلص کے بیٹے مرزا احمد صادق نے نکالا تھا۔ سن اجراء ۱۸۷۰ء ہے۔ اسی

---

[1] خط ڈاکٹر عبدالمجید میمن بنام مصنف مورخہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۷۶ء۔

زمانے میں سندھی کے ایک اخبار معین الاسلام کے کراچی سے جاری ہونے کا پتہ چلتا ہے جو ہر جمعہ کو چھپتا تھا۔ اس کو بھی مرزا محمد صادق بی نے ۱۸۸۰ء سے شائع کرنا شروع کیا تھا۔ ۳ہ

۱۸۸۲ء کی کراچی گائڈ چند اخبارات کی نشاندہی اور کرتی ہے جن کے نام ہیں ۔ (۱) سندھ گزٹ انگریزی (۲) سندھ ٹائمز انگریزی (۳) سندھ سدھی سندھی (۴) پرجامتر گجراتی ۔ ان اخبارات کے نمبر (۱) ہفتے میں دوبار منگل اور جمعہ کی شام کو، نمبر (۲) جمعرات اور سنیچر کی شام، نمبر (۳) اور نمبر (۴) ہر سنیچر کو چھپتے تھے۔ ۴ہ

۱۸۸۳ء کی کراچی گائڈ میں ایک اُردو اخبار "دوربین" کا بھی تذکرہ ہے جس کو مرزا مخلص علی کے چھوٹے بیٹے مرزا محمد جعفر نکالتے تھے۔ اس کا سن اجراء معلوم نہ ہو سکا۔ تیاساً کہا جا سکتا ہے کہ یہ بھی اسی زمانے میں نکلا ہوگا اور مرزا مخلص علی کے کسی پریس میں چھپتا ہوگا۔ "دوربین" کو سندھ میں اُردو کا پہلا اخبار کہا جا سکتا ہے۔ ۵ہ

اسی سلسلے میں سندھی کے ایک نئے رسالے سرسوتی کا سراغ ملتا ہے جو ہندو پرچار کے لیے جاری ہوا تھا۔ بات یہ ہے کہ انگریزوں کی پالیسی ہندوستان میں شروع ہی سے یہ رہی تھی کہ ہندوؤں کو آگے بڑھا کر مسلمانوں کو پیچھے دھکیل دیا جائے۔ سرسید کی تحریک اسی پالیسی کے توڑ کے لیے وجود میں آئی تھی چنانچہ سندھ میں سرسید کے رفیق حسن علی آفندی نے ایک انجمن مجمع

۳ہ تا ۵ہ مضمون "سندھی لیتھوگراف" از غلام محمد گرامی مشمولہ سندھی ادب نمبر ۲ نئی تدریب حیدرآباد صفحہ ۱۹ مطبوعہ ۱۹۶۳ء بمضمون "سندھی صحافت میں تحریک آزادی" مشمولہ ماہ نو ستمبر ۱۹۶۹ء صفحہ ۱۷ مطبوعہ ادارہ مطبوعات پاکستان کراچی۔ "سندھ مدرسۃ الاسلام" از الطاف علی بریلوی مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۶۵ء۔

محمدی قائم کرلی تھی جس کا پہلا کارنامہ سندھ مدرستہ الاسلام تھا پھر اسی انجمن کی طرف سے ایک ہفت روزہ "معادن مجمع" جاری ہوا۔ کچھ وقفہ سے ایک اخبار "الحق" نکلا پھر "خیر خواہ" اور "مسافر" منظر عام پر آئے، سکھر اور لاڑکانہ سے دو اخبار نکلے۔[6]
ہندوؤں کے پریس کراچی، شکارپور اور حیدرآباد میں موجود تھے جو عموماً عوامی اور ادبی کام کرتے تھے مگر اب ان کا انداز اور رجحان سیاسی ہوگیا تھا لہٰذا ہر مقام کے مسلمانوں کے لیے پریس قائم کرنا وقت کی ناگزیر ضرورت بن گیا۔

یہ زمانہ سندھ کے مسلمانوں کے لیے بہت صبر آزما تھا۔ ان پر ہندوؤں اور عیسائیوں دونوں کی یلغار تھی جس کو محسوس کر کے سیٹھ حاجی احمد نے فریر روڈ سکھر پر ایک پریس قائم کیا اور ۱۸۹۵ء میں سندھی روزنامہ آفتاب سندھ کا اجراء کیا۔[7]
اس اخبار کے ایڈیٹر مولوی شمس الدین بلبل تھے جنہوں نے بعد میں الحق کی ادارت بھی کی۔ سندھ کے یہ اخبار سندھی میں تھے اور سیاسی مقاصد کے لیے نکالے گئے تھے لیکن ان میں اُردو کی نظمیں اور سیاسی چیزیں بھی چھپ جاتی تھیں چنانچہ شمس الدین بلبل کے ایڈیٹر الحق ہونے پر حکیم فتح محمد سیوہانی نے ایک قطعہ تاریخ کہا تھا۔

شمس الدین بلبل جو ہے شیریں مقال — سندھ میں شاعر ہے عالی مرتبہ
ہے ایڈیٹر "آفتاب سندھ" کا — جلوہ گر جس کا سخن ہے ہمچو مہ
پرچۂ "الحق" ہوا ہے اور بھی — حضرت بلبل کے اب زیر نگہ
کردو یوں سال تقرر اے صغیر — "روشن الحق آفتاب دیں سے وہ"[8]

اُردو نظم کی یہ روش سندھی کے اخبارات کے لیے عام تھی۔ نظمیں عموماً اور مضامین شاذ چھپتے رہتے تھے۔ اس اصول میں کوئی استثناء نہ تھا۔ ہر مقام کے سندھی اخبار

---

[6] سندھ مدرستہ الاسلام از الطاف علی بریلوی ۱۹۵۵ء
[7] خط شیخ عبدالرزاق راز بنام مصنفہ مورخہ ۲۸ ستمبر ۱۹۶۷ء۔
[8] مضمون سکھر کا ایک قدیم اخبار از مولوی رحمت اللہ فرخ آبادی مشمولہ ماہنامہ "سرحد" کراچی صفحہ ۹ شمارہ مئی ۱۹۶۳ء۔

اپنے دامن میں اُردو کو جگہ دے دیتے تھے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں سندھی صحافت میں یکایک جان پڑ گئی۔ علیحدہ صوبے کی تحریک میں کئی انگریزی اور سندھی ہفتہ وار، روزنامے، ماہنامے اور پندرہ روزے نکلے۔ اسی صدی کی چوتھی دہائی سے مسلمانوں کی جدوجہد آزادی شروع ہوئی اور مسلمانوں کو ہندوؤں کے جواب میں اخبارات نکالنے کی ضرورت پیش آئی تو سندھی کے ساتھ اُردو اخبار بھی جاری ہوئے جن میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا اور پاکستان بننے کے بعد سے تو یہ صورت ہو گئی ہے کہ سندھ کا کوئی شہر ایسا نہیں ہے جہاں سے اُردو کا کوئی نہ کوئی ادبی یا سیاسی ترجمان نہ نکلتا ہو۔

اُردو اخبارات کا اجراء ایک مختص دور میں یقیناً سیاسی ضروریات کا تقاضا تھا لیکن اس سے قبل کی حیثیت خالصتاً سماجی اور ادبی تھی جس کا احساس سب سے پہلے کراچی کے مرکزی شہر میں کیا گیا۔ ابتداء ہفتہ وار اخبار سے ہوئی پھر ماہنامے اور روزنامے نکلے۔ تقسیم ملک سے قبل کے جرائد کی گنتی کی جائے تو تعداد دہائیوں میں ہو گی۔ اندازے کے لیے ان اخبارات و رسائل کی فہرست پیش کی جارہی ہے جو بیسویں صدی کے اوائل سے پاکستان بننے تک کراچی سے شائع ہوئے۔ ان کے علاوہ بھی بعض جرید ے ایسے ہوں گے جو کسی مختصر مدت کے لیے جاری ہوئے اور جن کا سراغ حالیہ تحقیق تک لگایا نہ جاسکا۔

ہفتہ وار

"ملت" کہنہ مشق ادیب اور شاعر منشی مولا بخش ہمدم کی زیر ادارت شائع ہوا۔ بیسویں صدی میں کراچی کا پہلا اخبار یہی ہے اس کی پالیسی خالصتاً قومی اور مسلم مفاد کی ترجمانی تھی۔

"جمہور"۔ یہ اخبار حافظ نصیر احمد کی ادارت میں نکلتا تھا، کانگریس کا ترجمان تھا۔ اس میں خالص سیاسی مضامین چھپتے تھے جو عموماً علیحدہ مسلم ریاست

کے خلاف ہوتے۔

"ذوالفقار"۔ جمہور کے بالکل متضاد پالیسی رکھتا۔ اس کے مدیر سید ہادی حسن تھے جو مسلم لیگ کے حامی تھے اور من حیث القوم مسلمانوں کے حقوق حاصل کرنے کی تائید کرتے۔

"بلوچستان جدید"۔ نسیم تلوی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا عموماً بلوچستان کے حالات شائع کرتا تھا، سیاسی پرچہ تھا مگر علاقائی سیاست تک محدود رہنے کی کوشش کرتا۔

"البیان"۔ مولانا حسن بن کاظم فلک کی زیر ادارت شائع ہوتا، سندھ میں شیعوں کا ترجمان تھا لیکن عام مسلم مفاد کی وکالت بھی کرتا تھا۔

"تعلیم"۔ لٹریسی تحریک کراچی کا ترجمان تھا۔ عموماً تعلیمی مسائل پر بحث کرتا۔ اس کا مقصد سندھ میں تعلیم کا فروغ تھا۔

"مجاہد"۔ اس کے ایڈیٹر اور مالک مولوی محمد شفیع تھے۔ پالیسی اس کے نام سے ظاہر ہے۔ مسلمانوں کے لیے سندھی اور اُردو دونوں میں حریت آمیز مضامین شائع کرتا تھا۔ یہ اخبار کسی جماعت یا طبقہ کا ترجمان نہ تھا، اپنی آزادانہ پالیسی رکھتا تھا۔

"رہبر سندھ"۔ احمد صدیقی سونڈوی اس کے ایڈیٹر تھے۔ مسلم مفاد کی آزادانہ ترجمانی اخبار کی پالیسی تھی۔ ایک ہی پرچے میں اُردو اور سندھی دونوں زبانوں کے مضامین شامل ہوتے۔

"عصر جدید"۔ ایک سیاسی اخبار تھا جس کے ایڈیٹر عبدالغنی تھے، مسلم مفاد کا حامی تھا مگر پالیسی بین بین رکھتا۔

"پریم"۔ حکیم سین سرشار کی زیر ادارت نکلتا تھا۔ اس کا رجحان سیاست سے زائد ادب کی طرف تھا، زیادہ دن چل نہ سکا۔

ان کے علاوہ دو ہفت روزہ اخبارات "نصرت" اور "البلوچ" کا سراغ

بھی لگا ہے مگر یہ زیادہ عرصہ چل نہ سکے۔ [۱۰]

روزنامے

۲۹-۱۹۲۸ء "حیات"۔ یہ اخبار حاجی نذیر الدین کی ملکیت تھا۔ مشہور ادیب و شاعر احمد الدین انجم اس کے مدیر تھے۔ اس کی پالیسی مسلم لیگ کی حمایت اور مسلم مفاد کی ترجمانی تھی۔

۲۹-۱۹۲۸ء "نظام"۔ سید غلام نبی اوجھ کی ادارت میں شائع ہوتا۔ اخبار و مدیر دونوں کراچی میں معروف تھے اور مسلم لیگ اور خاکسار تحریک کے حامی تھے مقصد مسلم مفاد کا تحفظ تھا۔

"مشرق" ۱۹۳۹ء میں حمید جیسلمیری کے زیر ادارت نکلا تھا مگر چھ ماہ سے زیادہ چل نہ سکا۔ [۱۱]

ماہنامہ

"پیام زندگی" مولا بخش ہمدم کی ادارت میں شائع ہوا، خالص ادبی پرچہ تھا زیادہ دن جاری نہ رہ سکا۔

"میزان الافکار" بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں کراچی سے نکلا تھا۔ اس

۹؎ پچیس سالہ رپورٹ انجمن ترقی اردو کراچی مرتبہ افسر صدیقی صفحہ ۱۲۔ ۱۹۴۰ء۔

۱۰؎ خط ڈاکٹر عبدالمجید میمن بنام مصنفہ، مورخہ ۹۔ اکتوبر ۱۹۷۶ء۔

۱۱؎ پچیس سالہ رپورٹ انجمن ترقی اُردو کراچی مرتبہ افسر صدیقی مطبوعہ ۱۹۴۰ء۔

کے ایڈیٹر تھے غلام حسین فروغ۔ رسالہ معیاری تھا مگر زیادہ دن چل نہ سکا۔

"تنویر" یہ رسالہ ستمبر ۱۹۳۴ء میں جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر حمید جیسلمیری تھے۔ یہ ایک ادبی اور معیاری رسالہ تھا۔ اس نے بہت سے نمبر شائع کیے جو اس زمانے کے لحاظ سے کافی وقیع اور اہم تھے۔

"شعاعِ اُردو" غالباً ۴۵ء یا ۴۶ء میں زیرِ ادارت ڈاکٹر کاروانی جاری ہوا مگر زیادہ دنوں چل نہ سکا۔

سندھ کے وسیع علاقے کو دیکھتے ہوئے رسائل و جرائد کی یہ فہرست یقیناً دل خوش کن نہ ہوگی مگر اس حقیقت کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ اُردو کی حیثیت حیدرآباد، شکارپور اور سکھر وغیرہ شہروں کی طرح کراچی میں بھی ثانوی تھی اور سندھ تعلیمی لحاظ سے بھی ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے پیچھے تھا لہٰذا سندھی کے مقابلے میں اُردو کا جو اشاعتی تناسب پایا جاتا ہے وہ نہ صرف غنیمت ہے بلکہ تحیر خیز ہے اور تقسیم ملک کے بعد اُردو جس تیزی کے ساتھ آگے بڑھتی ہے اس کی نظیر کسی دوسرے علاقے میں نہیں ملتی۔ کراچی کو چھوڑ کر سندھ کے ہر شہر میں اُردو کے ادبی پرچم لہرائے گئے اور تقریر و تحریر کے میدانوں میں قومی زبان کا بول بالا کیا گیا۔[۱۲]

عوامی اجتماعات اور مشاعرے

اُردو زبان کی نشر و اشاعت کی تاریخ غیر محسوس طریقے پر اس کے وجود میں آنے کے لمحۂ اوّلین سے شروع ہوتی ہے۔ ہندوستان کے دوسرے حصّوں کی طرح سندھ میں بھی خود بخود اس کی ابتداء ہوئی پھر دلّی اور دوسرے حصّوں سے

۱۲؎ پچیس سالہ رپورٹ انجمن ترقی اُردو کراچی مرتبہ افسر صدیقی مطبوعہ ۱۹۴۰ء۔

سلسلۂ آمدورفت رابطہ کا ذریعہ بنا۔ ہندی شعر زبانوں پر جاری ہونے کے بعد کانوں میں پڑے اور ایک نے دوسرے کو سنائے۔ اس طرح وہ دور آگیا جب اس زبان میں باقاعدہ شاعری کی جانے لگی۔

اب رڈسا کی محافل، خانقاہوں اور مراکز تبلیغ کی نشستیں اُردو اشعار کی اشاعت کا ذریعہ تھیں، دلّی، لکھنؤ اور دوسرے مقامات کی طرح عوامی مشاعروں کا رواج سندھ میں نہ تھا البتہ امراء کے گھروں پر چھوٹے چھوٹے اجتماعات ہوتے تھے جن میں عموماً فارسی اشعار سنائے جاتے تھے نشستوں کے اختتام پر کبھی کبھی ریختہ شعر خوانی بھی ہوجاتی تھی۔

باقاعدہ مشاعروں کا آغاز انیسویں صدی عیسوی کی ساتویں دہائی سے ہوا اور میر عبدالحسین سانگی نے اس کی داغ بیل ڈالی۔ یہ مشاعرے سندھی کے تھے جن کی دیکھا دیکھی اُردو میں بھی کبھی کبھار چھوٹے چھوٹے مشاعروں کا سراغ لگتا ہے۔ میر عبدالحسین سانگی خود بھی اُردو کے شاعر تھے لہٰذا اکثر اجتماعات میں وہ اُردو شعراء کو پڑھنے کا موقع دے دیتے تھے۔ یہ شاید کلکتہ کی پرورش کا اثر تھا یا ممکن ہے دلّی اور لکھنؤ کی تقلید میں ایسا کیا جاتا ہو۔ بہرحال بیسویں صدی عیسوی شروع ہونے سے قبل سندھ میں اُردو مشاعروں کا رواج ہوچکا تھا اور کراچی حیدرآباد اور خیرپور وغیرہ اُردو شعرخوانی سے مانوس ہوچکے تھے۔

ہندوستان میں اُردو کا استقرار متحدہ قومی ضرورت کا تابع تھا۔ لیکن انگریزوں کی لسانی پالیسی نے کچھ ایسے حالات پیدا کردیے کہ اس کا جھکاؤ مسلمانوں کی طرف کچھ زیادہ ہوگیا جس کے نتیجے میں اُردو زبان نے مسلم سیاست میں ایک نمایاں کردار ادا کیا۔ سندھ بھی مسلم اکثریت کا علاقہ تھا لہٰذا بدیہی طور پر وہ بھی متاثر ہوا۔ خاص طور پر جب مسلمانوں نے تعلیمی میدان میں من حیث القوم اپنی جدوجہد شروع کی تو سندھ کی تعلیمی بدحالی نظرانداز نہ کی جاسکی۔ ۱۸۶۸ء میں جب سید امیر علی کراچی آئے تو مسلمانوں کی کم علمی سے بہت متاثر

ہوئے اور انہیں کی تحریک پر حسن علی آفندی نے کمر ہمت باندھ کر سندھ مدرسہ کی ابتداء کی۔[۱۳]

۱۸۸۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا پہلا اجلاس علی گڑھ میں منعقد ہوا تو سندھ کے نمائندے بھی اس میں شریک تھے۔ اس کے بعد سے اس علاقے کا کانفرنس سے باقاعدہ رابطہ قائم ہو گیا۔ سید امیر علی نے ۱۸۹۹ء کے کلکتہ کے اجلاس میں بھی سندھ کا ذکر کیا پھر ۱۹۰۲ء کے اجلاس میں باقاعدہ ریزولیشن پاس کیا گیا کہ سندھ کی تعلیم پر توجہ کی جائے۔ ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ اجلاس میں سردار محمد یعقوب خاں وزیر اعظم خیر پور نے سندھ کی تعلیمی رپورٹ پیش کی اور اگلے سال ۱۹۰۷ء میں کانفرنس کا اجلاس کراچی میں منعقد ہوا جس میں سندھ کے ہر گوشے کے آدمیوں نے شرکت کی۔ نمائندین سندھ میں شیخ صادق علی وزیر خیر پور، مرزا قلیچ بیگ، منشی شمس الدین سندھی، قاضی فضل اللہ ٹھٹھہ، سر غلام حسین، سیٹھ طیب بھائی کراچی، میر اللہ بخش اور حاجی عبداللہ وغیرہم نے نمایاں حصہ لیا۔ یہ اجلاس مولانا حالی کی صدارت میں ہوا تھا۔ اس کے چند سال بعد پھر کانفرنس کا ایک اجلاس خیر پور میں ہوا جس سے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور سندھ کا مستقل رابطہ اور بھی استوار ہو گیا۔ کانفرنس کی بنیادی زبان اُردو تھی اور اس میں بیشتر تقاریر اُردو ہی میں ہوتی تھیں لہٰذا اُردو براہِ راست سندھ پر اثر انداز ہو رہی تھی خود سندھ مدرسہ کے قیام اور اس کے بعد ۱۹۰۲ء میں حیدر آباد کے اقامتی مدرسے کے کھلنے سے اور سکھر اور شکار پور کے مدارس کی تجویز سے بالواسطہ اُردو کی اشاعت میں مدد ملی۔[۱۴]

---

[۱۳] سندھ مدرستہ الاسلام کراچی از الطاف علی بریلوی مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی، ۱۹۵۵ء۔

[۱۴] پچیس سالہ رپورٹ" انجمن ترقی اُردو کراچی مرتبہ افسر صدیقی، ۱۹۴۰ء۔

اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اہل سندھ کسی زمانے میں بھی اُردو سے ناواقف تھے، سندھ میں اُردو تو شروع ہی سے بولی اور سمجھی جاتی تھی اور انگریزی دور میں تو کراچی کی علمی زبان ہی اُردو ہو گئی تھی۔ لب تاریخ سندھ کے مولف نے ۱۹۰۰ء کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ سر ولیم میری ویدر کمشنر سندھ جب جانے لگے تو انہوں نے مولف کو جو ہدایتیں دی تھیں وہ اُردو میں تھیں۔

کراچی کے بارے میں اگر یہ کہہ دیا جائے کہ وہ بین الاقوامی شہر تھا تو اندرون سندھ حیدر آباد، شکار پور، خیر پور، سکھر، ہر مقام پر اُردو کتب منگوا کر پڑھی جاتی تھیں۔ اس کا سبب ممکن ہے یہ ہو جو جیرو مل صر چند اڈوانی نے "سندھی بولی جی تاریخ" میں ایک مقام پر لکھا ہے کہ سندھی کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی اور اس کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی تھی یا کچھ اور سبب ہو لیکن حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ اُردو بولنا موجب تفاخر سمجھا جاتا تھا جیسا کہ بعض عظیم سندھی شعراء کے خیالات سے اندازہ ہوتا ہے۔

"گدا فارسی اور اُردو میں شعر گوئی کو فضیلت کا نشان سمجھتے تھے" [۱۵] اور بعض دوسروں کے بھی کچھ ایسے ہی تاثرات تھے۔

ان حالات میں اُردو کتب اور کانفرنسیں اشاعت زبان میں بڑی معین ہوئیں اور ایسی ہر تحریک سے ایک مثبت پہلو برآمد ہوا حتیٰ کہ سکھر میں آل انڈیا شیعہ کانفرنس منعقد ہوئی اور اس کی صدارت میر علی نواز خاں ناز نے فرمائی تو اس کی اُردو تقریروں سے بھی خاصے اثرات مرتب ہوئے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان سب سے زائد اُردو کی اشاعت اُردو کے عوامی مشاعروں نے کی جو میر عبدالحسین سانگی کے عہد سے شروع ہو چکے تھے اور

۱۵؎ سندھ میں اُردو شاعری از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صفحہ ۳، مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۷۰ء۔

انیسویں صدی عیسوی ختم ہوتے ہوتے اہل سندھ میں قبول عام حاصل کر چکے تھے۔ کراچی، حیدرآباد، خیرپور، سکھر، شکارپور ہر نمایاں مقام کے لوگوں میں مشاعروں سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ بالخصوص کراچی کی صورت حال تو شمالی ہند کے کسی شہر کی سی ہو گئی تھی۔ کراچی میں مشاعروں کی کثرت انجمن ترقی اُردو کے قیام سے ہوئی اور اس کے بعد اس میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا رہا۔

انجمن ترقی اُردو دراصل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہی کی ایک شاخ تھی جو اُردو کی ترویج کے لیے مسلم اکابرین نے ایک علیحدہ نظام کے تحت قائم کر دی تھی ۱۹۰۳ء میں دہلی میں اس کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ کچھ دنوں بعد اس کا دفتر اورنگ آباد منتقل ہو گیا۔ ۱۹۱۴ء میں ماسٹر ولایت حسین کی تحریک پر کراچی میں اس کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۹۲۰ء میں جام میر ایوب خاں اس کے صدر اور سیٹھ فدا حسین سیکریٹری ہوئے۔ ۱۹۲۳ء تک معمولی رفتار سے کام ہوا لیکن ۱۹۲۴ء میں بوہرہ قوم کی ایک فرد سیٹھ فدا علی علی بھائی کی مالی امداد سے انجمن میں ایک تازہ روح پڑ گئی اور جام میر ایوب خاں، حاجی غلام حسین، سیٹھ فدا حسین، محمد علی، خواجہ علی محمد، خواجہ ولایت حسین وغیرہم کی مساعی سے وہ ایک فعال جماعت بن گئی۔ بڑے پیمانے پر انجمن کا ایک جلسہ ہوا اور کتب خانہ کا قیام عمل میں آیا پھر ۱۹۴۰ء میں سلور جوبلی کا جشن منایا گیا۔

اس دوران سندھ کے اکثر عمائدین نے انجمن کی سرپرستی فرمائی جن میں سیٹھ یوسف ڈوسلانی، عارف شاہ گیلانی، حاجی نذیر الدین، ماسٹر عبدالرحمٰن، حبیب اللہ خاں، ماسٹر محمد رشید، عبداللہ اخوند اور محمد امین قریشی وغیرہ شامل ہیں، سیٹھ عبداللہ ہارون، حاتم علوی، سیٹھ طیب علی اور حاجی فضل الٰہی مختلف اوقات میں صدر رہے۔ ہمدردوں کی ایک طویل فہرست ہے جو مختلف اوقات میں دامے، درمے، سخنے، قدمے اعانت فرماتے رہے۔

ان اجتماعی کوششوں کے نتیجے میں کراچی اور سندھ کے دوسرے بڑے

شہروں میں اُردو کی گرم بازاری ہوگئی لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ زمانہ ماقبل میں کراچی اُردو شعر و سخن سے ناآشنا تھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مشاعروں کی حد تک کراچی میں انجمن کے قیام سے پہلے ہی ایک ادبی فضا پیدا ہو چکی تھی اور ۱۹۱۱ء سے برابر مشاعرے ہو رہے تھے جن کے بانی شیخ نبی بخش محمد پناہ تھے۔ کراچی کے اُردو مشاعروں میں یوں تو سندھ کے کئی موقر افراد نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے لیکن میر ایوب خاں کی شخصیت اور ادبی سرگرمی کبھی بھلائی نہیں جا سکتی۔ انہیں جہاں رفاہی کاموں کی خاص لگن تھی، وہاں اُردو سے بھی ایک خاص شغف تھا اور انہوں نے "ضیاء الاسلام" نام کی ایک ادبی انجمن قائم کی تھی جس کے زیر انتظام مشاعرے بھی ہوتے تھے۔ ۱۹۱۴ء سے ان ادبی اجتماعات میں اضافہ ہو گیا اور انجمن ترقی اُردو کی طرف سے رام باغ میمن ڈبیٹنگ سوسائٹی میں ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کا مصرعہ طرح تھا،

"غلام ساقی کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے"

پھر یہ سلسلہ چلا تو ۱۹۱۹ء تک ہفتہ وار، پندرہ روزہ اور ماہانہ مشاعرے ہونے لگے۔ ۱۹۱۸ء میں انجمن کی طرف سے ایک اُردو کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت مرزا قلیچ بیگ نے فرمائی۔ اس کانفرنس میں سندھی اکابر نے کافی بڑی تعداد میں شرکت کی۔[۱۶]

۱۹۲۰ء میں ایک اُردو کانفرنس کا انعقاد خیرپور میں کیا گیا جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت کامیاب رہی۔ ۱۹۲۴ء میں بمقام حیدرآباد ایک عظیم الشان مشاعرہ کیا گیا جس میں مصرعہ طرح تھا۔

"چشم موسیٰ کو بھی حسرت رہ گئی دیدار کی"

۱۶۔ رپورٹ مشاعرہ کمیٹی مرتبہ رضا ہمدانی بتقریب سلور جوبلی انجمن ترقی اُردو کراچی، ۱۹۴۰ء۔

اس مشاعرے میں سندھ کے شعراء نے بڑی تعداد میں طبع آزمائی کی۔ یہ مشاعرہ بھی مرزا قلیچ بیگ کی صدارت میں منعقد ہوا تھا اور اتنا کامیاب مشاعرہ تھا کہ آج تک بڑے بوڑھوں کی زبان پر اس کے تذکرے ہیں۔

اس طرح ۱۹۲۶ء تک صرف انجمن کی طرف سے اٹھارہ مشاعرے منعقد ہوئے جن سے کراچی اور اندرون سندھ کے تمام بڑے مقامات میں اُردو کی ادبی فضا پیدا ہوگئی۔ ۱۹۲۶ء میں مسلم کانفرنس کراچی کے پنڈال میں زیر صدارت جام میر محمد ایوب خان اتنا بڑا مشاعرہ ہوا کہ اس میں خواجہ حسن نظامی، میر غلام بھیک نیرنگ مولانا رحیم بخش سابق وزیر اعظم بہاول پور اور بہت سی دوسری شخصیتیں شریک ہوئیں۔

اسی سال میر علی نواز ناز نے انجمن کی سرپرستی قبول فرمائی۔ اس کے اگلے سال افسر صدیقی انجمن کے سیکریٹری ہوئے جن کی سربراہی میں مشاعروں کا وقار کچھ بڑھ گیا اور مجموعی طور پر دو سال میں انتیس مشاعرے ہوئے۔

۱۹۲۷ء میں خالق دینا ہال کا مشاعرہ کراچی میں برسوں یاد کیا گیا جس کی صدارت جام میر محمد ایوب خاں نے کی تھی۔ مصرعہ طرح تھا۔

"تیرے انداز ترے ناز پہ شیدا ہوں میں"

اس مشاعرے میں بھی سندھ کے اُردو شاعر کافی تعداد میں شریک ہوئے تھے بعض شعر پیش کیے جاتے ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ اُردو کی بساط شاعری پر اہل سندھ کی حیثیت کیا تھی۔

بن کے دیوانہ شریعت کا مکلف نہ رہا
کیسا عاقل ہوں، خردمند ہوں، دانا ہوں میں

جام میر محمد ایوب خاں

صور محشر کی طرف کان لگے ہیں میرے
گور میں منتظر وعدہ فردا ہوں میں۔

افسر صدیقی

کہتا ہے دل، کبھی مسکن تھا ئیں ارمانوں کا
اب تمناؤں کی اُجڑی ہوئی دنیا ہوں میں
شیدا اسرائیلی

کشتۂ ناز سے کہتی ہے تیری خاک قدم
کیا منور کن ہر دیدۂ بینا ہوں میں
قائل لکھنوی

میری تخلیق ہے برہان وجود خالق
صنعت صانع عالم کا نمونہ ہوں میں
عبدالمجید

صحن عالم میں ہر اک جا ہے تماشا میرا
یہ تماشا ہے کہ خود محو تماشا ہوں میں
غلام نبی آوج

ذرے ذرے میں نظر آتے ہیں ان کے جلوے
ہمہ تن چشم ہوں، سرگرم تماشا ہوں میں
مولابخش ہمدم

گوشۂ قبر میں مونس ہے نہ غم خوار کوئی
ہائے مجبور ہوں، ناچار ہوں، تنہا ہوں میں
نیاز احمد خاں نیاز

کیا کہوں اپنی سیہ بختی سے دنیا میں ہوں کیا
عارض حسن پہ جوں خال سویدا ہوں میں
عبدالکریم عزمی

قابل دید نہ تھا یوں تو مریض اُلفت
آپ آئے ہیں اگر پوچھنے، اچھا ہوں میں
محمد عمر خلیل

جلوۂ یار نے ہنگامِ تبسم یہ کہا
برق کے جلوۂ سیمیں کا اُجالا ہوں میں
غلام قادر غلام

کیوں نہ ہر بات حقیقت پہ ہو مبنی میری
نازؔ جاروب کش گنبدِ خضرا ہوں میں
محمد بخش رازؔ

حسن کہتا ہے کہ دنیا میں تمنا کیسی
عشق کہتا ہے تمناؤں کی دنیا ہوں میں
گل محمد بلوچ

حدِ توصیف سے باہر ہے کمال انساں
باغ آئینِ جہاں کا گل یکتا ہوں میں
نذیر احمد نذیرؔ

اپنی تقدیر پہ کیوں آپ نہ شیدا ہوں میں
اللہ اللہ تیرا چاہنے والا ہوں میں
عبدالرحمٰن خاں نسیمؔ

ہاتھ میں ہوں گے حسینوں کے ہزاروں دامن
دیکھنا حشر میں کس شان سے آتا ہوں میں
عبدالستار عشقؔ

جس نے بخشے ہیں تجھے ناز و ادا و انداز
بے مروت، اسی اللہ کا بندہ ہوں میں
محمد اسحٰق بیگ احقرؔ

منتظر راہ میں اس شوخ کی بیٹھا ہوں میں
کاش آجائیں یہاں محوِ تمنا ہوں میں
نبی گل خاں صابرؔ

یاس و اُمید کا عالم ہے مرے چہرے پر

دیکھتا شہر نیرنگیِ دنیا ہوں میں

رحمت علی قاضی

ہجر کی رات میں ہے لاکھوں بلاؤں کا ہجوم

ذات اللہ کی ہے اور اکیلا ہوں میں

عبدالحمید حمید

ان مشاعروں سے ادبی ذوق ایک جذبے کی شکل اختیار کر گیا تھا اور شاعروں کی باہمی چشمک بھی شروع ہو گئی تھی جو خاصہ ہے شاعرانہ مزاج کا لیکن اس سے ایک افادی پہلو یہ برآمد ہوا کہ ۱۹۲۷ء میں ایک نئی ادبی انجمن بزم حق کے نام سے قائم ہوئی پھر دوسری انجمن جمیعۃ الشعراء، اس کے بعد تیسری انجمن اشاعت اُردو وجود میں آئی اور آگے چل کر بزم کیت اور اُردو کلب وغیرہ۔ ان انجمنوں کے مابین بدیسی طور پر ایک چپقلش پائی جاتی تھی جس کو افسر صدیقی نے اپنے اخلاقی اثرات سے دور کرایا اور مشاعروں کا یہ سلسلہ پہلے کراچی گیر ہوا پھر سندھ کے تمام بڑے شہروں میں پھیل گیا۔

۳۱ دسمبر ۱۹۳۷ء کو خالق دینا ہال میں سندھ پراونشل اُردو کانفرنس منعقد ہوئی جس میں بڑے بڑے سندھی ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی۔ سندھ کے عظیم محقق آئی آئی قاضی نے ایک جامع اور بسیط مقالہ پڑھا جو ہر لحاظ سے ایک تحقیقی شاہکار تھا۔ اس موقع پر سیماب اکبر آبادی کی صدارت میں ایک مشاعرہ بھی ہوا جس کا مصرع طرح تھا۔

"ہر بندے کے لباس میں بندہ نواز ہے"

نظم کا ایک عنوان بھی دیا گیا تھا "انقلاب"

نظم کی حد تک یہ سندھ میں پہلا اقدام تھا جو کامیاب ہوا۔ اگلے مشاعروں میں اس کی تقلید کی گئی۔ ساون، جنگ، قدیم و جدید تہذیب اور ایک شام وغیرہ

عنوانات پر نظمیں کی گئیں۔

مشاعروں کا یہ سلسلہ [illegible] تک چلتا رہا پھر انھوں نے مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کا اثر قبول کر لیا۔ جنونوں کا تعاون بتدریج کم ہونے لگا۔ مشاعروں کی جگہ سیاسی جلسوں نے لے لی اور اردو کی نشر و اشاعت ایک دوسرے انداز پر ہونے لگی جس میں ماضی کی روایات بھی تھیں اور مستقبل کی امیدیں بھی مولوی عبدالواحد سندھی نے [illegible] کے کراچی کے ایک مشاعرے کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا کہ یہ مشاعرہ بالکل اسی شان و شوکت کا مشاعرہ تھا جیسے دلی یا لکھنؤ میں ہوتے تھے۔ شاعروں کی تعداد اتنی تھی کہ رات گئے تک مشاعرہ چلتا رہا اور بڑی اچھی اچھی غزلیں سننے میں آئیں۔

مشاعروں کے اس دور نے عملی طور پر اُردو کی تبلیغی مہم کا کام سرانجام دیا۔ کراچی میں ایک تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی جو مختلف مقامات سے آئے تھے۔ اُردو شاعری کا بول بالا کرنے میں انھوں نے بھی مقامی لوگوں کا ساتھ دیا لیکن یہ ساتھ کبھی عارضی اور کبھی مستقل رہا لہٰذا سندھ کی صفِ شعراء میں صرف ان لوگوں کو لیا گیا ہے جو واقعی سندھی تھے۔ مختلف مشاعروں سے سندھی شعراء کا ایک ایک شعر ملاحظہ کے لیے پیش ہے جو ان کی شاعرانہ سطح کا ترجمان ہوگا۔

پھیلائے پاؤں جب دل پُر اضطراب نے
تنگ آ کے ساتھ چھوڑ دیا صبر و تاب نے
منظور احمد صابر

دریائے حُسن کے رُخِ تاباں کو دیکھ کر
زنجیرِ موج توڑ دی پائے حباب نے
عبدالحئی حقانی

راز نہاں عیاں کیے جامِ شراب نے
خانہ خراب کر دیا خانہ خراب نے
محمد ابراہیم

تعریف خال وخط و ادا ہائے نازنین
جز اس کے کتنی یادِ خدا کی جناب نے
رام چندر اختؔر

خاکساری سے ہی حاصل مدعا ہو جائے گا
جب خودی مٹ جائے گی وصل خدا ہو جائے گا
شیو رام زاہدؔ

چومتے ہیں شوق سے چھالے مرے کانٹوں کا منہ
سحر کیسا تو نے پائے دشت پیما کر دیا
عطا محمد طاہرؔ

بات ہے تقدیر کی یہ، جس کو جیسا کر دیا
مجھ کو مجنوں اور مری جاں تجھ کو لیلیٰ کر دیا
محمد امین بدرؔ

دن تو کاٹا میں نے فرقت میں بصد رنج وتعب
اور گن گن رات کو تارے، سویرا کر دیا
عبد المجید غمگیںؔ

تو نے چہرے سے نقاب اُٹھا کے، یہ کیا کر دیا
بابِ اسرار خدائے لم یزل وا کر دیا۔
مولا بخش ہمدمؔ

خدا کا شکر ہم ایسوں کی کشتی دل کا
سوا خدا کے کوئی اور ناخدا نہ ہے۔
عبد المجید سعدیقی

فغاں کہ چار طرف آج دور باطل ہے
الٰہی ذکر صداقت تو اب فسانہ ہوا۔
حمیدؔ

بہار گلشن ہستی کی کیا خبر ہم کو
خزاں کے دور میں آباد آشیانہ ہوا
حکیم بشمبھر دیال گوہرؔ

سمجھ گیا ہوں کہ ہے کوئی روکنے والا
ارادہ جو کیا پورا وہ بارہا نہ ہوا۔
حفیظؔ

حسیں مجھ سا، وہ کہتے ہیں، دوسرا نہ ہوا
غضب تو یہ ہے مقابل میں آئینہ نہ ہوا
بیدلؔ

آئی قضا تو کہنے لگی حسرت حیات
قابو میں اپنے توسن عمر رواں نہیں
سری رام گل

اس خرمن امید پہ تو نے ہی بارہا
ہنس ہنس کے کیا گرائیں کبھی بجلیاں نہیں
محمد تقی طاہر

رنج و غم و فراق سے اقبالؔ کچھ نہ پوچھ
صبر و شکیب و ضبط کی مجھ میں تواں نہیں
اقبالؔ

***

ابر و بہار و جام و سبو سب سہی مگر

بے یار لطف بادۂ پیر مغاں نہیں

شمشیر

عمر رواں ہے سایہ دیوار کی طرح

ساکن دکھائی دیتا ہے گو یا رواں نہیں

علی

بگڑی ہے چال ابلق لیل و نہار کی

قابو میں اپنے توسن عمر رواں نہیں

احسان

کیا آنکھ وہ ہے جس سے کہ آنسو رواں نہیں

وہ دل ہی کیا ہے جس میں کہ زخم نہاں نہیں

درس

مائل نہ دخت رز پہ ہو، کیا لطف زندگی

وہ دل ہی کیا جو قائل پیر مغاں نہ ہو

آثر

چھپاؤں لاکھ غیروں سے تیرے درد محبت کو

رہے گا زخم دل آخر مرا اک دن عیاں ہو کر

محمد رشید ارشد

خفا ہیں اس قدر مجھ سے، مرے سائے سے بچتے ہیں

نہ آئے خانۂ دل میں کبھی وہ میہماں ہو کر

محمد اسمٰعیل شیخ

نہ رہ تو خاطر احباب پہ بار گراں ہو کر
جو ہے جینا تو جی خدمت گزار دوستاں ہو کر
عبدالکریم عاجزؔ

جھلک اک بار دکھلا کر مجھے وحشی بنا ڈالا
پڑی ہیں پاؤں میں زلفیں کسی کی بیڑیاں ہو کر
ہدایت اللہ افسوںؔ

وہ خفتہ بخت ہوں سویا کیا بانگ جرس پر بھی
پریشاں پھر رہا ہوں اب میں گرد کارواں ہو کر
خواجہ ولایت حسین صغیرؔ

کسی کا خون ناحق کر رہے ہیں خود بخود ثابت
تری آنکھوں پہ دو شمشیر کے ٹکڑے عیاں ہو کر
امیرالدین ہمدمؔ

مٹا جو راہِ طلب میں، ملی بقائے دوام
فنائے بحر محبت کبھی فنا نہ ہوا۔
شریف الحسن شیداؔ

ہمارے حال کی پرسش طبیب کچھ نہ کریں
یہ درد وہ ہے جو شرمندۂ دوا نہ ہوا
رام رکھا مل برقؔ

تو آج اس دل شوریدہ سر کی خیر ہوئی
کہ اس کے سامنے زلفوں کا ماجرا نہ ہوا
نبی شیر خاں شاکرؔ

***

خدا کے واسطے خاموش ہو جئے صاحب
ہماری جان چلی آپ کا ترانہ ہوا۔
ظفر عباس ظفر

وہ کون ہے جو ادا پر تری فدا نہ ہوا
ستم ہے یہ تجھے احساس بھی ذرا نہ ہوا
نیاز احمد نیاز [2]

ادبی انجمنوں کی یہ سرگرمیاں نظم تک محدود نہ تھیں، اردو نثر بھی ان کے دائرہ اثر میں تھی اور اردو ادب کا ارتقاء سندھی سے ایک آہنگ پیدا کرتا جارہا تھا جس کا اندازہ شیخ عبدالرزاق رازؔ کے الفاظ سے ہوتا ہے جو انھوں نے سندھی ادب کی ترقی کے سلسلے میں قلم بند کیے ہیں وہ لکھتے ہیں۔

"دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر نوجوان ادیبوں کا ایک گروہ ہمارے سامنے آیا۔ وہ سندھی ادب میں نئی صورتیں، نئے موضوعات اور نئے اسلوب لے کر جدید ادب کا سربراہ بنتا ہے۔ جدید رجحانات کا آغاز ۱۹۳۴ء میں ڈی جے سندھ کالج کراچی سے ہوا۔ کالج کی ادبی جماعتیں بزم اُردو اور سندھی ادبی سرکل نئے خطوط پہ کام کرنے لگیں۔ نئے ادب کی نئی تحریک کی داغ بیل کالج میں پڑی۔ ان دنوں سندھ میں لوگ عام طور پر رجعت پسندانہ نظریات کے قائل تھے۔ میں اس دور

---

[1] ماخوذ از پچیس سالہ روئداد انجمن ترقی اُردو کراچی مرتبۂ افسر صدیقی بتقریب سلور جوبلی ۱۹۴۰ء۔
[2] رپورٹ مشاعرہ کمیٹی مرتبۂ رضا ہمدانی بتقریب سلور جوبلی انجمن ترقی اُردو کراچی ۱۹۴۰ء۔
[3] "سندھ مدرستہ الاسلام کراچی" از الطاف علی بریلوی مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۵۵ء۔

میں اس کالج کا طالب علم تھا اور سندھی ادبی سرکل کا جنرل سکریٹری۔
کالج کے سربراہ ڈاکٹر گوربخشانی اس جماعت کے صدر تھے۔ ڈاکٹر صاحب
فارسی اور انگریزی زبان کے بڑے عالم تھے۔ وہ سندھ کے برگزیدہ
درویش اور صوفی شاعر شاہ لطیف کے بڑے شارح تھے۔ ان کی شرح
آج بھی لطیف کے ہر شیدائی کی رہنمائی کرتی ہے۔"

شیخ راز سلسلہ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

"۱۹۴۵ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی گئی۔ اس جماعت
کے کارکن اُردو کے نئے لکھنے والوں سے بے حد متاثر تھے۔ سندھ
میں اُردو لکھنے پڑھنے کا رواج تقسیم سے بہت پہلے عمل میں آچکا تھا
سندھ کا ہر پڑھا لکھا نئے اُردو ادب سے متاثر تھا۔ انجمن کے
ہفتہ وار نشستوں میں عام طور پر اُردو کے جدید ادیبوں کی تخلیقات
پر تبادلۂ خیالات ہوتا تھا۔ کراچی کالج سندھ کی بڑی درسگاہ تھی۔
تعلیم کے حصول کی خاطر سندھ کے تمام شہروں سے طلباء یہاں آتے
تھے۔ وہ نوجوان صحیح معنوں میں طلباء تھے۔ درس وتدریس کے علاوہ
ان کا کوئی مشغلہ نہیں تھا اس لیے وہ اپنا وقت مطالعہ پر صرف کرتے
تھے۔ انگریزی ادب، فرانسیسی ادب، روسی ادب اور اُردو ادب
جدید ادب کا رجحان کالج کے نوجوانوں میں پہلے سے موجود تھا اس
لیے ترقی پسند مصنفین کی نظریں کالج پر لگی ہوئی تھیں۔"

"طلباء کی شرکت کی وجہ سے ترقی پسندوں کی جماعت مضبوط ہوگئی۔ ہر
نظریہ کے ادیب کو اس میں داخلہ مل گیا۔ ہر نوجوان روایت سے
کنارہ کشی پر آمادہ نظر آرہا تھا اور آزادی کا خواہاں تھا۔ وہ افسر شاہی
اور سرمایہ داری کے خلاف تھا۔ انجمن کی باقاعدہ نشستیں ہونے
لگیں۔ اس انجمن کا سیکریٹری گوبند مالی تھا۔ ہر جمعہ کو شام کو ہم لوگ

آرام باغ کے ایک فلیٹ میں مل بیٹھتے تھے اور جدید ادب پر بحث کے ساتھ نیا ادب بھی پیش کرتے۔ ہمارے جدت پسند اساتذہ بھی ان مجالس میں شریک ہوتے۔ انجمن کے اراکین ہر صنفِ ادب میں نئے تجربات کرنے لگے۔ اُردو افسانے کی نئی تخلیقات کے زیر اثر سندھی میں مختصر افسانہ ٹیکنک کو اپنایا گیا اور سندھی افسانہ ایک پسندیدہ ادبی صنف کی حیثیت سے اُبھرنے لگا"۔ ۸۱؎

ان بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ بیسویں صدی عیسوی کے وسط میں اُردو کی دو قسم کی ادبی انجمنیں کراچی میں پائی جاتی تھیں۔ ایک قسم وہ تھی جو پرانی ڈگر پر چل رہی تھی، دوسری وہ جو یورپ کی زبانوں کے خیالات مستعار لے کر اپنی زبان کو گرانقدر بنانا چاہتی تھی۔ اس میں انجمن ترقی پسند مصنفین اور ایسی ہی بعض دوسری جماعتیں شامل تھیں جو عموماً تعلیمی اداروں سے متعلق تھیں۔

پہلی قسم میں جمعیت الشعراء، اشاعت اُردو، بزم کیف وغیرہ تھیں جنہوں نے برسوں تک مشاعرے منعقد کرائے اور ادبی جلسے کیے۔ ان انجمنوں کا دائرہ صرف کراچی تک محدود نہ تھا، سندھ کے اکثر مقامات شروع ہی سے ان کے اثر میں تھے کیونکہ حیدرآباد، خیرپور، سکھر اور لاڑکانہ کی فضا سندھی اور اُردو مشاعروں کے لیے انیسویں صدی کی چھٹی ساتویں دہائی سے آشنا ہو چکی تھی۔

اندرونِ سندھ مشاعروں کا آغاز صاحبان حیثیت کی انفرادی کوششوں سے ہوا تھا لیکن بیسویں صدی کا ایک ربع گزرنے کے بعد سے انجمنوں کا تصور پیدا ہو گیا بعض مقامات پر چھوٹی موٹی انجمنوں کے قیام کا سراغ ملتا ہے البتہ سندھ کی بڑی انجمن بہت دنوں بعد قائم ہوئی جس کے متعلق ڈاکٹر محمد ابراہیم خلیل لکھتے ہیں۔

۸۱؎ مضمون "سندھی جدید ادب"، مشمولہ "ادبی رابطے لسانی رشتے" صفحہ ۱۱۷ تا ۱۱۹ مطبوعہ مجلس ادب حیدرآباد ۱۹۷۶ء۔

"جمعیت الشعرائے سندھ ۱۹۴۶ء میں قائم ہوئی تھی اور راقم الحروف پورے دس سال تک اس کا صدر منتخب ہوتا رہا۔ جمعیت الشعراء کے بعض مشاعرے ماہوار ہوتے تھے اور اکثر سالانہ۔ جب جمعیت الشعراء کی سالانہ کانفرنس مختلف شہروں میں منعقد ہوتی تھی اس وقت بھی طرح کے مصرعے ایسے ہوتے تھے جو بعض لفظوں کی ردوبدل سے سندھی اور اُردو کے مصرعہائے طرح ہوتے تھے۔" [19]

ڈاکٹر صاحب کا یہ تذکرہ حیدرآباد سے متعلق ہے، لاڑکانہ کا ذکر کرتے ہوئے وہ تحریر فرماتے ہیں۔

" اس کی ایک تازہ ترین مثال لاڑکانہ سندھی سوسائٹی ہے جو تقسیم ملک سے آٹھ نو سال پہلے قائم ہوئی تھی۔ جب اس سوسائٹی کے مشاعرے ہوتے تھے تو ان میں جو مصرعہ طرح سندھی زبان کا ہوتا تھا وہی اُردو زبان کا ہو جاتا تھا۔" [20]

اس تصریح سے سندھ کے ممتاز مقامات کی ادبی فضا کو بڑی آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ وہاں اُردو اور سندھی زبانیں اہل زبان کی طرح شانے سے شانہ جوڑ کر آگے بڑھ رہی تھیں اور اگر اس صورت حال کو ہندوستان کے سیاسی حالات سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو تعاون و اتحاد کا وہ منظر سامنے آئے گا جس سے محسوس ہوگا کہ گویا اُردو اہل سندھ کی زبان تھی۔

" سندھ کا کون سا علاقہ ہے جہاں مسلم لیگ کے جلسے نہیں ہوئے، کون سی جگہ ہے جہاں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلباء نہیں پہنچے۔ کون سا جلسہ ہے جس میں تقریریں نہیں ہوئیں اور جذبات آفریں نظمیں نہیں پڑھی

۱۹تا۲۰۔ "قومی زبان کے متعلق بعض حقائق" مشمولہ "ادبی رابطے لسانی رشتے" صفحہ ۷، ۴۴ مطبوعہ مجلس ادب حیدرآباد ۱۹۷۶ء۔

گیئیں۔ یہ تقریریں اور نظمیں کس زبان میں ہوتی تھیں؟ تقریر کرنے والے اور نظمیں پڑھنے والے کس علاقے کے لوگ تھے؟"

ڈاکٹر محمد ابراہیم خلیل نے بتایا ہے کہ

"بیشتر کارروائی اُردو میں ہوتی تھی۔ مقرر اور نظم خواں اہل سندھ ہوتے تھے اور اُردو اخبارات اور رسائل پروپیگنڈے کا کام کرتے تھے جن کا مطالعہ کیے بغیر عام لوگوں کو بھی قرار نہ آتا تھا اور ان سب عوامل نے مل کر ہی انتخابات میں کامیابی حاصل کی تھی۔ بالفاظ دیگر سیاسی جنگ جیتنے میں اُردو نے ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔" ۲۱ھ

نشرواشاعت کی اس سرگزشت سے سرزمین سندھ اور اُردو کے روابط کسی ثبوت کے محتاج نہیں رہتے جس میں سندھ کے قدیم باشندوں کے علاوہ ان لوگوں کا بھی حصہ ہے جو پنجاب، یوپی یا کسی اور علاقے سے آکر سندھ میں آباد ہو گئے تھے۔ یہ لوگ اگرچہ تعداد میں زیادہ نہیں ہیں مگر ان کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جیسے مولا بخش ہمدم اور افسر صدیقی وغیرہ۔

افسر صدیقی بحمداللہ بقید حیات ہیں۔ ان کی آنکھوں نے وہ دور دیکھا ہے جب جام میر ایوب خاں، شیخ نبی بخش محمد پناہ اور سیٹھ فدا حسین وغیرہ کراچی میں اُردو کی ادبی محفلیں آراستہ کرتے تھے۔ افسر نے ان سب کے دوش بدوش کاروان سخن کو آگے بڑھایا۔ سندھ میں انجمن ترقی اُردو کی کامیابی بہت کچھ افسر صاحب کی رہین منت ہے۔

قیام پاکستان کے بعد بھی افسر صدیقی کی ادبی سرگرمیاں ختم نہیں ہوئیں مگر اب ان کے پرانے ساتھی ایک ایک کر کے ساتھ چھوڑ چکے تھے لہٰذا وہ انجمن ترقی اُردو کے

۲۱ھ "قومی زبان کے متعلق بعض حقائق" مشمولہ "ادبی رابطے لسانی رشتے" صفحہ ۷۔ ۴۶ مطبوعہ مجلس ادب حیدرآباد ۱۹۷۶ء

دفتر میں گوشہ نشین ہو گئے اور نو واردان بساط ادب نے پرانے نغمہ طرازوں کی جگہ لے لی۔

اُردو کے نئے قافلے میں اب بے شمار لوگ شامل تھے جن کے تذکرے موقع محل سے آتے رہے ہیں اور ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنھوں نے صرف مشق سخن پر اکتفا کی اور وہ بھی جو اپنی ذات سے خود ایک انجمن تھے اور انجمن ساز بھی۔ ڈاکٹر آصف جاہ کاروانی اور سرشار عقیلی کا شمار ایسے ہی لوگوں میں ہے۔

سرشار عقیلی نے "محفل احباب" نام کی ایک انجمن بنائی تھی جس کے زیر انتظام سندھی اُردو مشاعرے ہوتے تھے۔

ڈاکٹر کاروانی نے انجمن سازی تو نہیں کی مگر ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۶ء تک انجمن ترقی اُردو کے معتمد اعزازی کے فرائض انجام دیئے جو ان کی گرانقدر خدمت ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ماہنامہ شعاع اُردو کی اشاعت اور شعاع اُردو پبلشنگ ہاؤس کا قیام ڈاکٹر کاروانی کا امتیاز ہے جو کراچی کی حد تک اہل سندھ کی اُردو سے دلچسپی پر دلالت کرتا ہے۔ حیدرآباد اور دوسرے مقامات کی روداد اس پر مستزاد ہے اور اکابر سندھ کی اُردو دوستی کی بین دلیل ہے۔

حیدرآباد

اختر رضوی نے اپنی زیر طبع کتاب کا نام "حیدرآباد، اک شہر لازوال" رکھا ہے، سندھ کا یہ شہر واقعی ہے بھی ایسا ہی۔ ریگزار کی اکثر روایات، ثقافتی اور ادبی داستانیں اس سے وابستہ ہیں۔ انگریزوں نے انیسویں صدی عیسوی کے وسط سے کراچی کو مرکز بنا دیا تھا مگر حیدرآباد کی اہمیت پھر بھی کم نہ ہوئی چنانچہ اُردو کے سلسلے میں بھی اسی شہر کو اولیت حاصل ہے۔

میروں کے دور میں اُردو کو جو فروغ حاصل ہوا وہ بھی اسی شہر میں اور انگریزی عہد میں میر عبدالحسین سانگی نے سندھی مشاعروں کی جو شمع روشن کی وہ بھی اسی شہر میں اور اس سلسلے میں اُردو کو جو مقام میسّر آیا، اس میں بھی اس شہر کو بڑا دخل ہے۔

بیسویں صدی عیسوی میں جب کراچی میں اُردو مشاعرے شروع ہوئے تو یہ شہر بھی پیچھے نہیں رہا اور جب انجمنیں قائم ہونے کا سلسلہ شروع ہوا تو حیدرآباد نے بھی تعاقب کیا اور ۱۹۴۲ء میں یہاں انجمن ترقی اُردو کی شاخ کھل گئی۔ انجمن نے کراچی میں جو کچھ کیا تھا حیدرآباد میں بھی اسی کا اعادہ کیا گیا۔ مشاعرے شروع ہوگئے، شاعر جمع ہونے لگے اور ہر طرف ایک ادبی ماحول نظر آنے لگا۔

عبداللہ خواب کے استاد محمد حیات شاہ حافظ، ان کے بڑے بھائی محمد موسیٰ راز، ڈاکٹر محمد ابراہیم خلیل، سعید احمد سعید، محمد رمضان شاد اور مرزا فیض علی وغیرہ کتنے ہی لوگ تھے جنہوں نے اُردو کی پشت پناہی کی اور بساطِ شاعری روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتی رہی۔

یہ زمانہ ڈاکٹر محمد ابراہیم خلیل کی جوانی کا تھا مگر اُردو کے سلسلے میں وہ اس وقت بھی اتنے ہی سرگرم اور سنجیدہ تھے جتنے آج ہیں لہٰذا شاعروں کی نزدیک میں ان کی خدمات شروع ہی سے قابلِ قدر اور موجبِ استحسان رہی ہیں۔

۱۹۴۶ء میں انہیں کی تحریک پر جمعیت الشعرائے سندھ لاڑکانہ میں قائم ہوئی جس میں سندھ کے عظیم مرشد طالب المولیٰ کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ یہ انجمن سندھی اور اُردو کو ایک ڈگر پر چلاتی رہی اور ایک ہی مصرع طرح پر ہر دو زبان کے مشاعرے کرتی رہی پھر اس کی شاخیں حیدرآباد اور دوسرے مقامات پر قائم ہوئیں اور اس کے زیرِ انتظام مقامی مشاعرے ہوتے رہے۔ اس کے دو سال بعد ۱۹۴۸ء میں ڈاکٹر محمد ابراہیم خلیل نے ایک نئی انجمن بزم خلیل کی بنیاد ڈالی اور اس کے تحت فارسی، سندھی اور اُردو مشاعروں کا آغاز کیا۔ شروع شروع میں اس بزم کی نشستیں ہفتہ وار ہوتی تھیں۔ مشاعرے ماہانہ اور سالانہ منعقد کیے جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جب بزم خلیل کا سالانہ جلسہ ہوتا تو حیدرآباد کے ہر گلی کوچے میں ایک رونق نظر آتی تھی اور بزم کا پنڈال تو اس طرح جگمگاتا تھا کہ روشنی سے نگاہیں خیرہ ہونے لگتی تھیں۔

مشاعروں کا یہ زور زیادہ دنوں باقی نہ رہا پھر بھی اس کا سلسلہ اب تک قائم ہے اور

ڈاکٹر خلیل کا نام ایسی ہر ادبی تقریب کی کامیابی کی ضمانت ہے۔[۲۲]

کوٹری

یہ بستی دراصل حیدرآباد کی ملحقہ آبادی ہے مگر یہاں ادبی انجمنیں حیدرآباد سے علیحدہ ہیں جو اکثر مشاعرے منعقد کرتی رہتی ہیں اور ان میں مقامی شعراء کے علاوہ مشہور شاعر بھی شریک ہوتے ہیں۔

بعض چھوٹے اشاعتی ادارے بھی ہیں ان میں "انجمن اشاعت ادب" ایک امتیاز رکھتی ہے جس نے اُردو کی کئی کتابیں چھاپی ہیں۔

خیرپور

سندھ میں اُردو کی نشرواشاعت میں خیرپور نے بھی بڑا اہم کردار ادا کیا ہے اس ادب پرور ریاست کا ہر فرمانروا خود بھی شاعر تھا اور شاعر نواز بھی۔ میر علی مراد اوّل سے لے کر میر علی مراد خاں ثانی تک ہر والی ریاست کے دور میں مختلف نہج و اعتبار سے ادب کی خدمت کی گئی اور سچل سرمست سے لے کر نسیم امروہوی تک مقامی اور غیر مقامی کی تمیز کے بغیر قلم کاروں پر نوازش و اکرام کی بارش ہوتی رہی۔

خیرپور میں باقاعدہ مشاعروں کا سلسلہ تو یقیناً بہت بعد میں شروع ہوا لیکن جب کوئی بڑا شاعر باہر سے آتا تو درباری امراء و مقربین کی نشستوں میں اس کا کلام سنا جاتا پھر عمائدین ریاست کے گھروں پر خواص کے چھوٹے چھوٹے اجتماعات ہوتے جن میں اس شاعر کے علاوہ مقامی شاعر بھی اپنا کلام سناتے۔ میر علی نواز خاں کا دور ان خصوصی مشاعروں کے لیے مختص ہے۔ اس زمانے میں بارہا عام لوگوں کو بھی شرکت کا موقع ملا اور خیرپور کے در و دیوار اُردو شعر و نغمہ سے آشنا ہوئے جس کے بعد ملک کے دوسرے حصوں کی طرح خیرپور میں بھی عوامی مشاعرے ہونے لگے۔

مجالس عزا کی اُردو تقاریر اور مرثیہ خوانی نے بھی خیرپور کی اُردو اشاعت میں

---

[۲۲] حسب بیان زبانی ڈاکٹر محمد ابراہیم خلیل۔

کافی کام کیا اور اُردو فہمی کی ایک عام فضا پیدا کر دی جس کا سلسلہ انیسویں صدی عیسوی کے آخر سے شروع ہو گیا تھا۔ خود سندھ کے مرثیہ گویوں میں اکثر لوگ اُردو مرثیے کہتے تھے۔ وہ بھی عوامی مجمعوں میں پڑھے جاتے تھے جس کے نتیجے میں سندھ میں اُردو کے شاعر پیدا ہو گئے تھے جیسے عالم احقر مرثیہ گو اور عابد علی شیداؔ۔

شیداؔ کہتے ہیں۔

نہ لائے تاب موسیٰ کی طرح بے ہوش ہو جائے

تو خواہش کیوں کرے دیدار کی، وہ راز داں کیوں ہو

ازل کے روز سے کلک قضائے قسمت نے

مزاج لکھ کے امیرانہ، کر دیا ہے فقیر

اسی طرح اور بہت سے شاعر تھے جن میں ایک بشارت حسین زیدی بھی تھے جو کئی نسلوں سے سندھ کے ساکن تھے اور عموماً اُردو نظمیں کہتے تھے۔ میر امام بخش خاں کے دور کے بعد شعراء و ادباء کی تعداد بڑھتی رہی حتیٰ کہ پاکستان بننے کے بعد کتنے ہی ادیب و شاعر خیر پور پہنچ گئے جن میں نسیم امروہوی سب سے معروف شخصیت ہیں۔ ان کے شمول میں یکتا امروہوی، پیکر نقوی، خاور نگرامی، ناطق بدایونی، رہبر ہاشمی، عاشق کیرانوی وغیرہ نے خیر پور کی ادبی فضا میں جان ڈال دی۔ موخر الذکر شعراء مشاعروں کی روحِ رواں بھی تھے۔ ان کی کوششوں سے شعر و شاعری کا وہ ماحول پیدا ہوا کہ اُردو کے سندھی شاعروں کی گنتی سیکڑوں تک پہنچ گئی اور آج کے ادب میں کئی معروف ناموں کی وابستگی خیر پور سے ہے۔

شاعروں کے ساتھ ساتھ ادب و صحافت کی انجمنیں بھی قائم ہوئیں جن میں جرنلسٹ ایسوسی ایشن ایک فعال جماعت ہے اور خواجہ غلام حسین مخدومی کی سرکردگی میں اچھا کام کر رہی ہے۔

ادبستان، بزم غالب، بزم انیس اور یاران ادب وغیرہ ادبی انجمنیں ایک

چھوٹے سے مقام پر اس بات کی دلیل ہیں کہ گوشہ گوشہ اُردو نغموں سے گونجتا رہتا ہے اخبارات میں مراد، رہنما اور پیر و مرشد قابل ذکر ہیں۔ ۲۳ے

ہالا

سندھ کے بعض دوسرے مقامات کی طرح ہالا میں بھی ادبی سرگرمیوں کا آغاز بیسویں صدی عیسوی کی چوتھی دہائی میں ہوا اور اس کا سہرا حضرت طالب المولیٰ کے سر بندھتا ہے۔ آپ نے ۱۹۳۶ء میں ایک "انجمن علم و ادب" قائم کی، جس کے زیرِ انتظام کئی ادبی کانفرنسیں ہوئیں، ایک پریس بھی قائم کیا گیا جس سے بعض سندھی رسالے شائع ہوئے۔ اسی انجمن کے زیرِ اہتمام سندھی مشاعرے بھی ہوتے تھے۔ اکثر اُردو مشاعرے بھی منعقد ہوتے جس کی صدارت خود طالب المولیٰ یا کوئی دوسرے بزرگ فرماتے۔ ہالا میں اُردو شاعروں کی بھی خاصی تعداد ہے، وہ ان مشاعروں میں اپنا کلام سناتی۔ کسی مشاعرے کی کوئی باقاعدہ کارروائی نظر سے نہیں گزری پھر بھی عاجز ہالائی اور بعض دوسرے شاعروں کے نام معروف ہیں۔ ۲۴ے

جیکب آباد

سندھ کا یہ شہر بھی شخصیت آفریں اور ادب نواز رہا ہے۔ یہاں بھی ہمیشہ سے سندھی کے دوش بدوش اُردو کے چرچے ہوتے رہے ہیں۔ مشاعروں میں بھی اُردو کو جگہ ملتی رہی ہے۔ مقتدر اور متمول حضرات کے وہاں وقتی شعر خوانی کا رواج تو عرصے سے تھا لیکن اُردو کا باقاعدہ نعتیہ مشاعرہ ۱۹۳۳ء میں ہوا جس کے صدر غلام رسول مغل اور سیکرٹری مولانا خیر محمد اوحدی تھے۔ اس کے بعد بعض مشاعرے اور بھی ہوئے لیکن وہ اس پایے کے نہ تھے۔

جہاں تک جرائد و رسائل کا تعلق ہے، پہلے پہل سندھی ہفت روزہ "الحنیف" کا

۲۳ے حسب بیان زبانی نسیم امروہوی۔

۲۴ے حسب بیان زبانی ڈاکٹر محمد ابراہیم خلیل۔

اُردو ایڈیشن ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا اور ایک عرصے تک جاری رہا۔ ۱۹۳۶ء میں اسلم اچکزئی نے ایک ہفت روزہ "نوجوان" نکالا۔ پھر "کمال ہند" کے نام سے ایک دوسرا ہفت روزہ بھی شائع کرنا شروع کیا۔ یہ دونوں اخبار ۱۹۴۲ء تک چھپتے رہے۔ پھر بعض جرائد اور نکلے مگر وہ چل نہ سکے۔[25]

روہڑی

سندھ کے گنتی کے ممتاز مقامات میں روہڑی کو بھی ایک درجہ حاصل ہے۔ اس کو بیدل و بیکس کا دیار کہتے ہیں اور گہوارۂ تصوف و ادب بھی یہاں ہر زمانے میں شعر و شاعری کی شمع روشن رہی، فارسی عہد میں بھی اور سندھی و اُردو کے دور میں بھی۔ اس سرزمین کی خاک سے فارسی اور سندھی کے شاعر بھی پیدا ہوتے رہے ہیں اور اب اُردو نغمے بھی الاپے جا رہے ہیں۔ اکثر چھوٹے چھوٹے مشاعرے ہوتے رہتے ہیں۔ ایک ادبی انجمن بھی قائم ہے جس میں اکثر مقامی شاعر شریک ہوتے ہیں۔[26]

گھوٹکی

گھوٹکی، روہڑی کے نزدیک اگرچہ ایک چھوٹی سی آبادی ہے لیکن اس نے ادب کی بڑی خدمت کی ہے اور سندھی و اُردو کے بہت سے شاعر پیدا کیے ہیں۔ اس مقام کی بعض شخصیتیں کبھی بھلائی نہیں جا سکتیں۔ ان میں ایک بزرگ انور علی شاہ گیلانی ہیں جو سندھی اور اُردو دونوں کے شاعر ہیں اور صاحب دیوان بھی۔

آپ نے گھوٹکی میں ایک انجمن بنائی ہے جس کا نام "بزم تارک" ہے۔ یہ انجمن سندھی کے ماہانہ مشاعرے منعقد کرتی ہے۔ یہاں کے سندھی شاعروں میں اکثر لوگ اُردو میں بھی شعر کہتے ہیں لہٰذا اُردو مشاعرے بھی ہوتے رہتے ہیں۔

---

[25] بحوالہ خط حافظ خیر محمد اوحدی بنام مصنف مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۹۷۶ء۔

[26] مضمون شعرائے بزم تارک، مشمولہ سندھی ادب نمبر نئی قدریں حیدرآباد، ۱۹۷۳ء۔

شاعروں میں خود اظہر گیلانی کے علاوہ کئی شاعر اُردو شعر کہنے پر قدرت رکھتے ہیں جن میں محمد شاہ شاؔد، انور علی انوؔر، غیاث الدین شاہ راسخؔ، نیاز علی شاہ مرشدؔ، عبدالخالق آمرؔ، نور محمد شاہ نوؔر، اختر بخاری، غلام رسول بلوچ، ماسٹر محمد عالم، مدہوش شاہد، عالم بلوچ، مضطر، سلیم، احقر، عارض، صمدن، امیر بخاری، روشن سومرو، خواب گیلانی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔[۲۷]

لاڑکانہ

لاڑکانہ کو سندھ میں اگرچہ سیاسی اہمیت حاصل رہی ہے پھر بھی اس کی قدامت اور حال ادبیت سے خالی نہیں۔ اس سرزمین نے کئی نامور شاعر اور ادیب بھی پیدا کیے ہیں جن میں حاجی محمود خادم لاڑکانوی (۱۸۹۳ء تا ۱۹۶۱ء) ایک معروف شخصیت ہیں۔ سندھی ادب میں آپ کا جو مقام ہے، اس پر مستزاد آپ کی ادبی سرگرمی ہے ۱۹۱۵ء میں لاڑکانہ میں جو بزم مشاعرہ قائم کی گئی، اس میں خادم لاڑکانوی کا عملی حصہ ہے۔

۱۹۲۳ء میں اس بزم مشاعرہ کی طرف سے شاعری کا ایک گلدستہ شائع ہونا شروع ہوا پھر ۱۹۳۰ء میں ایک ہفت روزہ "الحقیقت" جاری کیا گیا جس میں سندھی کے ساتھ اُردو اشعار بھی پابندی سے چھپتے تھے۔ یہ سلسلہ ۱۹۴۹ء تک برقرار رہا۔

مشاعروں کا تو اتنا زور تھا کہ اکثر و بیشتر شاعروں کے اجتماعات ہوتے رہتے جن میں ڈاکٹر عبدالمجید صدیقی، مولانا عاقلی، غلام سرور مغل وغیرہ مشاہیر شریک ہوتے۔

۱۹۳۰ء سے سندھی کے ساتھ اُردو کو بھی جگہ دی گئی اور ایک ہی مصرعۂ

---

۲۷ "مضمون شعرائے بزم تارک" مشمولہ سندھی ادب نمبر نئی قدریں حیدرآباد، ۱۹۷۳ء۔

طرح پر ہر دو زبان میں طبع آزمائی کی جانے لگی ۱۹۳۹ء میں سندھی سدھار سوسائٹی قائم ہوئی جس کی طرف سے ماہنامہ ادیبِ سندھ جاری ہوا۔ اس ماہنامے میں بھی اُردو اشعار چھپتے تھے۔

۱۹۴۶ء میں جمعیت الشعرائے سندھ کا قیام عمل میں آیا جس کے تحت کئی ادبی کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ شعر و شاعری کی اس گرم بازاری میں مقامی شعراء ہمیشہ فعال رہے۔ خادم لاڑکانوی تو سندھی کے ساتھ اُردو میں شعر کہتے ہی تھے۔ ان کے علاوہ کئی اور اچھے اچھے شاعر پیدا ہوئے جن کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا اور آخر حافظ لاڑکانوی کو کہنا پڑا۔

مجھ کو دنیا کے حوادث ڈگمگا سکتے نہیں
حق پرستی سے قدم میرا ہٹا سکتے نہیں۔

"جمعیت الشعراء" نے اس ادبی فضا کو اور دیدہ زیب بنا دیا اور اس کے اثرات آج تک پائے جاتے ہیں۔ ۲۸ے

شکارپور

سندھ کے اس قدیم شہر نے نشر و اشاعت میں خاص کردار ادا کیا ہے۔ یہاں سندھی کے ساتھ بیسویں صدی کے اوائل سے اُردو کتابیں چھپنے کی نظیریں بھی ملتی ہیں جن کا ذکر مطبوعات کے سلسلے میں کیا گیا ہے۔ سندھی پر اُردو کے اثرات کے ذیل میں آغا حشر کے ڈرامے معرضِ بحث میں آ چکے ہیں جو یہاں شروع ہی سے اسٹیج کیے جاتے تھے، بعض سندھی میں ترجمہ ہو کر اور بعض اُردو ہی میں۔

دھرم اپکارا میچیور ڈرامیٹک سوسائٹی کا کشادہ اور وسیع تھیٹر اس کے لیے مشہور تھا جہاں ہولی اور دیوالی میں غیر منقسم ہندوستان کا فنکار بھی بلائے

۲۸ے بحوالہ خط ڈاکٹر عبدالمجید میمن بنام مصنف مورخہ ۹، اکتوبر ۱۹۷۶ء خط عبداللہ اثر بنام مصنف مورخہ ۱۳، ستمبر ۱۹۷۶ء۔

جاتے تھے جیسے پنڈت ادمکارناتھ، ماسٹر پٹوردھن، ماسٹر نارائن دیاس، ماسٹر توکل حسین، ماسٹر دھرم پال، بڑے غلام علی، چھوٹے غلام علی، استاد نیاض خاں اور ماسٹر نصیر خاں۔ یہ لوگ ہندی کے ساتھ اُردو کی چیزیں بھی پیش کرتے تھے اور لوگ ان سے محظوظ ہوتے تھے۔

اُردو رسائل میں تقسیم کے بعد ایک ہفت روزہ "وادی سندھ" جاری ہوا تھا جو بند ہو چکا ہے۔ فی الوقت تعلیمی اداروں کی طرف سے سالانہ میگزین مخزن اور خیابان شائع ہوتے ہیں۔

یہاں کے سندھی شاعروں اور ادیبوں میں سے اکثر نے اُردو کی خدمت کی ہے جن کے انفرادی تذکرے شامل کیے گئے ہیں۔ شاعروں کی حد تک اس شہر کا ماضی کافی روشن ہے۔ ٹاؤن ہال اور کالج میں اکثر بڑے بڑے مشاعرے منعقد ہوئے جن میں سندھی کے ساتھ اُردو کو بھی جگہ دی گئی۔ اب بھی کالج میں سالانہ جشن کے موقع پر سندھی اور اُردو کے مشاعرے ہوتے ہیں البتہ پبلک میں بڑے مشاعروں کے بجائے شعر خوانی کی چھوٹی چھوٹی نشستوں کا رواج پڑ گیا ہے۔[۲۹]

سکھر

سندھ کے ماضی میں شکارپور کے سامنے سکھر کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔ انگریزوں نے اس مقام کو اہمیت دی لہٰذا بدیہی طور پر یہاں لوگوں کے آنے جانے کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ہندوستان کی بین الاقوامی زبان بولی جانے لگی۔ ۱۸۶۱ء میں سندھی کا پہلا اخبار "مطلع خورشید" اسی مقام سے نکلا اور ۱۸۹۵ء میں آفتاب سندھ کا اجراء بھی یہیں سے ہوا۔ اس اخبار میں اکثر اُردو نظمیں بھی چھپتی تھیں اُردو کا کوئی باقاعدہ رسالہ یا اخبار تقسیم سے قبل نہیں نکلا لیکن میر علی نواز کے عہد میں شیعہ کانفرنس منعقد ہوئی جس میں اکثر تقریریں اُردو میں کی گئیں اور اس کے بعد

---

[۲۹] بحوالہ خط حبیب اللہ بھٹو بنام مورخہ ۹ ستمبر ۱۹۷۶ء۔

سے سندھی مشاعروں میں اُردو کلام پیش کیے جانے کا رواج ہو گیا۔ تقسیم کے بعد کئی اُردو رسالے نکلے۔ اُردو کے مکتبے قائم ہوئے۔ اُردو مشاعرے بھی ہوئے جس کے نتیجے میں اہل سندھ میں بھی اُردو کا ذوق بڑھ گیا اور بہت سی ادبی انجمنیں قائم ہو گئیں۔

سب سے پہلی باقاعدہ انجمن فروغ ادب کو قرار دیا جا سکتا ہے جس کا پہلا ادبی اجتماع ۱۹۵۰ء میں ہوا۔ اس انجمن کے صدر حکیم شمس الحسن اور سیکرٹری آفاق صدیقی تھے۔ افتتاح کی رسم اے کے بروہی نے انجام دی تھی۔ ۱۹۵۶ء میں ایک کل پاکستان مشاعرہ منعقد ہوا۔ ۱۹۵۸ء میں لطیف اکیڈمی کی طرف سے پھر ایک ادبی اجتماع ہوا جس کے روح رواں شیخ راز اور آفاق صدیقی تھے۔

بحالت موجودہ بھی ڈسٹرکٹ کلچرل ایسوسی ایشن، مجلس ادب، مہران کلچرل ایسوسی ایشن، رائٹرز گلڈ اور دوسری کئی انجمنیں سرگرم عمل ہیں اور سندھی اُردو کی ادبی سرگرمیاں دوش بدوش جاری ہیں جو سندھ کی روایات میں ہے کہ مقامی زبان کے ساتھ اُردو کو بھی پروان چڑھایا جائے۔ [۳۰]

نواب شاہ

یہ چھوٹا سا شہر بھی سندھ میں ایک امتیاز رکھتا ہے۔ اس کی خاک سے بھی سندھی کے کئی ادیب پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں یہاں سب سے پہلا چھاپہ خانہ کھولا گیا جس کے مالک ڈاکٹر عبدالجبار قریشی ہیں۔ انہوں نے ۱۹۴۸ء میں آئینہ نام کا ایک ہفت روزہ اُردو اخبار بھی نکالا تھا۔ جون ۱۹۵۱ء میں فاضل زیدی نے ایک اُردو رسالہ "طوفان" شائع کرنا شروع کیا جو زیادہ دن چل نہ سکا۔

اس چھاپہ خانہ سے اُردو کی بعض کتابیں بھی چھپیں جن میں فاضل زیدی کا انتخاب کلام "اشک و آہ" اور بشیر درّانی کے کلام کا مجموعہ "جذب و گریز"

---

[۳۰] بحوالہ خط شیخ عبدالرزاق راز بنام مصنفہ مورخہ ۲۳ ستمبر ۱۹۷۶ء

شائع ہوا۔

سندھی شعر خوانی کی نشستوں کا صحیح پتہ نہ لگ سکا مگر اُردو مشاعروں کا آغاز ۱۹۴۲ء میں بزم ادب کے قیام سے ہوا۔ امیرالدین ہمدم جس کے پہلے صدر تھے۔ پھر ایک انجمن "بزم نوح" قائم ہوئی۔ یہ سلسلہ اب تک برقرار ہے۔ فاضل زیدی اور سید محمد میاں سلیم کے ذاتی کتب خانے بھی ہیں جن میں بعض نادر مخطوطے بھی موجود ہیں [۳۱]

سندھ میں اُردو مطبوعات

سطور ماسبق میں بیان کیا جا چکا ہے کہ ۱۸۵۵ء میں سندھ میں لیتھو پریس موجود تھا جو یقیناً کراچی ہی میں ہوگا۔ اس کی تصدیق انسر امروہوی اپنے ایک مضمون میں کرتے ہیں۔

"اب اُردو صرف بات کا ذریعہ نہیں رہی تھی بلکہ اس کا دامن تصنیف وتالیف کے جواہرات سے بھی بھرا جانے لگا تھا اور اُردو لیتھو پریس بھی جاری ہوگئے تھے۔ "مفتاح باب الحساب" مطبوعہ ۱۸۶۱ء / ۱۲۷۷ھ اور دیوان گویا مطبوعہ ۱۸۶۵ء / ۱۲۸۱ھ دو کتابیں اس دعوے کے اثبات میں پیش کی جا سکتی ہیں" [۳۲]

یہ بیان لیتھو پریس کی موجودگی اور اُردو مطبوعات کے آغاز دونوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ جہاں تک اُردو طباعت کا تعلق ہے، انیسویں صدی میں بعض اور کتابیں چھپنے کا سراغ بھی ملتا ہے جن میں سے ایک کتاب دیوان صورت بہار بھی ہے جس پر تبصرہ کرتے ہوئے بشیر مخفی تحریر کرتے ہیں۔

---

[۳۱] حسب بیان فاضل زیدی نواب شاہ۔

[۳۲] پچیس سالہ رپورٹ انجمن ترقی اُردو کراچی مرتبہ انسر صدیقی صفحہ ۱۲، مطبوعہ ۱۹۶۰ء۔

"میرے کتب خانہ علمیہ" میں حیدرآباد سندھ سے آیا ہوا ایک سندھی اور ہندو شاعر کے اُردو فارسی کلام کا بوسیدہ اور پرانا نسخہ میرے مطالعہ میں آیا جو کتابت اور طباعت کے لحاظ سے خاصا بوسیدہ اور پرانا ہے لیکن اپنی افادی حیثیت سے بہت کارآمد ہے۔

اس کتاب کا نام ہے "پریم تت" معروف بہ صورت بہار۔ شاعر کا تخلص صورت ہے۔ یہ کتاب مطبع ودیا ونود کراچی میں ۱۸۸۱ء میں شائع ہوئی ہے۔۔۔۔۔ غزلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر سندھی زبان اور سندھی بول چال سے بھی لگاؤ رکھتا ہے اور سندھی اُردو کے ملے جلے انداز سے اپنے جذبات کی تصویر اپنے اصلی رنگ ہی میں کھینچتا ہے۔ اس دیوان سے پتہ چلتا ہے کہ آج سے ساٹھ سال قبل بھی سندھ میں اُردو بول چال کے کافی اثرات موجود تھے اور ہندو مسلم باشندے اُردو کو اپنا چکے تھے۔"[۳۴]

جہاں تک پریس کا تعلق ہے وہ صرف کراچی ہی میں نہ تھے، حیدرآباد، شکارپور، سکھر اور دوسرے مقامات پر بھی تھے۔ حیدرآباد کے پریسوں میں سعید آرٹس پریس، محبوب پریس اور ابراہیم پریس کے نام لیے جا سکتے ہیں جن سے بیسویں صدی کے اوائل میں گل عقیدت از کنیز فاطمہ، دیوان حلیم اور انتخاب دیوان حافظ شائع ہونے کا سراغ ملتا ہے۔

شکارپور میں سندھی اور اُردو کی نشر و اشاعت اسی دور یا اس سے قبل کی بات ہے۔ ۱۹۱۰ء میں آریہ اسٹیم پریس کی چھپی ہوئی "سودائے خام از مرزا قلیچ بیگ" بعض کتب خانوں میں موجود ہے جس کو منشی پوکر داس، تھانو داس

---

[۳۴] مضمون "صورت بہار" از بشیر مخفی مشمولہ "ماہ نو" نومبر ۱۹۴۹ء صفحہ ۴۵، ۴۶۔

تاجران کتب شکارپور نے شائع کیا تھا اور آغا حشر کے ڈراموں کی اشاعت تو تاجران شکارپور کی طرف سے ہوتی ہی رہی۔[۳۴]

اسی کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ اُردو کتابیں چھپنے کی رفتار شروع میں بہت سست تھی، کبھی کبھی کوئی کتاب چھپ جاتی تھی یہی صورت سندھی کتابوں کی بھی تھی جو ایک مدت تک باقی رہی، البتہ اُردو کتابوں کی اشاعت انیسویں صدی میں اچانک بڑھ گئی اس کے اسباب میں سیاسیات کو بھی دخل ہے۔ لیتھو پریسوں میں بھی اسی تناسب سے اضافہ ہوا اور پاکستان بننے کے بعد سے تو ہر بڑے شہر میں پریس قائم ہو گئے اور اُردو کتابیں چھپنے لگیں۔

سندھ کی نشر و اشاعت کی تاریخ بادی النظر میں انگریزی دور کے بعد سے شروع ہوتی ہے۔ اس سے قبل جو کتابیں چھپیں وہ باہر سے چھپوائی گئیں ــــ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ پریس کا موجودہ سسٹم سارے ہندوستان میں انگریزوں ہی کا لایا ہوا ہے۔ سندھ میں بھی انگریزوں ہی نے پریس کو رائج کیا لیکن بعض شواہد ایسے پائے جاتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ تالپوری عہد میں سندھ کے بعض مقامات پر دستی پریس موجود تھے۔

کہا جاتا ہے کہ ”پیر حزب اللہ شاہ نے مولوی بہاءُ الدین ساکن نصیر کوٹ (خیرپور ماتھیلہ، سکھر) کو ایک دستی پریس دیا تھا جو مطبع راشدیہ کے نام سے گوٹھ سلطان میرپور ماتھیلہ میں چلتا رہا۔“[۳۵]

---

[۳۴] مضمون ”تقسیم سے پہلے سندھی ڈرامہ“ مشمولہ سندھی ادب نمبر، نئی قدریں حیدرآباد ۱۹۷۳ء۔

[۳۵] تذکرہ پیرانِ پاگارہ صفحہ ۲۲۱ مصنفہ تبسم چودھری مطبوعہ سید سردار علی شاہ بیل خانہ روڈ ٹنڈو ولی محمد حیدرآباد ۱۹۷۰ء۔

ظاہر ہے کہ یہ پریس کیا ہوگا مگر اس سے یہ شہادت تو بہر حال ملتی ہے کہ اہل سندھ میں خود کتابیں چھاپنے کا جذبہ تھا۔ حالات اجازت دیتے تو طباعت کا معیار انگریزی دور سے قبل ہی ایسا ہو سکتا تھا کہ کتابیں چھاپنے کے لیے دلی لکھنؤ یا کسی دوسرے مقام سے رجوع نہ کرنا پڑتا۔ اس کا ثبوت سندھ والوں نے بیسویں صدی میں دے دیا اور آج ان کا معیار طباعت ہندوپاک کے کسی مقام سے کم نہیں۔

اس علاقے کی مطبوعات میں یوں تو ہر زبان کی کتابیں ہیں لیکن زیادہ تعداد سندھی اور اُردو کتابوں کی ہے۔ کراچی کو چھوڑ کر اُردو کتابوں کی گنتی کی جائے تب بھی تعداد ہزاروں سے تجاوز کر جائے گی۔ پچھلے برسوں میں سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سے سندھ کی اُردو مطبوعات پر ایک مقالہ تیار کرایا گیا ہے اور ایک فہرست مرتب کرائی گئی ہے جو "سندھ میں اُردو مطبوعات" کے نام سے ۱۹۷۰ء میں مرکزی اُردو بورڈ لاہور سے شائع ہو چکی ہے۔ مرتبین کتاب عبدالجمیل اور اسلام اختر نے یقیناً بڑی عرق ریزی اور محنت سے کام کیا پھر بھی ۸۵ شعری مجموعے، ۷۷ کتب اسلامیات، ۵۵ نثر کی کتابیں، ۱۷ شخصی تذکرے، ۱۴ ناول ۱۴ تاریخیں، ۷ سائنس اور طب کی کتب، ۱۴ لغات، ۳ جغرافیہ اور ۳ متفرق کتابوں سے زائد کا پتہ نہ لگایا جا سکا — یہ تعداد وقت ترتیب تک کی تمام کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس تعداد کو قطعی نہیں کہا جا سکتا، اس لیے کہ ان کے علاوہ بعض مزید کتابوں کا سراغ لگا ہے۔ ذیل میں نو دریافت کتابوں کی فہرست دی جا رہی ہے۔

"پریم تنت" دیوان صورت بہار مطبوعہ وِدیا ونود پریس کراچی ۱۸۸۱ء۔

"تابش خیال" مجموعہ کلام افسر امروہوی جس میں ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۹ء تک کا کلام شامل ہے۔ ۱۹۲۹ء میں بمقام کراچی طبع ہوا۔

"خم خانہ عشق" منشی مولا بخش ہمدم کا مجموعہ کلام ہے جو ۱۹۲۷ء میں

بمقام کراچی اشاعت پذیر ہوا۔

"پیمانۂ محبت" منشی مولا بخش ہمدم کا مجموعہ کلام جو ۱۹۲۸ء میں بمقام کراچی چھپا۔

"کلیم ادب" منشی مولا بخش ہمدم کا مجموعہ کلام جو ۱۹۳۹ء میں بمقام کراچی طبع ہوا۔

"فروغ بیان" محمد ارشاد حسین شاد صابری کا مجموعہ کلام ہے جو ۱۹۳۱ء میں کراچی میں اشاعت پذیر ہوا۔

"افکار معظم" محمد عمر خلیل کا دیوان جو کراچی میں چھپا۔ اس کے علاوہ خلیل کے تین مجموعے نکات شاعری انجام حق اور ایک واسوخت بھی شائع ہوئے۔

"صدائے مشرق" عبداللہ فائق کی منظومات جو بمقام کراچی ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئیں۔

"دربار سخن" محمد ارشاد حسین شاد صابری نے شعرائے کراچی کا تذکرہ لکھا تھا۔ جو ۱۹۴۷ء تک نہ چھپ سکا تھا۔۔۔۔ بعد کی تحقیق سے پتہ چلا کہ اس کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں ممتاز حسن مرحوم، پیر حسام الدین راشدی اور فاضل زیدی کے پاس موجود ہیں۔

"مجموعہ غزلیات" ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۵ء میں منعقد ہونے والے مشاعروں کا انتخاب انجمن ترقی اُردو کراچی کی جانب سے شائع ہوا۔

"نیرنگِ سخن" ۱۴۔ اگست ۱۹۲۷ء کے خالق دینا ہال کراچی کے مشاعرہ کا انتخاب جو انجمن ترقی اُردو کراچی کی طرف سے شائع ہوا۔

"صہبائے حقیقت" غلام حسین فروغ کا مختصر مجموعہ کلام جو کراچی میں شائع ہوا۔

"کلام فروغ" غلام حسین فروغ کا مختصر مجموعہ کلام جو کراچی میں شائع ہوا۔

"دیوان صورت بہار"۔ مطبوعہ حیدر آباد (سندھ) ۱۹۳۵ء

"کلیات ناز" میر علی نواز خاں والی خیر پور کا مجموعہ کلام جس کو نسیم امروہوی نے مرتب کیا اور ادارہ سہ روزہ مراد خیر پور میرس سے ۱۹۶۶ء میں شائع کرایا۔

دواوین فارسی جن میں اُردو کلام بھی شامل ہے اور جو سندھی ادبی بورڈ حیدر آباد سے شائع ہوئے۔

دیوان عطا (عبدالحکیم عطا ٹھٹھوی) مرتبہ محمد رشید برہانپوری ۱۹۵۶ء

دیوان عظیم (عظیم الدین عظیم ٹھٹھوی) مرتبہ پروفیسر غلام مصطفیٰ خاں ۱۹۶۲ء

دیوان غلام (نواب غلام محمد لغاری) مرتبہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ ۱۹۵۹ء

مجموعہ ہائے کلام سندھی جن میں اُردو بھی شامل ہے۔

کلام بلبل (شمس الدین بلبل) مرتبہ غلام محمد گرامی ۱۹۶۹ء

کلیات گدا (غلام محمد گدا) مرتبہ رشید احمد لاشاری ۱۹۵۶ء

کلیات کمال (کمال فقیر) مرتبہ اظہر گیلانی ۱۹۶۷ء

کلیات حمل (حمل خاں لغاری) مرتبہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ ۱۹۵۳ء

دیوان قلیچ (مرزا قلیچ بیگ) مرتبہ میرزا اجمل بیگ ۱۹۵۹ء

کلیات سانگی (میر عبدالحسین سانگی) مرتبہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ ۱۹۶۹ء

کلام نواب ولی محمد لغاری مرتبہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ ۱۹۶۸ء

سفر نامہ ایران پیر اسحاق جان سرہندی ۱۹۶۰ء مطبوعہ سندھ یونیورسٹی

مینائے مصطفیٰ پیر مصطفیٰ اصبغت اللہ شاہ ۱۹۶۰ء مطبوعہ حیدر آباد

"پچیس سالہ روئداد انجمن ترقی اُردو کراچی" مرتبہ افسر صدیقی مطبوعہ فائن آرٹ لیتھو ورکس کراچی، ۱۹۴۰ء

"پچیس سالہ رپورٹ مشاعرہ کمیٹی انجمن ترقی اُردو کراچی" مرتبہ رضا ہمدانی مطبوعہ فائن آرٹ لیتھو ورکس کراچی ۱۹۴۰ء

۱۹۷۰ء کے بعد چند سال تک سندھ میں اُردو کتابوں کی نشر و اشاعت ماضی کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی رہی پھر رفتار قدرے سُست پڑ گئی — تاہم اشاعت کا سلسلہ حیدرآباد تک محدود نہ رہا۔ خیرپور اور دوسرے مقامات پر بھی کتابیں چھاپی گئیں جن میں ناول، افسانے، تذکرے، تاریخیں، ادبیات اور اسلامیات وغیرہ سب شامل ہیں۔ ان سب کی فہرست بنائی جائے تو سندھ کی اردو مطبوعات کی ایک دوسری جلد تیار ہو سکتی ہے۔

"جیسا میں نے دیکھا" جی ایم سید مطبوعہ سید اینڈ سید پبلشرز کراچی ۱۹۷۳ء

"ادبی رشتے لسانی رابطے" مرتبہ اختر انصاری اکبرآبادی مجلس ادب حیدرآباد ۱۹۷۶ء

"سندھی ادب نمبر" نئی قدریں حیدرآباد مرتبہ اختر انصاری اکبرآبادی ۱۹۷۳ء

"موج موج مہران" مترجمہ الیاس عشقی حیدرآباد

سندھ میں اردو کی قلمی کتابیں

قلمی کتابوں کا مکمل سراغ لگانا خاصا مشکل کام ہے کوئی شخص اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ کوئی کتاب رہ نہیں گئی کیونکہ اکثر کتابیں افراد کی ملک ہوتی ہیں اور یہ افراد معروف بھی ہو سکتے ہیں اور غیر معروف بھی۔ ممکن ہے کہ تحقیق کی مہم میں لوگ غیر معروف افراد تک پہنچ نہ سکیں اور چھوٹے بڑے مقامات پر پڑے ہوئے مخطوطے علم میں نہ آ سکیں۔

پچھلے برسوں میں سندھ یونیورسٹی حیدرآباد میں اس نوع کا تحقیقی کام کیا گیا تو نظم میں ۳ کلیات، ۲۰ دواوین، ۹۳ مثنویات، ۱۱ مراثی، ۲ قصائد، ۱۱ مناجات، ۱۹، اسلامیات اور ۱۳ متفرقات اور نثر میں ۲۵، اسلامیات، ۱۸، ادبیات، ۴ تاریخیں، ۸، کتب علم ہیئت و نجوم، ۸، طب و کیمیا، ۲، موسیقی اور ۶ متفرق کتابوں سے زیادہ منظر عام پر نہ آ سکیں۔

حالیہ تحقیق میں جن قلمی کتابوں کا پتہ لگا ہے، ان کی ایک فہرست ذیل میں پیش

کی جارہی ہے :-

۱- مجموعہ کلام روحل، مراد اور دوسرے خاندانی شعراء
ملکیت فقیر غلام علی کنڈڑی

۲- دیوان و بیاض میر ضیاءالدین ضیاء ملکیت سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد

۳- قاسم نامہ مجموعہ کلام فارسی و اردو قاسم ہالائی
ملکیت ڈاکٹر نبی بخش بلوچ

۴- مجموعہ کلام محمد یوسف فقیر	بحوالہ "سندھ میں اردو شاعری" صفحہ ۸۵ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۰ء
۵- قلمی بیاض نواب غلام شاہ لغاری	بحوالہ سندھ میں اردو شاعری صفحہ ۹۰ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۰ء
۶- دیوان اردو میر حسین علی خان حسین دیوان فارسی و اردو میر حسین علی خان حسین	بحوالہ سندھ میں اردو شاعری صفحہ ۱۱۴ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۰ء
۷- مجموعہ کلام مرزا فتح علی بیگ	خاندان مرزایان ٹنڈو آغا حیدرآباد
۸- دیوان قاضی غلام علی جعفری	سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد
۹- مجموعہ کلام نواب غلام اللہ خان لغاری	بحوالہ "سندھ میں اردو شاعری صفحہ ۱۴۴ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۰ء
۱۰- دیوان حاتم اردو	ملکیت مرزا اسد بیگ حیدرآباد
۱۱- دیوان مرتضائی	بحوالہ "سندھ میں اردو شاعری" مطبوعہ سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۰ء
۱۲- بیاض مرزا گل حسن احسن کربلائی	بحوالہ "سندھ میں اردو شاعری" مطبوعہ سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۰ء
۱۳- کلام قاسم علی بیگ	خاندان مرزایان ٹنڈو آغا حیدرآباد
۱۴- قلمی بیاض عباس علی بیگ	مرزا اسد بیگ بن مرزا قلیچ بیگ حیدرآباد

۱۵۔ دیوان غزلیات
کلیات مراثی
مختار نامہ
حملہ حیدری
سفرنامہ کربلا
} بڈھل بیگ — میرزا عباس علی بیگ ٹنڈو آغا حیدر آباد

۱۶۔ مجموعہ غزلیات کلیم اللہ شاہ — میرزا عباس علی بیگ ٹنڈو آغا حیدر آباد

۱۷۔ شوق افزا، دیوان محمود صابر — بحوالہ۔ "سندھ میں اُردو شاعری" صفحہ ۱۱ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی ۱۹۷۰ء

۱۸۔ عین المتانتہ تحقیق تکرار الجماعتہ — پیر راشد اللہ شاہ
ذاتی کتب خانہ پیر جھنڈو

۱۹۔ الفارقہ بین اہل اللہ وبین المارقہ — پیر راشد اللہ شاہ
ذاتی کتب خانہ پیر جھنڈو

۲۰۔ البلاغ التحقیق بالتحقیق العمیق — پیر فضل اللہ شاہ
ذاتی کتب خانہ پیر جھنڈو

۲۱۔ المقالتہ المحبوبہ فی الدعا بعد الصلوٰۃ المکتوبہ — پیر فضل اللہ شاہ
ذاتی کتب خانہ۔ پیر جھنڈو

۲۲۔ خطبہ صدارت — پیر محب اللہ شاہ
ذاتی کتب خانہ۔ پیر جھنڈو

۲۳۔ الدلیل التیام علی ان سنتہ المصلی الوضع تحت القیام — پیر بدیع الدین شاہ
ذاتی کتب خانہ۔ پیر جھنڈو

۲۴۔ تنقید السدید بر رسالہ اجتہاد وتقلید — پیر بدیع الدین شاہ
ذاتی کتب خانہ۔ پیر جھنڈو

۲۵۔ نشاء العبد — پیر بدیع الدین شاہ
ذاتی کتب خانہ۔ پیر جھنڈو

۲۶- بدیع الفتاوٰی — پیر بدیع الدین شاہ
ذاتی کتب خانہ - پیر جھنڈو

۲۷- مجموعہ فتاویٰ قاسمیہ — مولانا محمد قاسم
مدرسۂ ہاشمیہ گڑھی یٰسین

۲۸- مجموعہ فتاویٰ ناظمی — مولانا محمد ابراہیم
مدرسۂ ہاشمیہ گڑھی یٰسین

اس سلسلۂ تحقیق کا اہم ترین مخطوطہ بھگوت گیتا کا فارسی اور اُردو ترجمہ ہے جو شاہ ولی اللہ اور زٹیل کالج منصورہ میں محفوظ ہے۔ یہ مخطوطہ مول رام ولد انند رام مہتہ ساکن سیہون کا مترجمہ ہے۔ ترجمہ کا اختتام ۲۵۔ ذوی الحج ۱۱۹۵ھ کو ہوا اس طرح اس کو دو سو سال پورے ہو گئے۔

مذکرہ مخطوطات دواوین کے علاوہ تالپور خاندان کے عظیم کتب خانہ میں قلمی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ ہے جن میں عربی فارسی اور سندھی کے علاوہ اُردو مخطوطے بھی ہیں۔

"ٹنڈو میر نور محمد کا کتب خانہ اگرچہ بڑی سقیم حالت میں ہے۔ اس کے نوادرات انگریزوں کے ہاتھوں لٹ چکے ہیں۔ کتابوں کی ایک بڑی تعداد میران تالپور اپنے ساتھ کلکتے بھی لے گئے تھے پھر بھی ماضی کے باقیات الصالحات میں جو کچھ ہے اس سے سندھ کی علمی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔

ان میں سے بعض قلمی نسخے آج بھی نوادر روزگار ہیں۔ فارسی اور اُردو دواوین میں دیوان امیر خسرو، دیوان عالم، دیوان حسن دہلوی، دیوان جرأت دیوانِ پیام، دیوان اسیر، دیوان سودا، دیوان انشاء، دیوان نیازی، دیوان جعفر زٹلی، دیوان جویا، دیوان ناظم وغیرہ شامل ہیں۔ نثر کی بھی بعض کتابیں ہیں۔

میرانِ سندھ اور ان کے شاہزادے عموماً اُردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ ان سب کے قلمی دواوین بھی موجود ہیں جن میں میر کرم علی خاں کرمؔ۔ میر نصیر خان

جعفری اور بعض دوسروں کے دواوین قدرے ضخیم ہیں جو سندھ کا قلمی سرمایہ ہیں اور حکومت و عوام دونوں کے لیے قابل توجہ ہیں۔ [1]

قلمی کتابوں میں ایک لحاظ سے ان مقالات کے مسودے بھی شامل ہیں جو سندھ یونیورسٹی میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کے لیے لکھوائے گئے اور جن کے چھپنے کی نوبت اب تک نہ آ سکی۔ یہ مسودے ایک اندازے کے مطابق ڈیڑھ سو ضرور ہوں گے جن میں چند پی ایچ ڈی کے غیر مطبوعہ مقالے بھی ہیں۔

---

[1] ماخوذ از مضمون امیروں کے کتب خانے، ڈاکٹر ممتاز پٹھان مشمولہ سندھی ادب نمبر نئی قدریں حیدر آباد صفحہ ۳۰۰ سنہ ۱۹۶۳ء

سندھ میں اردو شاعری

قیامِ پاکستان سے پہلے

اُردو شاعری کا آغاز بھی، زبان کی ابتداء کی طرح، ہنوز ماضی کے دھندلکوں میں چھپا ہوا ہے۔ پہلا شعر کب، کہاں اور کس نے کہا؟ اس کی نوعیت کیا تھی؟ ایسی تمام باتیں اب تک جواب کی محتاج ہیں۔

اس سلسلۂ تحقیق میں سندھ بھی ہندوستان کے دوسرے حصّوں سے مختلف نہیں۔ اس سرزمین کا ماضی بھی ایک لسانی بھول بھلیاں ہے جس کے پیچ و خم میں اُردو شاعری کی جڑیں کریدنے سے بہت دور جاکر ایک نام میر فاضل بھکری کا ملتا ہے جو سندھ کے شہرۂ آفاق مورخ میر معصوم بھکری کے بھائی تھے اور جن سے دسویں صدی ہجری میں اُردو شعر گوئی کی روایت منسوب ہے۔

"ہندی زبان کی کافیاں کہنے میں انہیں خاص ملکہ تھا اور ان کی کافیوں کو خاصی مقبولیت حاصل تھی۔" [۱]

دوسرا نام عبدالکریم بلڑی کا لیا جاتا ہے جو شاہ لطیف کے جدِاعلیٰ تھے اور جن کے صرف ایک شعر کا سراغ لگ سکا ہے۔

اے سجنا، گانٹھ پریم کی پڑی جو کسی بھر
یہ کھولے کھلی نہیں، سب جگ رہا ایدھر [۲]

---

[۱] "ذخیرۃ الخوانین" صفحہ ۲۰۱ تا ۲۰۳ مطبوعہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی ۱۹۶۱ء
"تذکرہ شعرائے سکھر" صفحہ ۱۷۔۱۸ از میمن عبدالمجید سندھی مطبوعہ سندھی ادبی سوسائٹی اسلامیہ کالج سکھر ۱۹۶۹ء

[۲] "تاریخ شعرائے سندھ" از ہدایت علی تارک مترجمہ محمد حفیظ الرحمٰن صفحہ ۱۶ مطبوعہ عزیز المطابع بہاولپور ۱۹۳۵ء
"رسالو شاہ عبدالکریم" از میر محمد نظامانی صفحہ ۱۲ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی پریس حیدرآباد ۱۹۶۵ء

مگر اس شعر کو بدیہی طور پر اُردو کا شعر کہا نہیں جا سکتا پھر شاہ کریم کی اُردو شاعری کی مزید شہادتیں بھی نہیں ملتیں لہٰذا اس سرزمین پر اُردو شاعری کا آغاز اس باکمال سے کیا جاتا ہے جس نے گیارھویں صدی ہجری سے بارھویں صدی کے اوائل تک باقاعدہ اُردو میں شاعری کی، جو ملا عبدالحکیم ٹھٹھوی کے نام سے معروف ہے، جس کے بعد اُردو شاعری کا سلسلہ عہد بعہد آگے بڑھتا ہے اور دور حاضر سے جا کر مل جاتا ہے۔

اس موقع پر یہ حقیقت پیش نظر رکھنا ضروری ہوگا کہ اہل سندھ کی ادبی زبان فارسی تھی۔ ثقہ لوگ گفتگو بھی اسی میں کرتے تھے پھر سندھی کا نمبر تھا۔ ہندی یا اُردو اس کے بعد کی زبان تھی جس کے برعکس ہندوستان کے دوسرے حصوں میں اُردو کا درجہ ثانوی تھا پھر بھی ادوار کے لحاظ سے سندھ کے شاعروں کا تقابل دکن یا دلی والوں سے کیا جائے تو سندھ کی ریختہ گوئی تحیر خیز ہے اور جب اُردو نے شمالی ہند اور دکن میں نمایاں حیثیت حاصل کر لی تو سندھ میں اس کے مقابلے کی زبان سندھی قرار پائی مگر اس محرومی کے باوجود سندھ کی ادبی بساط پر اردو شاعری پروان چڑھتی رہی۔

اس کے اسباب پر مختلف عنوانوں کے تحت روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ سردست اتنا ہی کہہ دینا کافی ہوگا کہ سندھ والوں کی حب الوطنی اور جذبہ اخوت نے گوارا نہ کیا ہوگا کہ اتفاق واتحاد کے اس پرچم کو اپنی سرزمین پر بلند نہ کریں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اہل سندھ ہمیشہ سے اُردو کتابوں کو ذوق وشوق سے پڑھتے تھے اور سندھی شاعروں میں کسی کو سندھ کا حالی اور کسی کو سندھ کا اکبر کہہ کر ایک طمانیت قلب محسوس کرتے تھے۔ اخوت کے اسی جذبے نے یقیناً انہیں مجبور کیا ہوگا کہ وہ اُردو میں بھی جودت طبع کے جوہر دکھائیں۔ نتیجے میں آج جب سندھ کے اُردو شعراء کا جائزہ لیا جاتا ہے تو ان کی تعداد قدرے کم سہی لیکن معیار شاعری میں ان کا کلام سبک نہیں ٹھہرتا۔ ان شاعروں میں ایسے بزرگ بھی مل جاتے ہیں جن کی

استادانہ حیثیت فارسی اور سندھی کے دوش بدوش اُردو میں بھی مسلم تھی۔

شعراء کی ایک تعداد ایسی بھی ہے جس کے پورے حالات معلوم نہ ہو سکے۔ صرف نمونۂ کلام مل سکا۔ بعض شاعروں کے حالات کا سراغ لگا تو نمونۂ کلام دستیاب نہیں ہوا جیسے مخدوم عبدالکریم جو مخدوم غلام حیدر کے بیٹے تھے، ۱۲۷۳ھ میں جان بحق ہوئے، اردو کے اچھے شاعر تھے [۵۳]

غلام حسین سبز پوش جو شروع میں افضل تخلص کرتے تھے، بعد میں اسدؔ کے نام سے شعر کہے، ۱۲۸۷ھ میں فوت ہوئے۔ [۵۴]

موتیل شاہ جو تیرھویں صدی ہجری کے اواخر کے شاعر تھے۔ فارسی، سندھی اور اُردو میں منقبتیں اور مرثیے کہتے تھے۔ منشی دھنپت رائے بیکس، قاضی محمد ہاشم مخلص، شیر علی خاں اسد، سعداللہ نیازی، ولی محمد ولی، ولیم برویٹ ولیم، میر غلام حیدر تاب، میر بخش اثر، محمد منیر منیر، حیدر علی افسر، انعام اللہ سالک، سیٹھ محمد اسمٰعیل مغموم وغیرہ وغیرہ۔ [۵۵]

خود مخدوم محمد ابراہیم خلیل مولف تکملۂ مقالات الشعراء کے صاحبزادے مخدوم محمد زماں حبیب بھی اسی تعریف میں ہیں۔ وہ فارسی اور اُردو میں اپنے پدر عالی مقام کے شاگرد تھے، ۱۳۰۶ھ میں جان بحق ہوئے۔

بعض شاعر ایسے بھی ہیں جن کا کوئی ایک شعر ہی دستیاب ہو سکا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ معلوم نہ ہو سکا جیسے ابراہیم شاہ صوفی کا یہ شعر ؎

جسے دن سوں سجن بچھڑا، مرا دل جب سے ہے جل جل
وداع کی آگ بجلی سوں اَبرِ چشماں بہاراں ہے [۵۶]

---

[۵۳] "سندھ میں اردو شاعری کا ارتقاء" از معراج نیر صفحہ ۱۰۹ مطبوعہ الحمرا اکیڈمی لاہور ۱۹۷۳ء

[۵۴] "سندھ اردو شاعری کا ارتقاء" از معراج نیر ۱۰۹ مطبوعہ الحمرا اکیڈمی لاہور ۱۹۷۳ء

[۵۵] "سندھ کے اُردو شاعر" از افسر صدیقی صفحہ ۹۱ رسالہ اُردو جولائی ۱۹۳۶ء اورنگ آباد دکن۔

[۵۶] "سندھ میں اردو شاعری کا ارتقاء" از معراج نیر صفحہ ۱۱۰ مطبوعہ الحمراء اکیڈمی لاہور ۱۹۷۳ء

ایک شعر بہادر سندھی کا بھی اسی طرح کا ہے۔

؎ اتنی نظر مہر کی کرتے بہادر او پر
پان کا بیڑا صنم تم نے کھلایا ہی نہیں ۵۷

ایسے ہی اور بھی بہت سے نام ہوں گے جو وقت کے تدریجی ارتقاء کے ساتھ منظر عام پر آئیں گے اور مستقبل کے محققین ان کے حالات کو بے نقاب کریں گے۔

سلسلۂ بیان میں سندھ کے ان شعرائے کرام کے نام نہ لینا حق ناشناسی ہو گی جن کی سندھی تخلیقات میں اُردو کے مصرعے اور شعر بلا ارادہ آ گئے ہیں اور جو اُردو کے بجائے سندھی ادب کا جزو ہیں۔ ان شعراء میں شاہ بھٹائی سر فہرست ہیں۔ ظاہر ہے کہ شاہ کا شمار کسی طرح اُردو شاعروں میں نہیں ہو سکتا لیکن نمونے کے طور پر چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔ کیا انہیں اُردو کے شعر کہا نہیں جا سکتا؟

؎ وحدتا کثرت بھی کثرت وحدت کل حق حقیقی ہیکڑوں لولی بی بھل

بلبل روئے رین دن کہاں بھی گلزار ان کی قیامت آج ہے جنکے بچھڑے یار

لا الہ کو آرسی الا اللہ سے دیکھ محمد صورت رب کی اس بیں بین نہ میکھ

شاہ کے بعض اشعار پر اُردو کی اس چھاپ کا اثر غالباً یہ تھا کہ سندھ کے بعض دوسرے گھرانوں کی طرح اُردو ان کے گھر میں بھی بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ ۵۸

اصولی طور پر اس برگزیدہ اور عظیم شاعر کو اُردو کے دامن میں جگہ دے کر سطح شاعری کو گرانقدر کرنا چاہیئے تھا جیسا کہ پروفیسر معین الدین دردائی نے "صوفیائے

---

۵۷ "سندھ میں اردو شاعری کا ارتقاء" از معراج نیر صفحہ ۱۱۰ مطبوعہ الحمرا اکیڈمی لاہور ۱۹۷۳ء

۵۸ "اُردو پر قدیم سندھی کا اثر" از ڈاکٹر اسد اللہ شاہ حسینی مشمولہ سندھی ادب نمبر صفحہ ۳۵، نئی قدریں حیدر آباد ۱۹۶۳ء

"شاہ عبد اللطیف بھٹائی" از عبد الواحد سندھی مشمولہ ماہ نو کراچی صفحہ ۵۰، جنوری ۱۹۵۱ء

سندھ اور اُردو" میں کیا ہے لیکن شاہ نے جو کچھ کہا ہے وہ حقیقتاً سندھی ہی میں اور اس مقالے میں صرف اُردو کا ارتقاء مدِ نظر ہے اس لیے تذکرہ صرف انہیں شاعروں کا کیا جارہا ہے جنہوں نے اُردو ہی میں کہا، اُردو رسم الخط میں قلم بند کیا اور جو واقعی میر فاضل بکھری سے ہمرشتہ ہو کر دورِ حاضر کے شعراء کے لیے ایک اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔

سندھی شعراء کا ایک گروہ وہ بھی ہے جس نے ... بحور و اوزان میں شاعری کی اور اپنے عہد کے مروجہ اُردو الفاظ کثرت سے استعمال کئے تذکرہ نگاروں نے انہیں اُردو شاعری کے دامن میں جگہ دی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ان کی شاعری کا مزاج اُردو سے بہت قریب ہے۔ موضوع اور فلسفہ بھی اُردو اور فارسی کا ہے لیکن پیمانہ شعر ہندی کا ہے جیسے روحل فقیر، مراد فقیر، شاہو خاں زنگیجہ، فقیر غلام علی، قنبر علی شاہ بھاڈائی، نظر علی زنگیجہ، دریا خاں زنگیجہ، نواب غلام شاہ لغاری، مہدی شاہ بخاری، غلام اللہ خاں لغاری، سوبھا فقیر لغاری، قطب الدین شاہ وغیرہ [۹]

ان سب کی شاعری میں اسلامی عنصر غالب ہے بالخصوص روحل کو تو فلسفہ وحدت الوجود میں کبیر کا تیز رو اور سچل سرمست کا پیش رو کہا جاتا ہے لیکن روحل اور ان کے تمام جانشینوں نے دوہے، چھند، شبد، کافیاں، چوپائیاں وغیرہ نظم کی ہیں [۱۰] جو کسی طرح اُردو شاعری کی تعریف میں نہیں آتیں۔ یہی صورت لغاری شعراء کی بھی ہے۔ بلاشبہ ان کی شاعری میں بعض مقامات پر اُردو کا مزاج اتنا غالب ہے کہ اس کو اُردو کہہ دینے کو جی چاہتا ہے مگر مجبوری یہ ہے کہ وہ ہے ہندی ہی لہٰذا ایسے شعرائے کرام کو نظر انداز کر کے انتخاب صرف

---

[۹] ماخوذ از "سندھ میں اُردو شاعری" مولفہ ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدر آباد ۱۹۷۰ء

[۱۰] بحوالہ "سندھ میں اُردو شاعری" مولفہ ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدر آباد ۱۹۷۰ء

ان کا کیا گیا ہے جنہوں نے صرف اُردو کے اسلوب میں اُردو شاعری کے کاروان کو آگے بڑھایا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض کے اشعار میں سندھی لفظ داخل ہو گئے ہیں جو علاقائی لحاظ سے کہیں تو لطف دیتے ہیں اور کہیں ان کو روا رکھنا ناگزیر ہے۔

ملا عبدالحکیم عطاؔ ٹھٹھوی

حضرت عطاؔ کا زمانہ آخر عہد شاہ جہانی سے دور محمد شاہی تک ہے سنہ پیدائش کا اندازہ ۱۰۵۰ھ بمقام ٹھٹھہ کیا جاتا ہے۔ آپ کا خاندان علم و فضل اور زہد و اتقاء میں ممیز و ممتاز تھا۔ آپ کے والد اپنے وقت کے جید عالم اور مقبول شاعر تھے لہٰذا آپ بھی تعلیم سے فراغت پاتے ہی شعر و سخن کی طرف راغب ہو گئے۔

عطاؔ جہاں ایک متبحر عالم تھے وہاں یاد الٰہی اور نعت رسالت پناہی میں بھی جواب نہ رکھتے چنانچہ پورے تیس سال دن کے روزے اور رات کی عبادت میں گزار دئے۔ تزکیہ نفس کا یہ عالم تھا کہ جو وضو عشاء کی نماز کے لیے کرتے، اسی سے فریضۂ فجر ادا کرتے۔ ساری رات نعت و منقبت لکھنے میں گزار دیتے اس طرح آپ نے ایک لاکھ شعر پورے کر دئے۔ [۱]

ان کا شمار اپنے وقت کے اللہ والوں میں ہوتا تھا۔ ہمیشہ سبز لباس زیب تن رکھتے جو آل رسول کی تاسی کی علامت تھا۔ عوام و خواص آپ کے بڑے معتقد تھے اور شاعرانہ سکہ تو پورے ملک پر بیٹھا ہوا تھا۔

فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے جس پر آپ کو ناز بھی تھا۔ قدردانی کی تمنا جو ہر شاعر کو ہوتی ہے، عطاؔ کا دل بھی اس سے خالی نہ تھا۔ آخر ان کی یہ تمنا پوری ہو کر رہی، نواب مظفر خاں احسن ۱۰۶۳ھ میں جب ٹھٹھہ کا گورنر ہو کر آیا تو

---

[۱] تحفۃ الکرام از علی شیر قانع مترجمہ اختر رضوی ص ۴۳۲ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد سنہ ۱۹۵۹ء

عطا کا جوہر قابل اس کی مبصر نگاہ سے چھپا نہ رہا۔ اس نے آپ کی سرپرستی کی اور ہمیشہ کرم فرمائیوں سے نوازتا رہا جس سے اطمینان کی زندگی میسرآ گئی۔ لقمان کی عقل پہلے ہی سے موجود تھی۔ دونوں نے مل کر عطا کے حسن سخن میں وہ چکا چوند پیدا کر دی کہ سرزمین سندھ کے ذرّوں کی آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔

عطا نے اردو میں بھی مشق سخن کی ہے جس کو قلمی فارسی دیوان سے علیحدہ کر کے سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد کی طرف سے شائع کر دیا گیا ہے۔

فطرت سے آپ کو ایک حسّاس طبیعت، غیرت مند دل و دماغ اور جاگتا ہوا ضمیر ملا تھا جس پر ماحول کی ہر بات کا اثر ہوتا تھا۔ نتیجے میں آپ صوفی شاہ عنایت کی شہادت سے بھی متاثر ہوئے اور اس بدامنی اور معاشرے کی بدحالی سے بھی جو عالمگیر کے بعد سارے ملک میں رونما ہوئی تھی۔ تاثر میں اردو کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اے مسلمان وطن بیداد ہے — جور ہے، بیداد ہے، فریاد ہے
آشنا بیگانہ یار اغیار گشت — خود حقوق باہمہ برباد ہے
جز سکوت و شکر جائے شکوہ نیست — کار بے اصلاح پر افساد ہے

غزل کے چند اشعار نمونے کے طور پر درج کئے جاتے ہیں۔

"عطا" اس بھوک سوں ہم لوک رہتا — ز خوردن ساگ لونی سوک رہتا
مری جاں دیکھنا پھر دکھ نہ دینا — کہ محتاج تو کئے مغلوک رہتا
ز خود خون جگر پیتا و جیتا ! — بر درد و داغ ہم آغوش رہتا
زبا افراط افطار فقیراں — کیوں رجنا بہ آدھی بھوک رہتا
ترا پیوستہ جشن است و مرا فقر — نہ یاد از گریۂ صعلوک رہتا

جو دسے سدھار جاگ کیا نیند باپلے
صد بار ہار نا نہ کبھی داؤ جیتنا

ہشیار کھیلنا، دکھ اپنا نہ سوجھنا
سب چھوڑنا نہ مال پر ایا سمیٹنا[۲۱۲]

ان شعروں سے وقت اور زمانے کے لحاظ سے شاعر کی قدرت کلام کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ زمانہ ولی و دکن میں ولی، برہمن، اور فائز کا تھا۔ ان کے کلام سے عطا کے اشعار کا موازنہ کیا جائے تو ماحول کے فرق کے سوا شعر کی منزلت میں کوئی کمی نظر نہ آئے گی۔ اول الذکر شعراء کے وہاں دکن و دلی کے مروج الفاظ ملیں گے اور عطا کے شعروں میں ہندی، سندھی اور فارسی کی گنگا جمنی شان جو کبھی بابا فرید گنج شکر اور امیر خسرو کے کلام میں پائی جاتی تھی البتہ ایک حقیقت عطا نے اپنے کلام سے اور ثابت کی ہے وہ ہے "سندھی ریختہ" کی حقیقت جو اردو کی اساسی حیثیت میں ایک اضافہ ہے۔

جعفر علی بے نوا (بارھویں صدی ہجری نصف اول)

میر علی شیر قانع نے نواب مہابت خاں کاظم کے دور میں ٹھٹھہ آنا تحریر کیا ہے اور ان کا وطن ہندوستان بتایا ہے[۲۱۳]۔ لیکن افسر امروہوی کی تحقیق ہے کہ وہ سندھ ہی کے رہنے والے تھے۔ کسی وجہ سے دلی گئے تھے وہاں ایک عرصہ قیام کر کے سندھ واپس ہو گئے۔

فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ نمونے میں ایک شعر میر قانع نے درج کیا ہے افسر امروہوی انہیں خان آرزو کا معاصر اور اردو کا اچھا شاعر بتاتے ہیں۔ نمونۂ کلام میں ایک مقطع دریافت ہو سکا ہے۔

بے نوا ہوں زکوٰۃ حسن کی دے
او میاں مالدار کی صورت![۲۱۴]

---

[۲۱۲] ماخوذ از دیوان عطا مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد ۱۹۵۷ء

[۲۱۳] مقالات الشعراء صفحہ ۱۵ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد ۱۹۵۷ء

[۲۱۴] "سندھ کے اردو شاعر" از افسر صدیقی مشمولہ رسالہ اردو ۱۹۳۷ء اورنگ آباد دکن۔

مخدوم محمد معین بیراگی

مخدوم محمد معین بن مخدوم محمد امین اپنے دور کے جلیل القدر علماء میں تھے۔ آپ کو مخدوم شاہ عنایت اللہ سے تلمذ حاصل تھا۔

مخدوم معین کے والد مخدوم محمد امین موضع والی کے رہنے والے تھے لیکن وہاں کی سکونت ترک کر کے ٹھٹھہ میں آبسے تھے۔ یہیں مخدوم معین کی پرورش ہوئی اور یہیں آپ علم و فضل میں کمال حاصل کر کے علامہ وقت بن گئے۔

آپ کو میاں ابوالقاسم نقشبندی سے ارادت تھی لیکن تصوف میں خود آپ کا یہ درجہ تھا کہ آپ کے وصال سے قبل شاہ لطیف نے اپنے گاؤں میں فرمایا کہ چلو، اپنے یار کے آخری دیدار کے لیے چلیں۔ چنانچہ آپ آئے اور مخدوم کے ساتھ بزم سماع میں شریک ہوئے۔ عین گرمیِ محفل میں مخدوم وارفتہ و سرشار اندر اُٹھ گئے اور اسی وقت جاں بحق ہو گئے۔

اشعار محققانہ کہا کرتے تھے، فارسی میں تسلیم اور ہندی میں بیراگی تخلص کرتے تھے۔ [۱۵]

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ میر محمود صابر کے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ

> "یہ وہ وقت تھا کہ مخدوم محمد ہاشم (متوفی ۱۱۷۴ھ) اور مخدوم محمد معین (متوفی ۱۱۶۱ھ) جیسے نامور علماء اور محسن جیسے سربرآوردہ شعراء علم و فن کی محفلیں گرما رہے تھے۔ اُردو شاعری میں مخدوم محمد معین ممتاز تھے اور بیراگی تخلص کرتے تھے، گیت اور دوہوں میں بھی خاص دسترس رکھتے تھے۔ محسن کو فارسی شاعری میں کمال حاصل تھا۔" [۱۶]

---

[۱۵] تاریخ سندھ حصہ دوم صفحہ ۵۵۵ از اعجاز الحق قدوسی مطبوعہ مرکزی اُردو بورڈ لاہور ۱۹۷۴ء
تاریخ سندھ عہد کلہوڑہ صفحہ ۹۰۰ از غلام رسول مہر مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد ۱۹۵۸ء

[۱۶] سندھ میں اُردو شاعری صفحہ ۱۰ از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۷۰ء

میر حیدر الدین ابوتراب کامل

میر حیدر الدین ابوتراب کامل کا تعلق ٹھٹھہ کے امیر خانی سادات سے تھا۔ آپ کے والد رضی الدین فدائی اور دادا میر ابوالمکارم شہود اپنے وقت کے جید عالم اور فارسی کے باکمال شاعر تھے۔ حیدر الدین کامل نے گیارھویں صدی ہجری کے اسی ماحول میں آنکھیں کھولیں۔ علم و فضل اور شعر و شاعری انہیں ورثے میں ملی تھی جس میں فقر و تصوف نے چار چاند لگا دئے۔

آپ کے اب وجد حکومت سندھ کے اعلیٰ مناصب پر فائز رہے تھے۔ لیکن آپ کا میلان شروع ہی سے فقر و درویشی کی طرف تھا لہٰذا آپ نے تجرد، عسرت اور مسکینی کو اپنا شعار بنا لیا۔ تقویٰ و ایمان آپ کا طرۂ امتیاز تھا۔ اہل اللہ اور اہل دل کی محبت کو آپ سرمایہ فیض تصور کرتے تھے لہٰذا عوام و خواص سب ہی آپ سے ارادت رکھتے۔ بعض امراء و رؤسا تو آپ کی خدمت کو ذریعہ نجات تصور کرتے لیکن آپ نے دنیا کی طرف کبھی توجہ نہ کی اور قناعت کی زندگی بسر کرتے رہے۔

عبادت، ریاضت تبلیغ دین، قرآن و حدیث کی درس و تدریس کامل کے مشاغل میں داخل تھی مگر بیشتر وقت اعتکاف و استغراق میں گزرتا تھا اور اس کیفیت میں اکثر آپ سے کرامتیں ظاہر ہو جاتی تھیں۔ ۱۱۴۴ھ میں آپ نے انتقال فرمایا اور "اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ جَنّٰت" سے میر علی شیر قانع نے مادۂ تاریخ نکالا۔

عقیدت مندوں اور مریدوں کے علاوہ آپ کے تلامذہ کی ایک بڑی تعداد ہے جس میں اکابر، علماء، فضلاء، مورخ اور شعراء شامل ہیں۔ سندھ کے شہرہ آفاق مورخ، ادیب اور شاعر میر علی شیر قانع آپ ہی کے شاگرد رشید تھے۔

ان خصوصیات کے ساتھ ساتھ میر کامل ایک بلند پایہ ادیب اور قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ سندھی، اردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ آپ نے اپنے کلام کے

دس مسودے تیار کئے تھے جو اپنے شاگردوں میر علی شیر قانع اور محمد پناہ رجا ٹھٹوی کو تدوین کے لیے دئے تھے۔

آپ کے اردو اشعار آپ کی زندگی ہی میں شہرت حاصل کر چکے تھے۔ صنعت ایہام میں آپ اپنا جواب نہ رکھتے۔ غزل و منقبت کے علاوہ آپ نے کبت اور دوہرے بھی نظم کئے ہیں اور ان اصناف میں نکات آفرینی کی ہے۔ کلام کا ایک مختصر سا انتخاب شامل کیا جا رہا ہے جس سے آپ کی شاعرانہ قدر و منزلت کا اندازہ ہو سکے گا۔

پیارے لڑکے ہمیں ستانا کیا — ہر گھڑی لڑکے رُوس جانا کیا (دروٹھ)
پھر سجن بانک سج چلے ہیں کیوں — بات ہے یہ پیج میں بتانا کیا
یو جلا کھیل میں یو جاتا ہوں — شمع رو کا پتنگ اُڑانا کیا
یار جانا کی بات جانے میں — یہ نہ جانے تو پھر نہ جانا کیا
دلبری میں پکھ سو کچھ نا ہیں — دل چرانے میں دل چرانا کیا (نال)
شمع کہتی جلی جلی بتیاں ہے — کاٹنا سر، جلا جلاتا کیا
تیغ غمزے کی زور "کامل" پر — جو بہانا تو پھر بہانا کیا

لبوں دلبر کے میرے قتل پر بیڑا اٹھایا ہے — خدایا خون سوں میرے تو اس کوں سرخرو کرنا

خال رخسار پر اچنبا ہے — گال کے کھیت میں اگا ہے تل

عشق اب ڈول ہے زلیخا کا — اس سوں آگے ہے چاہ میں یوسف

گل گل بگل بگل کے محبت کی راہ میں — پانی ہوئی زلیخا یوسف کی چاہ میں

تیرے واصل میں دوجی تات نہیں　　　سب ہوا بھول ایک بات نہیں

زلف انکھیاں پہ آن لٹکے ہیں　　　دام بادام دو دو اٹکے ہیں

ابوتراب کامل، آبرو، مضمون اور ناجی کے زمانے کے شاعر ہیں لیکن سندھ اور دلّی کے بُعدِ مکانی کے باوجود ان کا کلام ہم عصر شعراء کے کلام سے بہت ملتا جُلتا ہے۔ وہی رعایات لفظی، تشبیہوں اور استعارات کا استعمال، جو اس دور کی خصوصیات تھیں، وہ سب کامل کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ نازک خیالی اور معنی آفرینی میں وہ اکثر شاعروں سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ سوتے ہوئے محبوب کی تصویر کشی کس خوبصورت انداز میں کرتے ہیں۔ ؎

سویا پڑا ہے کیا رے نازک بدن اکیلا　　　خون جوش دے پلکتا جا من اسے اٹھا دیکھ

پروفیسر معین الدین دردائی نے فلسفۂ وحدت الوجود کے سلسلے میں ایک شعر نقل کیا ہے۔ ؎

تیرے واصل میں دوجی بات نہیں　　　سب ہوا پھول ایک بات نہیں

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ اسی شعر کو اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔ ؎

تیرے واصل میں دوجی تات نہیں　　　سب ہوا بھول ایک بات نہیں

تات کے معنی سندھی میں طلب اور جستجو کے ہیں اور ابوتراب کامل کے انداز کلام کو دیکھتے ہوئے تات کا استعمال قرینِ عقل معلوم ہوتا ہے۔ پھر وزن اور بحر کے اعتبار سے بھی ڈاکٹر صاحب کا شعر رواں ہے اور جہاں تک ہمہ اوست کے نظریے کا تعلق ہے، وہ بھی ڈاکٹر صاحب کے محولہ شعر سے بدرجہ اولیٰ ثابت ہوتا ہے جو ابوتراب کامل کی مہارت سخن کی ایک روشن دلیل ہے۔

کامل عشق الٰہی کے ساتھ ساتھ اہل بیت کی محبت کے متوالے بھی تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے والہانہ عقیدت کے ساتھ کہتے ہیں۔

؎ اے شہ دوسرا، میں چیرا ہوں　　　نام تیرا، مدام تیرا ہوں

بھوت ندیاں دکھوں کی تیرا ہوں　　آمدو کر، لہرتے گھیرا ہوں
یا علی، میں غلام تیرا ہوں

دے مجھے ساز، بخش سامانم　　رحم کن رحم، از غلا مانم!

پا شکستہ فتادہ ام در چاہ　　میں بُرا ہوں، مجھے اٹھا، پاشاہ

ابوتراب کامل کو اُردو زبان میں جو مہارت اور الفاظ کے تصرف پر جو قدرت حاصل ہے، وہ بہت سے اہل زبان کو میسّر نہیں۔ ایہام گوئی کی صنعت کو وہی برت سکتا ہے جو الفاظ کا بادشاہ ہو۔ اس لحاظ سے کامل کا ذخیرہ الفاظ اُس زمانے کے شعراء کے لیے قابل رشک ہوگا۔ چند لفظوں میں ان کی شاعری پر تبصرہ کیا جائے تو انہیں تبدیلیِ نوعیت کے ساتھ سندھ کا ولی قرار دیا جا سکتا ہے۔

شیخ دُرُو　(بارھویں صدی ہجری، ابتدائی نصف)

شیخ دُرُو کے نامکمل حالات[۱] مقامات الشعراء سے ماخوذ ہیں۔ جس کسی نے لئے ہیں وہ میر علی شیر قانع کی اسی کتاب سے ڈاکٹر نبی بخش بلوچ ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"شیخ دُرُو شہر ٹھٹھہ کے منصبداروں میں سے تھے۔ ابھی جوان تھے کہ نواب سیف اللہ خاں کے عہد (۱۱۳۷ھ - ۱۱۴۲ھ) کے آخری حصے میں قتل کے الزام میں مارے گئے۔ بقول میر علی شیر قانع شہر ٹھٹھہ کے مفتی کی ہجو میں انہوں نے بہت کچھ لکھا جس میں سے ایک غزل کا مطلع یہ تھا۔

---

[۱] ماخوذ از "تحفۃ الکرام" از علی شیر قانع صفحہ ۶۲۳ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد سنہ ۱۹۵۹ء
اور "مقالات الشعراء" از میر علی شیر قانع صفحہ ۶۰ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد سنہ ۱۹۵۷ء

الایا ایہا المفتی شدہ ریشِ تو جنگلسا !!
اکھاروں یال یک یک کر بناؤں خوب کمہلا ۱۸ه

افسر امروہوی نے بھی ایسا ہی کچھ تحریر کیا ہے۔
اس بیان سے یہ بھی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ مفتی شہر نے عداوت میں انہیں ماخوذ کرا دیا ہو اور پھر قتل کا فتویٰ صادر کر دیا ہو۔ تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔

شیخ عبدالسبحان فائز

شیخ عبدالسبحان شیخ مرتضیٰ کے بیٹے تھے، ٹھٹھہ کے معزز اور اہل علم لوگوں میں شمار کیے جاتے، دُرّو کے ہم عصر اور ہم قبیلہ تھے۔ شاعری میں بھی ان کا انداز دُرّو ہی جیسا تھا، طبعاً ظریف اور بذلہ سنج تھے لہذا رنگ طبیعت اشعار میں منعکس ہو جاتا تھا۔

فارسی اور سندھی میں مناقب کہا کرتے تھے لیکن محبت اہلبیت میں غلو رکھتے لہذا میاں نور محمد کلہوڑہ کے عہد حکومت میں حاسدوں کی شکایت پر معتوب ہوئے۔

ان کے مولود بے حد مقبول تھے۔ ہندی میں بھی شعر کہتے تھے مگر کلام نایاب ہے۔ ۱۹ه

مخدوم احمد خاں نظامانی احمدؔ

(غالباً بارھویں صدی ہجری، نصف آخر)

۱۸ه مضمون "سندھ کے اُردو شاعر" از افسر صدیقی مشمولہ رسالہ اُردو ۱۹۳۷ء اورنگ آباد دکن

۱۹ه ماخوذ از تحفۃ الکرام صفحہ ۳۸، از علی شیر قانع مترجمہ اختر رضوی مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدر آباد ۱۹۵۹ء

تاریخ سندھ (عہد کلہوڑہ) صفحہ ۱۰۵، از غلام رسول مہر مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدر آباد ۱۹۵۸ء

احمد خاں نظامانی نام تھا، احمد تخلص کرتے تھے۔ مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی کے پوتے مخدوم محمد ابراہیم کے خلیفہ تھے۔ فارسی کے قادرالکلام شاعر تھے، کبھی کبھی اردو میں بھی کہتے تھے۔ مخدوم ابراہیم خلیل ٹھٹھوی نے ایک شعر درج کیا ہے۔

آج تیرے نین نے مسجد میں ہوش لوٹا ہے ہر نمازی کا [۲۰]

مخدوم عبداللہ

مخدوم عبداللہ ایک عالم و فاضل، متقی و دیندار بزرگ تھے۔ ٹھٹھہ میں سید صابر علی شاہ کے سوا کوئی ان کا جواب دینے والا نہ تھا۔ فارسی نظم و نثر دونوں پر قدرت رکھتے تھے۔ مخدوم خلیل ٹھٹھوی نے ان کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

کس کس کو یاد کیجئے، کس کس کو رو دیئے
کیا کیا نہ آسماں کے ہوا انقلاب سے [۲۱]

میر محمود صابر

"میر محمود کے آبا و اجداد استر آباد (ایران) کے رضوی سادات کے ایک معزز خاندان سے تھے۔ ان کے والد جہاں آباد آکر متوطن ہوئے اور یہیں پر ۱۱۱۵ھ کے لگ بھگ میر محمود کی ولادت ہوئی۔ ان کا خاندان امامیہ مذہب اثنا عشری کا پیرو تھا جو انہیں ورثے میں ملا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آئمہ کی زیارت کی خاطر انہوں نے اپنے دوسرے وطن دہلی کو خیرباد کہا۔ زیارت سے مشرف ہو کر سندھ کے راستے واپس ہوئے تو شہر ٹھٹھہ کی رونق اور چہل پہل میں ان کا دل اٹک کر رہ گیا اور واپس وطن جانے کا خیال ترک کر کے ہمیشہ کے لیے یہیں کے

---

[۲۰] تکملۂ مقالات الشعراء صفحہ ۴۹ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد ۱۹۵۸ء

[۲۱] تکملۂ مقالات الشعراء صفحہ ۵۱، ۵۲ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد ۱۹۵۸ء

ہو رہے۔ انہوں نے یہیں پر شادی کر لی اور صاحب اولاد ہوئے۔"

ورود ٹھٹھہ کے وقت میر محمود کی عمر بیس پچیس سال ہو گی۔ ٹھٹھہ کا مردم خیز شہر ان دنوں علمی اور ثقافتی اعتبار سے اپنے شباب پر تھا جس میں میر محمود کے وجود سے ایک اضافہ ہو گیا۔

۱۱۶۱ھ میں مخدوم محمد معین بیراگی فوت ہوئے تو میر محمود صابر نے ٹھٹھہ میں اردو شاعری کا چراغ روشن رکھا۔ پرسرام فارسی کے شاعر تھے اور مشتری تخلص کرتے تھے۔ انہیں اردو، ہندی میں شعر کہنے کا شوق ہوا تو میر محمود کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کر کے بیربل تخلص اختیار کیا۔

۱۱۷۴ھ۔ ۱۱۶۹ھ میں جبکہ میر علی شیر قانع نے اپنا تذکرہ مقالات الشعراء مرتب کیا، میر محمود صابر کا شمار ٹھٹھہ کے معزز اور باوقار لوگوں میں ہوتا تھا۔ صابر کی شعری کاوشوں کے بارے میں میر علی شیر قانع لکھتے ہیں۔

"اکثر شہداء کی مرثیہ خوانی میں مشغول رہتے ہیں۔ ہندی اور فارسی میں متعدد دیوان، مرثیے، غزلیات اور مناقب لکھ چکے ہیں۔ روضۃ الشہداء کو بھی منظوم کیا ہے۔ سرعت فکر کی یہ کیفیت ہے کہ اس وقت تک تقریباً ایک لاکھ اشعار ان کی زبان فصاحت بیان سے نکل چکے ہیں اور ان کا کلام کافی مقبول ہے یہ تخلص یعنی صابر ان کو خواب کے ذریعہ حاصل ہوا۔"

صابر کا دیوان شوق افزا موجود ہے جو ۱۱۸۱ھ میں مکمل ہوا جس کے متعلق وہ خود کہتے ہیں۔

؎ شوق تاریخ تھا ز نو دیواں　　　　تا رہے دوستوں کے پاس نشاں

صابر کا زمانہ حاتم، فغاں اور مظہر جانجاناں وغیرہ کا ہے اور سودا اور میر درد کا دور بھی اس میں لیا جا سکتا ہے۔ ولی کی وفات غالباً ان کی جوانی میں ہوئی ہوگی تاہم انہوں نے ولی کے کلام کا مطالعہ کیا تھا جس کی شہادت ان کے کلام سے ملتی ہے۔

ے سن ریختہ ولی کا دل خوش ہوا ہے صابر
حقا کہ فکر روشن ہے انوری کے مانند

بہر حال "بارھویں صدی ہجری کے نصف آخر میں جن لوگوں نے سندھ میں اردو شاعری کا بول بالا کیا، ان میں میر محمود صابر کا نام نمایاں ہے" اور ان کے کلام کو اردو متقدم شعراء کے معیار پر پرکھا جائے تو اس کا پلہ ہلکا نہ پڑے گا کیونکہ ایسا ہوتا تو کلام کو اتنی مقبولیت نہ ہوتی کہ صابر کے شعر سندھ سے دکن پہنچ گئے جس کی بھنک صابر کے کان میں پڑ گئی تھی۔ وہ کہتے ہیں

صابر سنا ہوں، قافیہ سنجان ہند سوں
تجھ ریختہ کی دھوم پڑی ہے دکھن میں جا

تفاخر فن اور انا جو شاعرانہ مزاج کا خاصہ ہے۔ وہ صابر میں بھی موجود تھی جس کا اظہار ایک شعر میں کیا ہے۔

ے گر ریختہ ولی کا لبریز ہے شکر سوں
مضمون شعر صابر قند و شکر تری ہے

اور یہ غلط بھی نہیں ہے کہ اپنے دور کے لحاظ سے صابر کے اشعار قدرت کلام، ندرت فکر اور مشق سخن کا آئینہ ہیں۔ سندھ کے بجائے وہ دلی یا دکن میں ہوتے تو ان کا مرتبہ کچھ اور ہی ہوتا۔

چھ سو سولہ غزلوں میں سے چند غزلوں کے اقتباسات پیش ہیں۔

ے تجا ہے جب سوں دل نے گلبدن کا رن دیار اپنا
جو بلبل ڈھونڈھتا ہے باغ اپنا، گلعذار اپنا
نہ کھولوں رات دن خورشید مہ او پر نظر صابر!
چندر مکھ سوں رکھوں روشن جو چشم انتظار اپنا

ے انور ہو در دیدہ و دل چشم و نظر کا تجھ مکھ کے اوپر وار سٹوں گنج گہر کا

آئینہ میں مت دیکھ لٹاں چھوڑ کے مکھ پر ۔ تا برج میں عقرب کے نہ دور آئے قمر کا

یوں نہ دل کو صنم پرست کرے ۔ کفر کی لٹ دکھا برہمن کا !

بس پڑھایا ہے دل کو ڈس ڈس کے ۔ گھاؤ کاری ہے لٹ کی ساپن کا

ماہرویاں کے عشق کا صابر ۔ مجھ کو چسکا پڑا ہے لرپن کا

تجھ زلف کے بچھوں کو پکڑ کون سکے گا

اس زہر بھری لٹ کو جکڑ کون سکے گا

ہیں کاتب قدرت خط یا قوت پر حیران

تفسیر ترے حسن کی کر کون سکے گا

صابر ہے ترے عشق میں مشہور وگرنہ

تجھ نیہہ میں دم عشق کا بھر کون سکے گا

نہیں دیکھا ہے جس نے دن کوں خورشید و ستارے کوں

گھونگھٹ کی جوت میں دیکھے سجن کے گوشوارے کوں

رکھے جو عشق کے دریا میں بے مرشد قدم صابر!

بہت مشکل ہے گر پہنچے سلامت اس کنارے کوں

یسیم کے گھاؤ آج رستے ہیں ۔ سرخ انجھوں کے مینہ برستے ہیں

جیو نا ان کوں زہر قاتل ہے ۔ زلف کے ناگ جن کوں ڈستے ہیں

خوبرویاں کوں دل نہ دے صابر ۔ طعنہ بے دردے دے ہنستے ہیں

؎ مراد کھ پو چھنے آوے سجن گر مہربانی سوں
بلیا لیوں اس کے سر کی اٹھ اٹھ ناتوانی سوں

؎ زلیخا وار پیری میں ملی مجھ عشق کی دولت
جوانی میں لگایا نیہہ جب یوسف کے ثانی سوں

؎ لیا ہے ہر کسی نے توشہ صابر راہ باقی کا
محبت شاہ کی میں لے چلا ہوں ملک فانی سوں

؎ سیتاں کا عشق دیکھ، کہ جلتی ہے آگ میں
شاید لکھا ہے دہر سیں یہی ان کے بھاگ میں

؎ شب زندہ رکھ کہ صبح کا دیکھے ظہور و نور
سووے گا کب تلک کہ کمائی ہے جاگ میں

؎ چھوڑا ہے جب سوں زلف کا دل نے شکن شکن
آشفتہ رات و دن ہے زشوق وطن وطن

؎ پایا نہ چاند مکھ کے مقابل کا دلربا
سب ہند و سند دیکھ کے ڈھونڈا دکھن دکھن

؎ رہیں کل رات کی اٹک جو تجھ رہ میں کھلی اکھیاں
انجھوں کے جوش سوں گنگا ہو جمنا بہ چلی اکھیاں

؎ برہ کی دین میں دل دیکھ روشن غم کی آتش سوں
انگاروں کے اوپر تا صبح تجھ بن تلملی اکھیاں

؎ گھونگھٹ میں چاند مکھ ڈھانپو گے کب لگ اے سجن سمجھو
تڑپتے ہیں درس کوں پاکبازاں کے نَیَن سمجھو !

؎ رقیباں ساتھ ملنا، سیر کرنا، باغ میں جب! نا !
نہیں لائق کہ گل رویاں کی خواری ہے سجن سمجھو

؎ نہیں آشفتگی کی تاب دلہائے پریشاں کوں
صبا کے ہاتھ مت دو حلقۂ زلف شکن سمجھو

؎ نین دریا ہوئے رو رو ادھر سوں یو اُدھر سوں دو
بہے گنگا و جمنا ہو، ادھر سوں یو اُدھر سوں دو

؎ نظر دیدار کوں بھٹکے، ملن کو جیو راترسے
عجب ہیں عشق کے لٹکے، ادھر سوں یو ادھر سوں دو

؎ کوئی من ہرن کوں جان کہے، کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے
کوئی دین کہے ایمان کہے، کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

؎ کوئی مجھ کو کہوے ہے گدا، کوئی کہوے ہے شہ پر فدا
درسن کا رکھتا ہوں صدا، کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے [۴۲]

میر حفیظ الدین علی

میر حفیظ الدین ابو تراب کامل کے بھتیجے بھی تھے اور شاگرد بھی۔ آپ کے والد کا نام میر حافظ الدین تھا۔ ایک علمی گھرانے کے فرد ہونے کے باعث آپ نے اعلیٰ تعلیم اور اچھی تربیت پائی تھی علی تخلص کرتے تھے۔ اپنے وقت کے باکمال

---

[۴۲] ؎ "مخزن الشعراء" از میر علی شیر قانع صفحہ ۴۵۲ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد سنہ ۱۹۵۸ء
"وادیٔ سندھ میں اردو شاعری" از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صفحہ ۹ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سنہ ۱۹۶۲ء

بزرگ اور صاحبان حال وقال بھی تھے۔ نظم ونثر دونوں میں ید طولیٰ رکھتے لیکن ثقل سماعت اور بصارت کی کمزوری کے باعث ان توقعات کو پورا نہ کرسکے جو ان کی ذات سے وابستہ کی جاتی تھیں۔

میر علی شیر قانع نے ہندی شاعری میں انہیں امیر خسرو ثانی لکھا ہے۔ ان کے ایک ایک شعر میں کئی کئی معنی ہوتے تھے۔ دو ہندی پہیلیاں صنعت ایہام میں قابل ملاحظہ ہیں۔

سہ آچار ہوا کھٹا، پاپڑ للینی ہے مچھی — سرکر بنا تو آ کے سوئی سلونی اچھی

سہ پیلی ہے کیوں کناری سونا نہیں جھر کا — چوری پھوچی ہے باتیں موتی تو دیکھ لڑکا [۲۲]

میر علی شیر قانع

میر علی شیر قانع سادات شکر اللٰہی (شیراز) سے تھے۔ یہ خاندان نویں صدی ہجری میں شیراز سے ہجرت کر کے ہرات آیا۔ اور جب شاہ بیگ نے سندھ فتح کیا تو وہ بھی ٹھٹھ آ کر بس گیا۔

آپ کے والد سید عزت اللہ کا شغل درس وتدریس تھا لیکن فقر وسلوک سے بھی وہ ایک خاص لگاؤ رکھتے تھے۔ ٹھٹھ کے علمی شہر میں آپ ایک اہل علم اور مقدس انسان سمجھے جاتے تھے۔

علی شیر قانع اپنے سب بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے پھر بھی زمانے کے رواج اور معیار کے مطابق آپ کی تعلیم ہوئی۔ آپ نے میاں نعمت، میاں محمد صادق اور میاں عبد الجلیل اخوند ابو الحسن ٹھٹھوی جیسے جید علماء سے اکتساب علم کیا۔

شعری صلاحیت قسام ازل سے فطرت میں ودیعت ہوئی تھی اس لیے میر قانع

---

[۲۳] مقالات الشعراء صفحہ ۱۸۲ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد ۱۹۵۷ء

اور سندھ کے اردو شاعر از افسر امر وہوی مشمولہ رسالہ اردو ۱۹۳۶ء اورنگ آباد دکن

بارہ سال کی عمر سے شعر کہنے لگے اور سال سوا سال میں آٹھ ہزار شعر کہہ ڈالے۔ ۱۱۵۲ھ میں پہلا دیوان مرتب کر لیا اور ۱۱۵۵ھ سے دوبارہ اس سلسلے کا آغاز ہوا تو نظم و نثر کے ذخائر جمع کر ڈالے۔

میر علی شیر قانع علم جفر اور تکثیر میں بھی عامل تھے اور جفر جامع نامی ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ کلہوڑہ دور حکومت میں آپ خاصے معروف ہو چکے تھے اور کسی حد تک آپ کو نوازا بھی گیا تھا لیکن جب تالپوروں کا زمانہ آیا تو نیر اقبال عروج پر پہنچ گیا اور آپ میر فتح علی خاں کے دربار میں ملک الشعراء بنا دئیے گئے۔

سندھ کی سرزمین ہمیشہ سے مردم خیز رہی ہے۔ اس نے ہر دور میں اہل علم اور صاحبان قلم پیدا کئے ہیں لیکن میر علی شیر قانع وہ جوہر تابندہ تھے جس نے ریگزار کے ذروں کو ہم سر ثریا بنا دیا اور وطن کے نام کو اقوام عالم میں اونچا کر دیا۔

میر علی شیر قانع کی تصانیف کی تعداد یوں تو بیالیس ہے اور ان میں سے ہر کتاب وقیع اور اہم ہے لیکن تحفۃ الکرام اور مقالات الشعراء سندھ کی سیاسی اور ادبی تاریخ کے خزانے کی حیثیت رکھتے ہیں ـــــ میر قانع نے کچھ اور نہ لکھا ہوتا تو یہی دو کتابیں انہیں زندۂ جاوید بنانے کو کافی تھیں۔

آپ فارسی کے مورخ، نثار اور شاعر تھے اور میر حیدر الدین ابوتراب کامل کے شاگرد تھے۔ اردو کی حد تک آپ کی شاعرانہ حیثیت مسلم نہیں مگر رنگ زمانہ کو دیکھ کر یا اردو کی بعض ادبی یا مذہبی محفلوں میں شرکت کی خاطر اردو میں شعر کہنے کا پتہ بھی چلتا ہے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ میر حیدر الدین کی ترغیب پر آپ اردو کی طرف متوجہ ہوئے۔ ایک شعر آپ سے منسوب ہے جو پیش کیا جاتا ہے۔

مجھ شہادت کی جگت میں تھی پیاس

کیوں نہ پیارے نیلے انکھیاں کربلا ۲۴ھ

۲۴ھ ماخوذ از مقالات الشعراء صفحہ ۵، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدر آباد ۱۹۵۸ء
تحفۃ الکرام مترجمہ اختر رضوی صفحہ ۲۲، ۲۴، ۶۴ وغیرہ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدر آباد ۱۹۵۹ء

میاں محمد سرفراز عباسی

میاں محمد سرفراز عباسی حیدرآباد کے بانی میاں غلام شاہ عباسی کے بیٹے تھے، ۱۱۸۶ھ میں مسند آرائے حکومت ہوئے۔ صاحب علم و فضل تھے مگر رموز جہانبانی سے نابلد اور سیاسی سوجھ بوجھ سے عاری تھے لہذا حکومت پانچ سال بھی چلائے رہ نہ سکی اور عالم اسیری میں اپنے چچا عبدالنبی کے اشارے سے قتل کردئے گئے۔

میاں سرفراز فارسی کے بلند پایہ اور زود گو شاعر تھے۔ کبھی کبھی سندھی میں کہتے تھے اور اردو میں تو اکثر طبع آزمائی کرتے تھے لیکن بیشتر کلام نایاب ہے۔ ایک فارسی قطعے میں اردو کا ایک مصرعہ نظم کیا ہے جس کو ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے "سندھ میں اردو شاعری" میں درج کیا ہے۔

دوش دیدم خجستہ اختر کے — ایستادہ بناز در بر کے
دست بگرفتمش بہ ہندی گفت — چھوڑ دے ہاتھ چوریاں کر کے

ایک شعر اور ان سے منسوب ہے جو حالت اسیری کا معلوم ہوتا ہے۔

قفس کے بیچ میں بلبل کہاں، فریاد کیا کیجے
لکھا قسمت کا ہونا تھا، چمن کوں یاد کیا کیجے [۲۵]

اخوند قاسم ساوتی ہالائی

اخوند قاسم کے والد اخوند محمود نصر پور میں مدرس تھے اور ہالہ (پرانہ) کے مشہور خانوادے ساوتی سے تعلق رکھتے۔ آپ نے علمی ماحول میں پرورش پائی اور عربی و فارسی کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ [۲۶]

---

[۲۵] "سندھ میں اردو شاعری" از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صفحہ ۶۲ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۷۰ء
[۲۶] تکملۂ مقالات الشعراء صفحہ ۳۶۶ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ ۱۹۵۸ء

۱۱۷۲؁ھ میں والد کا انتقال ہونے پر ان کی جگہ مدرس مقرر ہوئے۔ اخوند قاسم فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ لکھتے ہیں۔

"بندہ راقم کے پاس ان کے مجموعہ کلام فارسی کا ایک نقلی نسخہ "قاسم نامہ" کے نام سے موجود ہے ان میں ہر ایک ردیف پر ایک اردو غزل بھی شامل ہے۔ غالباً اصل نسخہ میں یہ غزلیں "پائے "تک تھیں جس سے قاسم کے اردو زبان میں صاحب دیوان ہونے کا قوی گمان ہوتا ہے۔ ان کی اردو غزلوں سے ظاہر ہے کہ قاسم نہ صرف اردو کے ایک بلند پایہ شاعر تھے بلکہ ان کے دور میں اردو شاعری کا ذوق سندھ کے اندرونی علاقے یعنی ہالہ اور نصرپور میں پایا جاتا تھا" ۲۷؎

چند غزلوں کے اقتباسات دیے جاتے ہیں۔

بزم میری سوں جب نگار گیا — تب مورے جیو کا قرار گیا
دھونڈھتا ہے اداسی اپنی دل — جو گلی میں تری بسار گیا
"قاسما" اب تری دعا سوں رقیب — پیو کی مجلس سے بے وقار گیا

جب ہووے میرا سریجن بے حجاب — ذرہ ساں گردش میں آوے آفتاب
گر پڑے سورج زمین پر زرد ہو — گر نہ ڈالے پیو مکھ اوپر نقاب

کھلاتی ہے شکر دل کوں تری گفتار ہر ساعت — خیال مکھ ترے کا ہے مجھے دو چار ہر ساعت
نین نرگس، دہن غنچہ کیا ہے زلف ہے سنبل — ہوا ہے رشک گلشن کا ترا رخسار ہر ساعت

جو درد عشق سوں نہیں آگاہ "قاسما" — احوال اپنا اس کوں سنانا عبث عبث

۲۷؎ "سندھ میں اردو شاعری" صفحہ ۶۲ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۷۰؁ء

ہزاروں شکر تیرا یا الٰہی   کہ مجھ سیتی کرم سوں آملا شورخ

اے آشنا کرم سوں اک بار آدرس دے   مشتاق ہے تمہارا قاسمؔ ولی کے مانند

سید ثابت علی شاہ ثابت

ثابت علی شاہ ۱۱۵۳ھ میں بمقام ملتان پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مدار علی شاہ تھا حصول تعلیم سے فارغ ہوتے ہی وہ سیوہن کے ایک سیلانی فقیر کے مرید ہو گئے اور جلد ہی فرط عقیدت میں سندھ آ کر مرشد کی خدمت میں حاضر ہو گئے پھر سیوہن کی درگاہ شریف میں روضۃ الشہدا اور مراثی پڑھنے پر مامور ہو گئے۔

دوران قیام انہوں نے تفسیر و حدیث وغیرہ میں معلومات بہم پہنچائیں پھر غزلوں اور قصائد کی اصلاح کے لیے میر غلام علی مدّاح کے شاگرد ہو گئے۔ فطری صلاحیت اور خداداد ذہانت نے جلد ہی انہیں معروف کرا دیا اور وہ حیدر آباد کے تالپور دربار سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۲۲۵ھ میں انتقال کیا اور سیوہن میں سپرد خاک کئے گئے۔

ثابت علی شاہ فارسی اور سندھی کے زود گو شاعر تھے۔ سندھی میں باقاعدہ مرثیہ لکھنے کا آغاز انہیں کی ذات سے ہوا۔ اردو سے بھی انہیں خاص شغف تھا۔ اردو کے مرثیہ گو شعرا میں وہ مسکین اور مقتل سے متاثر تھے اور اپنے مرثیوں میں انہیں کی تاسی کرتے تھے۔

یوں تو ان کا طرّہ امتیاز سندھی مرثیہ گوئی ہے لیکن اردو میں بھی انہوں نے کافی کہا ہے۔ ایک منقبت سے ایک بند پیش ہے۔

اے حق کے ولی ابن علی میری امدد کر   ہر وقت خفی اور جلی میری مدد کر

تجھ بابا کے حق ناد علی میری مدد کر   سائل ہوں کھڑا تیری گلی میری مدد کر

ابن علی اللہ کے ولی میری مدد کر

یا حضرت عباس علی میری مدد کر ثؔ   (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کیا ثابت علی انیس و دبیر سے پہلے کے مرثیہ گویوں میں کوئی ممتاز مقام نہیں رکھتے ؟ اس کا فیصلہ صاحبان ذوق خود کر سکتے ہیں ۔

محمد عظیم الدین عظیم

میر محمد عظیم الدین ابن سید یار محمد، میر علی شیر قانع کے بھتیجے تھے ۔ ایک علمی گھرانے کے فرد ہوتے ہوئے انہیں علوم متداولہ پر عبور تھا ۔ وہ ۱۱۶۲ھ میں بمقام ٹھٹھہ پیدا ہوئے، ماحول اور فطری میلان نے جوان ہونے سے قبل ہی شاعر بنا دیا اور بلوغت نظر اور مہارت تامہ پیدا ہوئی تو سندھ کے ملک الشعراء ہو گئے ۔

عظیم فارسی کے باکمال شاعر تھے اور تاریخی قطعات کہنے کے تو ماہر تھے ۔ دربار تالپور سے وابستہ تھے لہذا تین ہزار شعروں کا فتح نامہ میر فتح علی خاں کی فتوحات کے سلسلے میں نظم کیا پھر ایک مثنوی ہیر را نجھا لکھی ۔ ان کی باقیات میں فارسی قصائد، غزلیات، رباعیات، مخمسات، مسدسات، سلام و مراثی ساری اصناف پائی جاتی ہیں ۔ اردو میں غزلیں اور مرثیے بھی لکھے ہیں جن کو دیوان فارسی کے فاضل مرتب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے دیوان کے آخر میں شامل کر دیا ہے ۔ چند غزلوں کے اقتباسات نمونے کے طور پر تحریر کیے جاتے ہیں ۔

دلبر نے میرے مجھ سیں کیا التفات آج — سب درد و غم کی قید سیں بخشا نجات آج
میں مر گیا تھا تلخی زہر فراق سوں — میٹھے وصال یار نے بخشا حیات آج
"ساقی نے جام عشق دیا ہے عظیم کو — ہو گا جہاں ۔ مری نظر میں ہے شاخ نبات آج"

تجھ بن میں بقرار سدا ہجر و بر میں ہوں
جل میں کنول، کنول میں بھنور، میں بھنور میں ہوں

---

۲۹ ۔ "تکملہ مقالات الشعراء" صفحہ ۴۹ تا ۹۷، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ ۱۹۵۸ء

تو مجھ میں ہے، میں تجھ میں، جدائی جدا ہوئی
انکھیاں میں تو ہے، تجھ میں نظر، میں نظر میں ہوں
دیکھا ہوں دام زلف میں تیرے عظیمؔ کو
سر میں زلف، زلف میں جگر، میں جگر میں ہوں

برہمن، جس کے دل میں آرزو ہے ہر کے درسن کا
مجھے ہے آرزو ہر وقت درسن اُس برہمن کا
مرا دل رام اس کا ہے جو دل میں رام ہے ہر کا
سورج مکھ پوجے سورج کوں وہ پوجے رخ پریجن کا
عظیمؔ اس حسن عشق آمیز نے مجھ دل کوں گھیرا ہے
برہمن ہر کا ہے عاشق، میں عاشق ہوں برہمن کا

گلشن میں جب وہ گل رو مست شراب ہوئے
اس حسن آتشیں پر بلبل کباب ہوئے
مت آئینے کو دکھلا اپنا جمال روشن
تجھ مکھ کا تاب دیکھے آئینہ آب ہوئے

چلا یادگار پیمبر حسین! چلا ابن زہرا و حیدر حسین
چلا سب شجاعوں کا افسر حسین چلا بادشاہ مظفر حسین [۲۹]

عظیمؔ بھی سندھ کے دوسرے شاعروں کی طرح فارسی کے شاعر تھے اور حافظ

---

[۲۹] تکملہ مقالات الشعرا، از مخدوم محمد ابراہیم خلیل صفحہ ۳۸۹ تا ۴۰۵ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد ۱۹۵۸ء
دیوان عظیمؔ ٹھٹھوی مرتبہ پروفیسر غلام مصطفیٰ خان مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ ۱۹۶۲ء

سے بہت متاثر تھے لیکن ان کا اُردو کلام اپنے معیار کے لحاظ سے کسی طرح فارسی سے کم نہیں، بالخصوص الفاظ کی بندش، خیال کی بلندی اور مصرعوں کی روانی اپنے معاصرین کو دعوت سماعت دے سکتی ہے اور اُس دور کے اساتذہ کو ماننا پڑے گا کہ بارھویں صدی ہجری میں سندھ دلی سے بہت پیچھے نہیں رہا۔

میر ضیاء الدین ضیاءؔ

عمر میں کم و بیش اپنے بھتیجے میر عظیم کے برابر تھے۔ شکر اللہی سادات کے اس خاندان میں کتنے ہی افراد یگانہ روزگار تھے جن میں سے عظیم میر فتح علی خاں سے اور مائلؔ میر کرم علی خاں سے وابستہ تھے۔ ضیاءؔ کو میر پور خاص کے والی میر ٹھارہ خاں نے اپنے پاس بلالیا اور بڑی قدر دانی کی۔

تب ہی میر ضیاء کہتے ہیں۔

نور از جبہۂ میر ٹھارہ خاں — جلوہ گر ماہتاب میں دیکھا

میر ضیاء الدین عمر بھر اسی خاندان سے منسلک رہے حتیٰ کہ ۱۲۲۹ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ وہ فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے۔ ایک دیوان، چند بیاضیں اور ایک مثنوی ہیر رانجھا ان کی یادگار ہے۔ اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اُردو کا دیوان سندھی ادبی بورڈ میں محفوظ ہے جو تقریباً ہر صنف سخن پر مشتمل ہے ایک غزل کے چند شعر نمونتہً درج کئے جاتے ہیں۔

ے دکھا کر رخ کوں اے ظالم، چھپاؤ گے تو کیا ہو گا
کہانی عشق کی کہہ کر بلاؤ گے تو کیا ہو گا

نہ پاؤں نیند نینوں میں کدی تجھ بن ارے پیتم
سمجھ کر اپنے عاشق کوں ستاؤ گے تو کیا ہو گا

درس کی مانگتا بھکیا ضیاء الدیں صدا تیری!
اگر تم مہر سوں آکر دکھاؤ گے تو کیا ہو گا

کس کی طاقت ہے اسے دیکھے　　جس نے دیکھا ہے بیقرار آیا

باریک ہوا برگ سمن کا زخجالت　　جب ذکر ہوا اس کے کبھی موئے میاں کا

ہے وہ خلوت نشین محفل قدس　　عاشقاں میں جو بانیاز ہوا ! [۳۰]

حافظ عبدالوہاب، سچل سرمست

عبدالوہاب عرف سچے بن صلاح الدین فاروقی ۱۱۵۲ھ میں بمقام درازضلع خیرپور پیدا ہوئے۔آپ کے جداعلیٰ شیخ شہاب الدین محمد بن قاسم کے ساتھ سندھ آئے تھے اور سیوہن کے گورنر ہو گئے تھے ___ زمانے کے فصل سے اس خاندان کی ایک شاخ تبلیغ دین اور رشد و ہدایت کے لیے دراز میں رہ پڑی جہاں سچے المعروف بہ سچل سرمست کی ولادت ہوئی۔

آپ کے والد کا سایہ چھ سال کی عمر میں سر سے اٹھ گیا تھا لہٰذا چچا خواجہ عبدالحق نے آپ کی پرورش کی اور ابتدائی تعلیم کے بعد خود ہی علوم ظاہری و باطنی کا درس دینے لگے۔ عبدالحق ایک جید عالم اور مرشد کامل تھے۔ سچل کو ان سے بڑھ کر کون پیر طریقت مل سکتا تھا اس لیے انہیں کی ہاتھوں پر بیعت کرلی اور پھر ان کی بیٹی کو بھی اپنے رشتہ ازدواج میں لے آئے۔

سچل بچپن ہی سے بہت بردبار اور سلیم الطبع واقع ہوئے تھے، عیش و آرام سے دور رہتے زیادہ وقت عبادت و ریاضت اور کتب بینی میں صرف کرتے، سماع کے بہت شوقین تھے۔ آخر آپ پر ہر وقت ایک جذب کی سی کیفیت طاری رہنے لگی لیکن اس عالم میں بھی شریعت اور بزرگوں کے احترام میں فرق نہ آتا اور اکثر آپ کی زبان سے جو الفاظ نکلتے وہ کسی نہ کسی بحر میں ڈھلے ہوئے۔

---

[۳۰] سندھ کے اردو شاعر از افسر امروہوی مشمولہ رسالہ اردو جولائی ۱۹۳۶ء اورنگ آباد دکن۔

سرشاری کی اس کیفیت میں بھی رشد و ہدایت کا کام جاری رہتا۔ آپ کے تصوف کا اساسی فلسفہ ہمہ اوست تھا اور اپنے وجود سے آپ وحدت الوجود کے رموز و اسرار کا آئینہ بن گئے تھے اسی لیے بعض لوگ آپ کو منصور سرمد کے سلسلے کی ایک کڑی قرار دیتے ہیں۔ ۱۲۴۲ھ میں عمر کے نوے سال گزار کر آپ نے وصال فرمایا۔

میر سہراب خاں والی خیر پور کو آپ سے بڑی عقیدت تھی۔ انہوں نے از راہ تلطف جاگیر عطا کی تھی اور میر علی مراد خاں نے پہلی مرتبہ آپ کا دیوان چھپوا دیا تھا۔

سندھ کا یہ سرمست ولی جیتے جی بھی مرکز عقیدت تھا اور آج بھی اس کا مزار مرجع خلائق ہے لیکن سچل کی شاعرانہ حیثیت کسی طرح اس سے کم نہیں جس زبان میں بھی انہوں نے کچھ کہا ہے، اس کو پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے الفاظ میں خود سچل کا دل دھڑک رہا ہو، مصرعوں میں ایک لے اور دھن اشعروں میں سرمست کی سرمستی جھلکتی ہے۔

آپ بنیادی طور پر سندھی اور سرائیکی کے شاعر تھے لیکن فارسی اور اردو میں طبع آزمائی کی تو وہی والہانہ انداز اور از خود رفتگی، جس کی توقع ایک فطری شاعر سے کی جا سکتی ہے۔

فارسی میں آپ کا تخلص آشکار اور فدائی اور اردو میں سچے، ڈتہ ہے۔ مجموعی طور پر آپ کی کافیوں اور اشعار کی تعداد نو لاکھ چھتیس ہزار چھ سو چھ ہے جس کا بڑا حصہ تلف ہو چکا ہے پھر بھی جو کچھ باقی ہے، وہ بہت ہے اور اس میں سے اردو کا معتد بہ حصہ منظر عام پر آچکا ہے۔ اشعار کا ایک مختصر انتخاب ملاحظہ کے لیے پیش ہے۔

؎ کروں میں کس کو بھلا اپنے حال سے آگاہ	ترے ہی درد سے قصہ مرا تمام ہوا

؎ یہ عقل و فہم اس کے دیدار نے اڑایا	زلفوں کے پیچ و خم میں مستانہ ہو رہا ہوں

ے سمجھا تھا دور میں نے لیکن نہ دور ہو تم — تیرے کرم سے جاناں میں در نظر ہوا ہوں

ے آئی نہ راس میری فریاد میرے گل کو — اس واسطے "سچل" بس چھوڑوں نہیں پکاراں

ے صورت بشر کی ہے مری، ظاہر گداگر ہوں بنا
باطن کو پہچانے مرے، سلطان ہوں سلطان ہوں
ے "سچل" د میرا نام ہے، وہ نام میرا پاک ہے
میں تو د سراپا عشق ہوں، ہم گوئے ہم چوگاں ہوں

ے کیا ورد، کیا وظائف، کیا قول، کیا بیپارے
بھولا ہوا ہوں شدّ و جزم و اعراب شکر للہ
ظاہر ہو یا ہو باطن، اندر ہو یا ہو باہر
"سچل" سپرد تیرے ہر باب شکر للہ

ے مجھ کو فنا کرے گی جاناں تری جدائی
فرقت میں تیری در در کرتا ہوں میں گدائی
تیرے فراق سے میں دیوانہ بن چکا ہوں
مجھ کو ہوئی ہے حاصل الفت میں جگ ہنسائی
دو چار دن کا میلہ، دو چار دن فراقی
سیکھی کہاں سے تو نے یہ رسم آشنائی
واپس دے دل سچل کا کوچہ میں جو پڑا ہے
سینے پہ اس کے نوبت الفت کی یہ بجائی

عاشق! جلادے آگ میں ساری کتابوں کے ورق
اک نام میرا یاد کر، یہ دوست کا پیغام ہے
مجھ کو تو مارا ہجر نے کہتا ہے تو آ پڑھ کتاب
گھر میرے اس محبوب کی آمد کا آج انجام ہے
کیوں سہو کا سجدہ کرے وہ عشق ہے جس کا امام
دم بھر بھلانا دوست کو نے عاشقوں کا کام ہے
آخر یہ مطلب پالیا مرشد نے یہ ہم سے کہا
بن عشق دلبر کے "سچل" کیا کفر کیا اسلام ہے

"سچل" کے یہ اشعار اگر اس دور کے کسی دہلوی یا لکھنوی شاعر سے منسوب کردئے جائیں تو بعض الفاظ کے فرق کے سوا کسی فرق کا احساس نہیں کیا جاسکتا بلکہ جذبہ عرفان کی گہرائی اور گیرائی کے لحاظ سے انہیں کے شعروں کو برتری حاصل ہوگی۔

سچل کا زمانہ میر و مصحفی، جرأت و انشاء کا تھا۔ دلی اور لکھنؤ میں الفاظ کی تراش خراش ہورہی تھی۔ گل و بلبل کے افسانے دامان تغزل میں جگہ بنا رہے تھے۔ ہجر و وصل کی خیالی داستانیں شعر کے سانچے میں ڈھل رہی تھیں۔ تصنع اگرچہ آورد کی حد میں داخل نہ ہوا تھا پھر بھی آداب غزل کسی نہ کسی حد تک برتے جارہے تھے، سندھ کے دور دراز خطے کو ان تغیرات کا علم نہ تھا یہاں کی شعر گوئی اسی سیدھی سادی ڈگر پر تھی لہذا سچل نے معرفت و آگہی کی وجدانی کیفیت میں ڈوب کر شعر کہا تو اسی لب و لہجے میں جو سودا کے یہاں کا تھا لیکن جذب دروں کے اعجاز کی بات یہ ہے کہ انداز بیان میں پھر بھی میر سے زیادہ پیچھے نہیں رہے اور کوئی برا نہ مانے تو اکثر میں اپنے زمانے کے اکثر شاعروں سے بڑھ گئے۔ جہاں تک غزلیت کا تعلق ہے سچل کے شعر سادگی کے باوجود اس سے خالی نہیں۔ ملاحظہ ہو۔

ے میں اژدھا تھا سمجھا، دیکھی جو زلف پیچاں
رخ پر لٹک رہی تھی بیدرد زلف کالی!

اس شعر کی ارتقائی اور بنی سنوری شکل جب پیش کی گئی تو اس طرح کہا گیا۔

ے ذرا ان کی شوخی تو دیکھئے کہ ہے زلف خم شدہ ہاتھ میں
میرے پاس آئے دبے دبے مجھے سانپ کہہ کے ڈرا دیا

دونوں شعروں میں وہی فرق ہے جو صحرا کے خودرو گلاب اور امرا کے چمنستان میں لگائے ہوئے گلاب میں ہو سکتا ہے۔ تاہم نقش اول اول ہی ہوتا ہے اور جمال مزین کسی طرح حسن معصوم کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کیا بات ہے سچل کے شعر کے تاثرات اور سادگی کی!

ایک دوسرا شعر توجہ طلب ہے۔

ے پھر ملا کر تیغ لا ہوتی سر میدان آؤں گا
گلی اب چھوڑ دلبر کی طرف دیگر نہ جاؤں گا

یہ خیال بھی آگے چل کر نکھری ہوئی زبان میں ترمیمی شکل اختیار کرتا ہے۔

ے لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

ہو سکتا ہے کہ موخر الذکر شعر بظاہر زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہو لیکن یہی شعر اگر نصف صدی پہلے کہا جاتا تو اس کی صورت کیا ہوتی اور آیا وہ طرز بیان اور تاثر میں سچل کے شعر سے بڑھ جاتا؟ اس کا جواب شاید اثبات میں نہ مل سکے۔ ایک دوسرا شعر اسی دور کا لائق اعتنا ہے۔

ے ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

خود فراموشی اور بے خودی کی کیفیت اس سے بہتر طریقے پر کیا بیان ہو سکتی ہے مگر سچل نے اس سے برسوں پہلے کہا تھا۔

ے سچل نہ میرا نام ہے وہ نام میرا پاک ہے
میں خود سراپا عشق ہوں ہم گوئے ہم چوگان ہوں

ذوقِ شعری مانع سے انصاف طلب ہو سکتا ہے، اگر اس شعر کی سادگی اور صاف بیانی پر سندھ کے سرمست شاعر کو خراجِ تحسین پیش نہ کیا جائے اور اردو زبان فریادی ہو گی، اگر اس کے دامن میں سچل کو وہ اعزاز نہ دیا جائے جو انہیں سندھی اور فارسی میں حاصل ہے۔ [۱۳۱]

میر کرم علی خاں کرم

میر کرم علی خاں میر صوبیدار خاں تالپور کے بیٹے تھے۔ دوسرے بھائیوں کی طرح ان کی تعلیم و تربیت بھی شاہانہ ماحول میں ہوئی۔ ۱۲۲۷ھ میں وہ میر غلام خاں کے انتقال پر حیدر آباد میں تخت نشین ہوئے۔

میر کرم علی خاں بڑے ادب پرور حکمراں تھے۔ ان کا دربار علماء، فضلاء، ادباء اور شعراء سے بھرا رہتا تھا۔ ۱۲۴۴ھ میں وفات پائی اور اپنے بعد ایک شاہی حکومت کے تذکرے چھوڑ گئے۔

میر کرم علی خاں تالپور حکمرانوں میں فارسی کے پہلے صاحب دیوان شاعر تھے اردو میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ ایک غزل کے تین شعر نمونۃً درج کیے جاتے ہیں جن سے قدرتِ کلام اور زبان کی شستگی اور صفائی کا اندازہ ہو گا۔ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے شعر اس دور میں کہے گئے ہوں۔

؎ صبح دم یاد مجھے چاک گریباں آیا پھر تصور میں مرے وہ رخ تاباں آیا

---

[۱۳۱] مضمون "سچل سرمست کی اردو شاعری" از آفاق صدیقی مطبوعہ ماہنامہ مشرب کراچی صفحہ ۳۲، جون، جولائی ۱۹۵۶ء

مضمون سچل کی اردو اور فارسی شاعری از نسیم امروہوی مطبوعہ اردو نامہ کراچی صفحہ ۱، جولائی ستمبر ۱۹۶۱ء

مضمون سچل کا اردو کلام از احسان بدوی مطبوعہ ساقی کراچی صفحہ ۲۱م، اگست ۱۹۵۶ء۔

مضمون سچل سرمست از عبدالواحد سندھی مطبوعہ ماہ نو کراچی صفحہ ۸۸، اگست ۱۹۵۱ء

سیر گلشن میں نظر میری پڑی غنچوں پر	دل میں پھر میرے خیال لب خنداں آیا
سیر بستاں میں مرے سامنے آیا سنبل	دل یہ بولا کہ وہی گیسوئے پیچاں آیا[۲۰]

میر مراد علی خاں علیؔ

میر کرم علی خاں کے چھوٹے بھائی تھے جو کرم علی خاں کی وفات پر ۱۲۴۳ھ میں مسند امارت پر بیٹھے اور ۱۲۴۹ھ میں وفات پائی۔

انہوں نے کرم علی خاں کی ادبی روایات کو برقرار رکھا۔ خود بھی عالم و فاضل اور شاعر تھے اور ادباء و شعراء کی قدر دانی بھی کرتے تھے۔ کئی کتابیں ان کی یادگار ہیں طب کی کتاب کا نام انہوں نے "طب مراد" رکھا تھا۔

فارسی کے ساتھ ساتھ وہ اردو کے بھی شاعر تھے اور علیؔ تخلص کرتے تھے۔

ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔ جن کا انداز بیاں انیسویں صدی عیسوی کی ابتدا کا معلوم ہی نہیں ہوتا۔ مصرعوں کی روانی اور الفاظ کی تراش خراش دور حاضر کی نمائندگی کرتی ہے۔

۔ مجھ پر جو ہے احسان گرانبار صنم کا	میں کیا کہوں، ہوں میں تو خریدار صنم کا
نکلا جو کبھی مہر جبیں ابر سیہ سے	یاد آیا مجھے چہرۂ گلنار صنم کا
کیا سرو کو نسبت قد موزوں سے کوئی دے	وہ خود ہی ہے گرویدۂ رفتار صنم کا[۲۱]

میر غلام علی مائلؔ

میر غلام علی مائل میر علی شیر قانع کے صاحبزادے تھے۔ ۱۱۸۱ھ میں پیدا ہوئے

---

[۲۰] سندھ میں اردو شاعری از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صفحہ ا، مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سنہ ۱۹۷۰ء

[۲۱] سندھ میں اردو شاعری از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صفحہ ۳، مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سنہ ۱۹۷۰ء

ان کا ماحول خالص علمی اور ادبی تھا لہٰذا تعلیم کے تکملہ کے ساتھ ساتھ اپنے چچا میر ضیار اور چچا زاد بھائی عظیم سے استفادہ کرتے رہے ۔ ۱۲۵۱ھ میں ستر سال کی عمر میں انتقال کیا۔

مائل میر کرم علی خاں کے درباری شاعر تھے، فارسی زبان پر قدرت کا ملہ رکھتے تھے اور اردو میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ انہوں نے غزلیں، منقبتیں، سلام اور مرثیے سب کچھ کہا ہے اور سندھی ادبی بورڈ کراچی سے ان کا کلیات شائع ہو چکا ہے۔ اردو کا ایک مختصر انتخاب نمونہ کلام کے طور پر پیش ہے۔

اے صبا جا در مدینہ مصطفیٰ کوں کہہ سلام	اس سراپا نور ذات کبریا کو کہہ سلام
اے صبا بعد از سلام آن رسول مقتدا	جا شتابی در حریم حضرت خیر النساء
از ادب ایستادہ با صد زاری و صد التجا	یعنی بذات رسولِ مقتدا کوں کہہ سلام

ہے جہاں پر خروش اس غم سوں	آسماں سبز پوش اس غم سوں
دل و جاں خوں بجوش اس غم سوں	خوں بگریند از برائے حسین [۴۲]

میر محمد نصیر خاں جعفری

میر محمد نصیر خاں میر مراد علی خاں کے صاحبزادے تھے، ۱۲۱۹ھ میں پیدا ہوئے اور باپ کی وفات پر بڑے بھائی میر نور محمد خاں کے ساتھ شریک حکومت ہوئے ۱۸۴۳ء میں جب انگریزوں نے سندھ فتح کر لیا تو ان کو قید کر کے کلکتہ بھیج دیا جہاں انہوں نے ۱۲۶۱ھ میں وفات پائی۔

جعفری بھی اپنے اسلاف کی طرح قدر دان شعر و سخن تھے۔ ان کے ہٹتے ہی علم و ادب کی محفلیں ویران ہو گئیں پھر ان میں کبھی وہ پہلی سی رونق نہ آ سکی۔

---

[۴۲] تکملہ مقالات الشعرا از مخدوم محمد ابراہیم خلیل ٹھٹھوی ص ۵۴۳ تا ص ۵۴۴ مطبوعہ ادبی بورڈ حیدر آباد ۱۹۵۸ء
کلیات مائل مرتبہ محمود احمد عباسی مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ ۱۹۵۹ء

نے فارسی تصانیف میں دیوان جعفری، مثنوی مرزا صاحبان، مثنوی مختار نامہ، سفر نامہ جعفری اور مکاتیب جعفری چھوڑے ہیں۔ اردو کا ایک مختصر دیوان ہے اس کا نام بھی دیوان جعفری ہی ہے۔ [۲۵]

ایک غزل کے چند شعر اور ایک منقبت کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔

سہ میرا سینہ تو ہے گنج سعادت عشق جاناں کا	یہ سر ہے بہر سجدہ، شکر کرتا ہوں میں سجاں کا
پڑا ہوں بستر غم پر نہیں گر پوچھنے والا	ترا دیدار چارہ ہے دل بیمار ہجراں کا
دعائے جعفری صبح و مسا گر ہے تو بس یہ ہے	کہ روضہ دیکھ لوں میں، یا خدا، شاہ خراں کا

تم سوا کوئی وصی احمد مختار نہیں	جانشین نبوی دین کا سردار نہیں
یا علی جلد خبر لیجئے از بہر خدا	تجھ سوا اور کوئی میرا مددگار نہیں

کلام کی صفائی اور روانی میں وہی باپ اور بڑے بھائی کا رنگ ہے۔

میر صوبدار خاں میر

میر صوبدار خاں میر فتح علی خاں بانی حکومت تالپور کے صاحبزادے تھے، ۱۲۱۷ھ میں پیدا ہوئے پہلے اپنے چچا زاد بھائیوں کے ساتھ حکومت میں شریک رہے۔ انگریزوں نے غلط فہمی میں ڈال کر انہیں اپنی سازش میں شریک کر لیا تھا لیکن سندھ فتح کرتے ہی دوسرے میروں کے ساتھ گرفتار کر لیا اور کلکتہ بھیج دیا جہاں انہوں نے ۱۲۶۲ھ میں انتقال کیا۔

صوبدار خاں میر کو شعر و ادب سے بہت دلچسپی تھی۔ انہوں نے فارسی تصانیف میں دیوان میر، مثنوی فتح نامہ سندھ، مثنوی سیف الملوک، مثنوی خسرو شیریں، مثنوی قصہ ماہ و مشتری اور طب کی ایک کتاب خلاصۃ التداوی چھوڑی ہے۔

فارسی کے علاوہ سندھی اور اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ ایک غزل کے چند

---

[۲۵] تکملہ مقالات الشعراء از مخدوم ابراہیم خلیل ٹھٹھوی صفحہ ۱۰۵ تا ۱۱۱ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد ۱۹۵۸ء

شعر پیش ہیں۔

اے دل ہیں سنے تو نے تو اخبار محبت — کیوں تجھ کو پسند آگیا آزار محبت
کیوں آیا نہ اب تک وہ کوئی اس سے یہ پوچھے — ہے اب تو کوئی دم کا یہ بیمار محبت
دعوائے محبت سے ہے کانٹوں میں الجھنا — کیوں مدعی بنتا ہے گرانبار محبت [۳۶]

حمل خانِ لغاری

حمل خاں بن رحیم خاں لغاری اندازاً سنہ ۱۲۲۵ھ میں بمقام خیر پور پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق بلوچوں کے "میرکانی" قبیلے سے تھا۔ تکملۂ تعلیم کے بعد انہوں نے میر خاں لغاری گاؤں، علاقہ سکرنڈ میں مستقل سکونت اختیار کر لی جہاں سنہ ۱۲۹۶ھ میں وفات پائی۔ وہ ایک ذہین، دانشمند، سنجیدہ اور صلح جو انسان تھے، سندھی اور سرائیکی زبانوں کے بلند پایہ شاعر تھے اور ان کا کلام لگ بھگ ہر صنف سخن پر مشتمل ہے —— صوفی منش تھے اور لواری کی درگاہ کے حلقہ بگوش تھے۔ والی خیر پور میر علی مراد خاں نے ان کا شمشاہی وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔

اُردو میں بھی شعر کہتے تھے جس کا نمونہ درج ذیل ہے۔

جس کو ہے داغ جگر اسکو نہیں آرام دل — عشق میں پکا نہیں وہ بے خبر ہے خام دل
ایک پل مجھ سے جدا ہووے نہیں او ماہرو — دیکھ دل کے درد کاٹوں، یہ ہے میرا کام دل

دل رام نہ آوے تو دل آرام نہ آوے
دل رام نہ آوے تو صبح شام نہ آوے
گر مطرب و مرغ و مے ہوویں "حمل" حاضر
بے دوست دل رام کسی کام نہ آوے [۳۷]

---

[۳۶] "سندھ میں اردو شاعری" از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صفحہ ۸۰ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سنہ ۱۹۷۰ء

[۳۷] ماخوذ از کلیات حمل فقیر مرتبہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد سنہ ۱۹۵۳ء

محمد یوسف فقیر آگڑہ

فقیر محمد یوسف آگڑہ نامی گاؤں میں ۱۲۰۰ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے سچل سرمست کے مرید تھے اور ان سے بڑی عقیدت رکھتے تھے چنانچہ بیعت لیتے وقت مرید سے اردو میں کہتے۔

"تم بھی سچے گا، میں بھی سچے گا!

ایکبار پنجاب گئے تو ننکانہ صاحب سے اپنے نام کے ساتھ نانک کا اضافہ لیکر واپس ہوئے اور اس وقت سے نانک یوسف کہے جانے لگے۔ مستی اور سرشاری کی ایک کیفیت ان پر ہر وقت طاری رہتی۔ موسیقی سے ایک خاص لگاؤ تھا اور بعض وقت خود بھی رقص کرنے لگتے تھے۔ ۱۲۶۹ھ میں انتقال کیا۔ فارسی، سندھی، سرائیکی اور اردو میں شعر کہتے تھے۔ بعض کافیوں کے مطلعے اردو میں ہوتے تھے۔ چند کافیاں ملاحظہ ہوں۔

منصب ہے عشق عاشق مقصود یک نگاہ — مجھکوں بر آستانہ مسجد سلام ہے
در پیچ زلف نانک یوسف تو آمدہ — تر طیھن سے چھوٹے ناہیں چھوٹا کلام ہے

میں پیاسے ناب تجھ لب کا — سو گلگوں شراب تجھ لب کا
سیم مصحف رخ تمہارا ہے — ہم پڑھتے کتاب تجھ لب کا [۳۸]

خلیفہ نبی بخش لغاری "قاسم"

خلیفہ نبی بخش کے والد بالاچ خاں لغاری ضلع حیدرآباد کے ایک گاؤں میٹھی کے رہنے والے تھے۔ اسی مقام پر ۱۱۹۰ھ میں خلیفہ کی ولادت ہوئی۔ حصول علم سے فارغ ہوکر ابھی انہوں نے معمولات زندگی شروع ہی کئے تھے کہ بیس سال کی عمر میں عشق کا سودا ہو گیا اور پھر مجبور ہمیشہ کے لیے داغ مفارقت دے گئی۔

---

[۳۸] "سندھ میں اردو شاعری" از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صفحہ ۸۰ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۷۰ء

انجام کار دل دنیا سے اچاٹ ہو گیا اور عشق مجازی نے عشق حقیقی کی شکل اختیار کرلی ــــ اب وہ پیر پگاڑو کے جد اعلیٰ حضرت پیر محمد راشد کے خلیفہ کے سوا کچھ نہ تھے اور ان کا مقصد حیات صرف یاد الٰہی اور تبلیغ دین و طریقت رہ گیا تھا لہذا ایک عرصے تک گجرات و کاٹھیاوار میں گھوم پھر کر رشد و ہدایت کرتے رہے پھر ٹنڈو باگو سے چھ میل دور ایک گاؤں میں گوشہ نشیں ہو گئے اور وہیں ۱۲۴۸ھ میں وصال فرمایا۔

خلیفہ نبی بخش سندھی اور سرائیکی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ اردو میں بھی شعر کہتے تھے جو مختلف اصناف سخن پر مشتمل ہیں۔ شاعرانہ حیثیت کے اندازے کے لیے مختصر سا انتخاب دیا جا رہا ہے۔

مجھ تشنگی کی آگ بجھانے کوں نہ آیا — پھر جام وصل جانی پلانے کوں نہ آیا
تجھ عشق کی آتش میں سدا جلتا رہا میں — ٹک نین بھی نینوں سے ملانے کوں نہ آیا
ہم عاجز و مسکین کوں کب ہاتھ سے اپنے — یکبار سجن پان کھلانے کو نہ آیا!

میر شہداد خاں حیدری

میر شہداد خاں میر نور محمد خاں کے بیٹے تھے جو باپ کے مرنے کے بعد بھائی کے ساتھ شریک حکومت ہوئے۔ بزرگوں کی طرح انہیں بھی کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا اور وہ ذوق سلیم بھی رکھتے تھے۔ میروں کا زوال ہونے پر انگریزوں نے سوات میں قید کر دیا تھا جہاں ۱۲۴۸ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

میر شہداد خاں فارسی، سندھی اور اردو کے شاعر تھے اور حیدری تخلص کرتے تھے۔ "دیوان حیدری" ان کی یادگار ہے [۲۵۰]

ایک غزل کے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

گوندھ تو زلف پریشاں کو پریشاں مت ہو — دیکھ کر مجھ کو پراگندہ تو حیراں مت ہو
بوئے مشک ختن عشق کا عادی دل ہے — اے شہ حسن پس پردہ تو پنہاں مت ہو

---

۲۵۰ رسالۂ خلیفہ نبی بخش لغاری مرتبہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صفحہ ۲۴۲ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد سندھ ۱۹۶۲ء

"حیدری" ہوگا تو آزاد نہ گھبرا ہرگز ناامید از کرم شاہ شہیداں مت ہو[۱]

قادر بخش بیدل

قادر بخش ۱۲۳۱ھ میں بمقام روہڑی پیدا ہوئے۔ ان کے والد کپڑا بنتے تھے۔ اور شاہ عنایت اللہ شہید کے مرید تھے۔ قادر بخش کا رجحان شروع ہی سے تصوف کی طرف تھا لہٰذا علوم ظاہری کی تحصیل کے بعد سیوہن میں حضرت سخی شہباز قلندر کے مزار پر جاروب کشی کرنے لگے پھر پیر صبغت اللہ (پیر پگارطو) سے فیض روحانی حاصل کیا۔ آخر روہڑی واپس آکر تجارت کو ذریعہ معاش بنالیا اور رشد و ہدایت اور خدمت خلق کرتے کرتے ۱۲۸۹ھ میں انتقال فرمایا۔

شاعری میں وہ بیدؔل تخلص کرتے تھے۔ ان کی نثری تصانیف ہیں پندرہ کتابیں ہیں جو بیشتر مذہب اور تصوف سے متعلق ہیں۔ فارسی، سندھی، سرائیکی اور اردو میں مختلف اصناف سخن پر مشتمل کلام پایا جاتا ہے خصوصیت کے ساتھ وہ اردو کے صاحب دیوان شاعر تھے اور شعر گوئی پر قدرت رکھتے تھے۔

ان کی زبان تیرھویں صدی ہجری کے شعراء کی سی ہے لیکن بیان میں پختگی، بے ساختگی، روانی اور ایک عارفانہ سرمستی پائی جاتی ہے۔ ہندی اور سندھی الفاظ کی آمیزش بعض مقامات پر بہت لطف دیتی ہے اور اردو میں بیدل کی انفرادیت قائم کر دیتی ہے۔ نمونہ کلام میں چند غزلوں کے اقتباسات ملاحظہ ہوں:

ے مجلس وجد میں کیا کام ہے خود بینوں کا
بزم رنداں میں نہیں زاہد مستور کی بات

ے وہی اول، وہی آخر، وہی ظاہر، وہی باطن
خودی کے زنگ میں مخفی جو ہے وہ سب عیاں ہوگا

---

[۱] تکملۂ مقالات الشعراء از مخدوم محمد ابراہیم خلیل مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد ۱۹۵۸ء

سہ حیراں ہوں، قد کو تمہارے میں کیا کہوں
طوبیٰ کہوں کر سرو کہ نخل وفا کہوں
خال سیہ ترے کو جو ہے عکس داغ دل
اسود حجر کہ دانۂ مرغ ہوا کیوں!
ابرو تمہارے کوں جو ہیں مثل ہلال عید
محراب سجدہ، طاعت اہل صفا کہوں
تیری گلی کی خاک کو بیدلؔ کے واسطے
یا غالیہ عبیر کہوں، تو تیا کہوں

رات تجھ بن پکار رکھتے ہیں
دن سبھو انتظار رکھتے ہیں
برق رخسار کے تماشا میں
دیدہ ابر بہار رکھتے ہیں [41]

صوفی ابراہیم شاہ فقیر

ابراہیم شاہ سندھ کے مشہور بزرگ عنایت اللہ شاہ شہید کی اولاد میں تھے ۱۲۴۲ھ میں قریہ جھوک عرف میران پور میں پیدا ہوئے اور ۱۲۹۱ھ میں رحلت فرمائی۔
کافی گو شاعروں میں ابراہیم شاہ کو ایک خاص مقام حاصل تھا، "فقیر" اور "صوفی" تخلص کرتے تھے۔ اردو میں بھی کافیاں کہی ہیں نمونہ ملاحظہ ہو۔

جدائی میں جیون مشکل، سجن بن حال حیراں ہے
جسے دن موں سجن بچھڑا، مرے دل تپ رہی جل جل
وداع کی آگ بجلی جیوں، ابر چشماں چوں باراں ہے
لگا ہے عشق موں دل سوں، نہیں سونا صحی اک پل!
غذا ہے طعام خوں خوردن، بساطی سیج خاراں ہے [42]

---

[41] دیوان بیدل مرتبہ عبدالحسین شاہ موسوی مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد ۱۹۵۴ء۔

[42] سندھ میں اردو شاعری صفحہ ۱۱۱ از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۷۰ء۔

فتح دین شاہ جہانیاں پوٹہ

فتح دین شاہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی اولاد میں تھے۔ آپ کے والد وید عل شاہ بھی ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ بیٹا بھی باپ کے نقش قدم پر چلا اور فتح دین شاہ نے ہوش سنبھالتے ہی فضل اللہ شاہ قلندر کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ ۱۲۹۱ھ میں اپنے آبائی گاؤں ٹنڈو جہانیاں میں انتقال فرمایا۔

آپ فارسی کے صاحب دیوان شاعر ہیں۔ فتح تخلص کرتے تھے اردو میں 'کافی' کے رنگ کے شعر پائے جاتے ہیں مگر بہت کم۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

ے ہوائے بےخودی آئے خودی کی دھول اڑا جائے
صدف کر سینے کو اپنا عجب گوہر چھپایا ہے
جلالی جوش کے جذبے جسم کوں خود جلایا ہے
فتح ہے دین کی ہر دم کفر کو مٹایا ہے [۵۲]

میر حسین علی خاں تالپور "حسین"

میر حسین علی خاں بن نور محمد خاں حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم حاصل کی اور وہیں سے شعر گوئی کا آغاز کیا۔ انتزاع حکومت سندھ ہونے پر میر دوسرے میروں کی طرح کلکتے میں قید کر دئے گئے۔ ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی میں انگریزوں کی مکمل فتح ہونے پر رہا کر دئے گئے اور ۱۲۹۵ھ میں بمقام حیدر آباد وفات پائی۔

میر حسین کو فارسی، سندھی اور اردو زبانوں کے ادب سے بڑا لگاؤ تھا اور تینوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ فارسی نثر میں تین کتابیں مناقب علوی، شاہد الامامت اور لب لباب، نظم میں ایک دیوان فارسی و اردو اور ایک دیوان اردو مصور ان کی یادگار

---

[۵۲] صوفیائے سندھ اور اردو صفحہ ۱۰۷ از پروفیسر معین الدین دردائی مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۶۳ء

ہیں۔ چند اردو شعر نمونتہً درج کئے جاتے ہیں۔

مخفی ہوا تھا ذرہ محمد کے نور کا ۔۔۔۔ آیا ہے اب تو دور انہیں کے ظہور کا [۲۴۴]

نظر دلبر کی مجھ سے آج بے تقصیر پھرتی ہے ۔۔۔۔ نہیں چلتی ہے تب تدبیر جب تقدیر پھرتی ہے

خدا کرے کہ کسی کا جدا حبیب نہ ہو ۔۔۔۔ یہ بد دعا کسی دشمن کو بھی نصیب نہ ہو

علاج درد جدائی کا کیا کریں حکماء ۔۔۔۔ بجز وصال تمہارے کوئی طبیب نہ ہو

غریب بیکس و بیمار و بے وطن بے یار ۔۔۔۔ ہمارے سا کوئی دنیا میں لس غریب نہ ہو

رہا نہ مال، نہ لشکر، نہ ملک، نہ طالع ۔۔۔۔ کوئی بھی سایہ عالم میں بے نصیب نہ ہو

"حسین" بلبل گل کو کہا تھا دیکھ کے خار

بہوت خوب ہیں سب یار گر رقیب نہ ہو

ہر شعر درد و تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ جیسے بہادر شاہ ظفر سندھی لب و لہجہ میں بول رہے ہوں۔

غلام حیدر فقیر

غلام حیدر کے اسلاف کا وطن بلوچستان تھا۔ ان کے والد رئیس قائم خاں ۱۲۰۱ھ میں ریاست خیرپور آئے تھے اور پھر وہیں رہ پڑے۔ خیرپور ہی میں ۱۲۱۵ھ میں غلام حیدر کی ولادت ہوئی۔ تحصیل تعلیم کے بعد خیرپور ہی میں ملازمت کر لی۔ ۱۲۴۸ھ میں والد کی وفات پر ان کی جگہ شکارپور کے پٹواری ہو گئے۔ اسی دوران وہ فقیر یوسف نانک سے متاثر ہو گئے اور ملازمت ترک کر کے فقیری اختیار کر لی۔

اس کوچے میں انہوں نے اعلیٰ مرتبہ حاصل کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اپنے مرشد کی

---

[۲۴۴] تکملہ مقالات الشعراء از مخدوم محمد ابراہیم خلیل ٹھٹھوی صفحہ ۵۶۷ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد ۱۹۵۶ء

پشین گوئی انہوں نے پہلے سے کردی تھی جس کے مطابق ، محرم ۱۲۹۶ھ کو اس جہان فانی سے رخصت ہوگئے۔

غلام حیدر فارسی، سندھی، سرائیکی اور اردو کے شاعر تھے اور مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ اردو کا نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

؎ غلام حیدر گرو کی بات سن دل گوش سے دائم
سنیں کو وا اور دلبر، وہی ہوشیار ہوتا ہے

؎ آیا فرمان خدا کا، اوپر آدم کا یہ کلمہ — تماشا طور سینا کا، نظر نروار آیا ہے
؎ غلام حیدر، نبی سرور علی دم نور کا شعلہ — کلی دم نور کا نعرہ بھر بازار آیا ہے[۴۵]

محمد محسن بیکس

محمد محسن سندھ کے نامور شاعر قادر بخش بیدل کے بیٹے تھے ۱۲۷۵ھ میں بمقام روہڑی پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم آخوند عبداللہ سے حاصل کی۔ چودہ سال کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا مگر اس وقت تک ان کا مبلغ علم اور فکری سطح بلند ہو چکی تھی۔ لہذا ایک سال بعد ہی سخی شہباز قلندر کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور وہاں سے پلٹے تو فارسی کے شاعر تھے۔

بیدل کا بیٹا موروثی اور فطری صلاحیت کی بدولت شعر و سخن کے میدان میں اس تیزی سے آگے بڑھا کہ اپنے دور میں کوس لمن الملک بجا دیا۔ انہوں نے سندھی سرائیکی اور اردو کی مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی اور کافیوں کو اپنے نام سے مختص کر لیا۔

عمر وفا کرتی تو ہر چہار زبان کا اتنا ذخیرہ چھوڑ جاتے کہ سندھ کیا، دور دور تک

---

[۴۵] "سندھ میں اردو شاعری کا ارتقاء" از معراج نیر ص ۹۰ مطبوعہ الحمرا اکیڈمی لاہور ۱۹۹۳ء بحوالہ مقالہ غلام محمد چنڑ برائے ایم اے شعبہ سندھیالوجی سندھ یونیورسٹی حیدرآباد

کوئی جواب دینے والا نہ ملتا مگر ۱۲۹۸ھ میں عمر کے تئیس سال پورے کئے بغیر خالق حقیقی سے جا ملے اور اپنے اشعار کی ایک محدود تعداد چھوڑ گئے جو کم ہونے کے باوجود نادرات میں ہے۔

جنازہ لے چلو یارو سجن کے کوچے میں میرا
(جیتے) جیتے مرتے گلی اس میں، مرا ہے رین دن پھیرا
دیکھیں گے جب فراقی دل اسی دروازہ دلبر کو
کریں گے سجدہ اور بولیں گے ہوں زخمی پیا تیرا

شہنشہ قلندر راتوں ہی ہادی میرا	سوا تیرے صاحب نہیں اور میرا
ملا یار مجھ کوں، جو ہے خود خیالی	ہر دل جاری شہا حکم تیرا [۵۲]

میرزا فتح علی بیگ

میرزا فتح علی بیگ میرزا مراد علی بیگ کے صاحبزادے تھے، ۱۲۱۵ھ میں بمقام ٹنڈو آغا حیدرآباد پیدا ہوئے، علمی ماحول میں پرورش پائی اور سن شعور پہ پہنچ کر امیران سندھ کی امام بارگاہوں میں مرثیہ خوانی کرنے لگے ۱۲..ھ میں وفات پائی۔

ذوق شعری فطرت سے ودیعت ہوا تھا لہذا شروع ہی سے سندھی اور اردو میں شعر کہتے تھے۔ قصائد، رباعیوں، سلاموں، نوحوں اور مرثیوں کا ایک ذخیرہ انہوں نے یادگار چھوڑا ہے۔ سندھی مرثیوں کی ترقی میں ان کا بھی حصّہ ہے۔

اُردو نعت اور منقبت کے چند اشعار نمونے کے طور پر پیش ہیں۔

~ کس درجہ ہیں ہشیار میں رندان محمد	پیتے ہیں فقط بادۂ عرفان محمد
مقدور کہاں ہے کہ لکھوں نعت نبی میں	خلاق محمد ہے ثنا خوان محمد
سلطانی عالم در حضرت ہے گدائی	رتبے میں سلیمان ہے سلمان محمد

---

[۵۲] دیوان بیکس مرتبہ عبدالحسین شاہ موسوی مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ ۱۹۶۵ء

آئے ہیں زیارت کو ملک عرش بریں سے — اے صلِّ علیٰ عظمت ایوان محمد
آیات الٰہی سے فتح یہ ہوا ظاہر — ہے ایک غرض، شان خدا، شان محمد

حسنِ انداز بہار روح پرور دیکھئے — گلشن احمد میں اک تازہ گل تر دیکھئے
غنچے کھلتے ہی کھلے اسرار باغ دو جہاں — پتے پتے میں ضیائے روئے حیدر دیکھئے
دست حق سے لڑ رہی ہے آج دنیا کفر کی !!
منہ کے بل گرتے ہیں بت، کعبہ میں چل کر دیکھئے ۴۷

انداز بیان اور مصرعوں میں وہ روانی ہے کہ جیسے یہ شعر تیرھویں صدی ہجری کے بجائے چودھویں صدی میں کہے گئے ہوں اور سندھ کے بجائے دلی یا لکھنؤ میں بیٹھ کر نظم کئے گئے ہوں۔

نواب اللہ داد خاں لغاری "صوفی"

نواب اللہ داد کے والد نواب ولی محمد خاں دربار تالپور میں وزیر اعظم تھے۔ اس رشتے سے نواب اللہ داد کم سنی ہی میں میر محمد نصیر خاں کی حکومت میں ایک باعزت منصب پر فائز ہو گئے۔ زوال حکومت ہونے پر تقریباً دو سال تک پریشان رہے پھر انگریزوں کی ملازمت کرلی۔ ۱۲۳۶ھ میں وہ پیدا ہوئے تھے ۱۳۰۰ھ میں بمقام کوٹ لاشاری نزد سیوہن انتقال کیا۔

وہ ایک صوفی منشی ادیب و شاعر تھے۔ اور صوفی ہی تخلص کرتے تھے۔ عموماً فارسی میں طبع آزمائی کرتے، کبھی کبھی سندھی، سرائیکی اور اردو میں بھی مشق سخن کرلیتے تھے۔ فارسی میں مثنوی تسکین و شیدا، مثنوی اصغر، مثنوی مسکین اور ایک دیوان ان کی یادگار ہے۔ اردو اشعار کا نمونہ حسب ذیل ہے :-

---

۴۷ "سندھ میں اردو شاعری" از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صفحہ ۱۳۶ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۷۰ء

مکھ اوپر زلف کوں لایا نہ کرو — رین میں دن کو چھپایا نہ کرو
گر تجھے پاس ہے صوفی کی عزیز — پاس غیروں کے تو جایا نہ کرو

متاعِ عشقِ جاناں کی اگر لینے تو ہم لیتے — دل و جاں کی بہا سے یہ ثمر لیتے تو ہم لیتے
مزا پایا ہے میں نے ان لبوں کی تلخ گوئی میں — اگر شیریں زبانی کی شکر لیتے تو ہم لیتے

نواب تاج محمد خاں لغاری

نواب تاج محمد نواب اللہ داد خاں کے چچیرے بھائی تھے اور دونوں لگ بھگ ہم سن تھے، ذوقِ شعری بھی ان میں مشترک تھا مگر نواب تاج محمد خاں کا رجحان "کافی" کی طرف زیادہ تھا۔ نمونے میں ایک کافی درج کی جاتی ہے جو "سندھ میں اردو شاعری"[۴۸] سے ماخوذ ہے۔

مجھ ہے فراق دیدن یاراں بسے تمام — مانگوں دعا ملن کی ہر روز صبح و شام
یارب دکھلئے مجھکو آں دوست دلربا — شکرے بجا تمایم اے احکم الحکام

ساقی بیا بمادہ آں لعل گوں شراب
جس کا نشہ ہے غالب کلّی اوپر تمام [۴۹]

قاضی غلام علی جعفری

قاضی غلام علی بن قاضی محمد یحییٰ جعفری حضرت جعفر طیار کی اولاد میں تھے۔ مخدوم محمد ابراہیم خلیل کے شاگرد تھے اور ان کے دادا سے ارادت رکھتے تھے، متقی اور پرہیزگار تھے، فارسی کے قادر الکلام شاعر اور صاحب دیوان تھے۔ اردو شعر گوئی میں بھی انہیں مہارت تامہ حاصل تھی۔ اردو غزلیات دیوان فارسی میں شامل ہیں جو سندھی

---

[۴۸] "سندھ میں اردو شاعری" از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صفحہ ۱۳۸ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۷۰ء
[۴۹] "سندھ میں اردو شاعری" از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صفحہ ۱۴۰ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۷۰ء

ادبی بورڈ میں محفوظ ہے۔ ۵۰ھ

مخدوم امین محمد امین

مخدوم امین محمد ولد مخدوم محمد زماں ۱۲۵۴ھ میں ہالہ شریف میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب مخدوم نوح سہروردی سے ملتا ہے۔ درسیات میں اخوند محمد قاسم کے شاگرد تھے، باطنی تعلیم پدر محترم سے حاصل کی۔ پندرہ سال کی عمر میں درگاہ شریف ہالہ کے سجادہ نشین ہو گئے اور ۱۳۰۳ھ میں وصال ہونے تک عوام الناس کی ہدایت کرتے رہے
آپ سندھی زبان کے بہت اچھے شاعر تھے۔ اردو میں بھی شعر کہتے تھے جن میں عارفانہ نکات بیان کرتے تھے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

تجھ دام سے مجھ دل کو چھڑا کون سکے گا	تقدیر کے لکھے کو مٹا کون سکے گا
مژگاں کے تیروں سے تو زخمی ہیں ہزاروں	گھائل کو ترے دیکھ بچا کون سکے گا

لوگوں، محفل میں کیا کروں اظہار	میں نے دیکھا وہ دلربا دلدار
اتو اک بات سے بھی ہوں لاچار	یار کہتا ہے، ہو خموش خموش ۵۱ھ

پیر حزب اللہ شاہ تخت والا

پیر حزب اللہ شاہ ۱۲۵۸ھ میں پیدا ہوئے، بڑے خدا رسیدہ بزرگ اور فارسی و عربی کے عالم تھے، مسکین تخلص کرتے تھے۔ ۱۳۰۸ھ میں وفات پائی۔ آپ فارسی کے بلند پایہ شاعر اور صاحب دیوان تھے، کبھی کبھی ہندی میں بھی شعر کہتے تھے۔ نمونۂ کلام حسب ذیل ہے۔

آتا ہے چمن میں یت گلفام ہمارا	ساقی بخدا بھر دے مجھے جام ہمارا

۵۰ھ تکملۂ مقالات الشعراء صفحہ ۱۱۲ تا ۱۲۰ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد ۱۹۵۸ء

۵۱ھ کلیات امین مرتبہ محبوب علی چنہ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد ۱۹۶۶ء

گر میں نے کیا اُس بت طنّاز کو سجدہ   آئے گا کسی کام یہ اسلام ہمارا [۵۲]

غلام حیدر فقیر گرناری

غلام حیدر فقیر ۱۲۲۵ھ میں قبیلہ بقیبہ میں پیدا ہوئے۔ ہوش سنبھالنے سے قبل ہی ان کا رجحان فقیری کی طرف تھا لہٰذا تعلیم ختم کرتے ہی تلاش حق میں ایک طرف نکل کھڑے ہوئے۔ جوناگڑھ کے پہاڑ گرنار پر پہنچے تو وہاں چلّہ کشی کی مگر اس سے تسکین نہ ہوئی تو پھر چل پڑے۔ آخر قسمت نے انہیں قنبر علی شاہ بھاڈوانی سے ملا دیا۔ انہوں نے جوہر قابل دیکھ کر خرقۂ خلافت سے نوازا۔ ۱۲۶۴ھ میں قنبر علی شاہ کا وصال ہوا تو غلام حیدر گمنامی میں ان کے جانشین ہوئے مگر مرشد سے انہیں اتنی عقیدت تھی کہ عمر بھر ان کے مزار پر جاروب کشی کرتے رہے حتیٰ کہ ۱۳۱۱ھ میں خالق حقیقی سے جا ملے۔

غلام حیدر گرناری، ایک مقدس صوفی اور مکمل ولی تھے۔ مرشد کی تقلید میں سندھی، سرائیکی اور اُردو میں بیت، وائیاں لکھتے تھے۔ نمونۂ کلام مندرجہ ذیل ہے۔

(دکھے) دیکھے جب چشم پیارے کے تو ہم مستان ہو جاتے
سر و پا کوں برہنہ کر اگر عریاں ہو جاتے
مرا محبوب اَب آیا، ہمارے کول آ دیکھو
کلی دل کی صفا کر کے گھنگھٹ کوں کھول آ دیکھو [۵۳]

حاجی محمد فضل "ماتم"

محمد فضل ماتم ۱۲۳۰ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے، نسلاً عباسی تھے۔ حیدر آباد

---

[۵۲] صوفیائے سندھ اور اُردو از پروفیسر معین الدین دردائی صفحہ ۲۰۹ مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۶۲ء

[۵۳] ماخوذ از سندھ میں اُردو شاعری کا ارتقاء از معراج نیر صفحہ ۱۹ مطبوعہ الحمراء اکیڈمی لاہور ۱۹۶۲ء بحوالہ سندھی مقالہ برائے ایم۔اے از غلام محمد جتنہ سندھ یونیورسٹی حیدر آباد ۱۹۵۹ء

میں تعلیم وتربیت ہوئی لیکن وہ مختلف مقامات کا گشت لگاتے رہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ کبھی بنگال کی طرف بھی گئے تھے۔ زیارت حرمین سے بھی مشرف ہوئے مگر گھوم پھر کر پھر حیدرآباد آ گئے۔ ۱۲۱۲ھ کے قریب وفات پائی۔

انہوں نے یہ تخلص ماتم آل عبا کی رعایت سے اختیار کیا تھا اور سندھی اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کی حیثیت ہر دو زبان میں استادانہ تھی اور اُردو میں تو وہ سندھ کے پہلے شاعر تھے جنہوں نے پوری خود اعتمادی کے ساتھ کبھی خاقانی اور جامی کی ہمسری کا دعویٰ کیا اور کبھی سودا و آتش اور رند کو للکار دیا حالانکہ وہ ان سب کے پرستار تھے۔

اس فنکارانہ اعتماد کے باوجود ان میں انکسار بھی تھا چنانچہ کہتے ہیں۔

ـــــ میں ہوں نادان، دور افتادہ دانائی کے دیوان سے

نہ ثانی ہوں "صحابی" کا، نہ ہم بزم "بیاضی" ہوں

پریشاں دل ہوں میں تنہائی سے اے ماتم زمانے میں

نہ ہم دوران "فیضی" ہوں، نہ ہم عصر "فیاضی" ہوں

مگر اسی کے برعکس کے جب شاعرانہ انا بیدار ہوتی ہے تو ان کی زبان سے نکل جاتا ہے

شاعران سندھ سے ماتم تم آج ـــــ شعر میں دعوائے خاقانی کرو

نیز ماتم کا بھی کلام نہیں ـــــ گرچہ شیریں ہے شعر جامی کا

یہ یقیں ہے، بے گماں اے ماتم محزوں حزیں ـــــ گر مرا دیواں پڑھے تو اپنا دیواں چھوڑ دے

دیکھ ماتم مجھے سودا نے بیاباں میں کہا ـــــ تیرے دیوان کو ہم ساتھ لئے پھرتے ہیں

اور اس میں شک نہیں کہ ماتم ایسے بانگ دہل دعووں کے مجاز بھی تھے۔ ان کا کلام واقعی اس قابل ہے کہ اسے اُردو کے مسلم الثبوت اساتذہ کے معیار پر پرکھا جائے۔ سندھ میں ان کے معاصرین گدا، مست، مرتضائی اور سانگی ہر ایک نے انہیں خراج عقیدت پیش کیا ہے ـــــ اور ان کا کلام اگر لکھنؤ پہنچتا تو غالب و مومن کے بعد کی نسل احسنت و آفریں کہے بغیر نہ رہتی۔ فیصلے کے لیے چند شعروں کا انتخاب پیش ہے

۷ پھر بہار آئی، ہوا پھر مبرا دامن گیر عشق
پھر لگے دست جنوں جانے گریباں کی طرف
عشق نے پھر مجھ کو یارو کوچہ گردی میں رکھا
دیکھ کر روتا ہوں پھر گردون گرداں کی طرف

ازبسکہ دوڑے منزل مقصود کیلئے
پہنچی ہماری گرد نہ پر کارواں تلک
سینہ ہزار ہائے تمنا سے پر تھا پر
قسمت قفس سے لے نہ گئی بوستاں تلک

عاشقی و مفلسی ہے حیف حیف
بے دلی و بے کسی ہے حیف حیف

کوئی آزاد ہو تو ہو یارو
ہم تو ہیں عشق کے اسیروں میں

دودمان درد کی شادی ہیں ہم
خاندان غم کی آبادی ہیں ہم!
اپنے آب چشم سے سرسبز ہیں
زیب دشت و زینت وادی ہیں ہم
ہم گنہگار جناب عشق ہیں
عید عبادی تہ اورادی ہیں ہم
کیا کہیں، کہاں تھے، کہاں سے آئے ہیں
مثل مضمونِ نوا برادی ہیں ہم
"مثل مضمون نوا برادی" کا جواب نہیں ہو سکتا!

دل ناداں کو ہم ساتھ لئے پھرتے ہیں
دشمن جان کو ہم ساتھ لئے پھرتے ہیں
در بدر قسمت دوار پھراتی ہے ہمیں
چرخ گرداں کو ہم ساتھ لئے پھرتے ہیں
گرچہ ہیں بے سروساماں مگر از نالہ و آہ
سروساماں کو ہم ساتھ لئے پھرتے ہیں
گہہ شب وصل گہے روز فراق آتا ہے یاد
درد دوراں کو ہم ساتھ لیے پھرتے ہیں
دیدہ و دل ہیں پر از آتش و آب اپنے سدا
برق و باراں کو ہم ساتھ لئے پھرتے ہیں

ماتم کا دیوان سادے کا سارا اسی انداز کا ہے، بھرتی کے شعر بہت کم ہیں اور بعض اشعار تو نہ صرف اُردو کے اساتذہ سے متوارد ہوئے ہیں بلکہ اندازِ بیان اور طرزِ ادا میں ناقدانہ انصاف کے طالب ہیں۔ توازن و تقابل کے لیے اُردو کے دو مشہور شعروں کے بعد ماتمؔ کا شعر پیش کیا جاتا ہے۔

ع پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی پھر وہی پاؤں وہی خارِ مغیلاں ہوں گے

دوسرا شعر ہے۔

ہاتھ کو دستِ درازی کا پڑے گا لپکا پاؤں کو پھر خلشِ خار کا سودا ہوگا!

اب ماتمؔ کا شعر ملاحظہ فرمائیں۔

ہاتھوں کو پھر ہوا ہے گریباں دری کا شوق پاؤں کو پھر ہوئی ہے سلاسل کی آرزو

کیا ماتمؔ کا شعر دونوں شعروں کے بعد پڑھنے کے لائق نہیں ہے؟ اور اگر ہے تو ریگ زارِ سندھ کا شاعر اہلِ زبان نہ ہونے کے باوجود بازی مار لے گیا۔ [۵۴]

امام علی خدمتگار

امام علی میران تالپور کے خدمتی گھرانے سے تھے۔ خود میر عبدالحسین سانگی کے خدمتگار تھے ادیب بھی تھے اور شاعرانہ ذوق بھی رکھتے تھے۔ سانگی کے ایک صاحبزادے کی ولادت پر تاریخی قطعہ نظم کیا تھا جس کے چند شعر پیش ہیں۔

امیر زماں خسرو داد گر ہیں جن کے دعاگوئے برنا و پیر

خدا نے دیا اُنکو فرزند نیک زِ لطف و عنایت بفضلِ کثیر

خرد نے کہا با سرِ حمد کہہ "بود ایزدش یار و عمرش کبیر" [۵۵]

دیوان صورت سنگھ، صورت، بہار

صورت سنگھ ولد ہمت سنگھ چندیرا مانی ۱۸۵۲ء کے لگ بھگ حیدرآباد میں

---

[۵۴] ماخوذ از "سندھ میں اُردو شاعری" صفحہ ۱۶۴ تا ۱۶۷ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۷۰ء

[۵۵] "سندھ میں اُردو شاعری" صفحہ ۲۲۵ از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۶۲ء

پیدا ہوئے۔ وقت کے رواج کے مطابق فارسی تعلیم حاصل کی اور سن شعور پر پہنچ کر شعر و شاعری میں صورت بہار تخلص اختیار کیا جو اسمی مجموعہ ہے خود ان کے اور ان کے دوست دیوان بہار سنگھ کے ناموں کا۔

صورت بہار ایک طباع اور ذہین انسان تھے۔ فارسی، سندھی، سرائیکی اور اُردو شعر کہنے میں یکساں قدرت رکھتے تھے اور یہ ان کی خوش گوئی اور مہارت ہی کا کرشمہ تھا کہ ایک فارسی مثنوی سے متاثر ہو کر میر علی مراد خاں تالپور نے انہیں خیر پور آنے کی دعوت دیدی۔

صورت بہار ایک نانک پنتھی صوفی انسان تھے۔ انہیں جہاں گرونانک کی شخصیت و تعلیمات پسندیدہ تھیں وہاں وہ لال شہباز قلندر اور صوفی عنایت شہید سے بھی متاثر تھے جس کی ترجمانی ان کے کلام سے ہوتی ہے۔ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے ان کا سنہ وفات ۱۲۹۲ھ تحریر فرمایا ہے جبکہ دوسرے تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ ۱۵ اپریل ۱۸۹۷ء کو کاشی میں انتقال کیا۔ اردو کلام کا ایک مختصر انتخاب ملاحظہ کے لیے پیش ہے۔ سے

درویش کی جھولی میں خزانہ ہے غیب کا — طوبیٰ ہے، رو دنیل ہے کاسہ فقیر کا

اپنے مرشد کا فقیروں کا، خدا کا، سب کا — دیکھ جاتا ہوں میں دیدار ترے کوچے میں

جس دل کو خدا یاد وہ آباد ہمیشہ — آباد ہمیشہ ہے وہ دلشاد ہمیشہ!

جس دل کو غم اللہ کے ملنے کا دمبدم — اس دل کے غم الم سبھی برباد ہمیشہ!

واہ واہ عشقا ترا ایمان — ہیر جہنم ہوئی رانجھو جان

عاشق مجنوں، ہو یا لیلیٰ — سی جنوں ہووے پہچان

سوہنی ڈوب میں بار کے ہودی — گھر میں بختی دو دن مہمان

صورت بد کو بہار کیا تم — واہ واہ عشقا ترا احسان

سے نام تو محبوب کا پھر کام بھی محبوب ہو — خوبرو، خوش خوئے ہو، خوش نام ہو، مرغوب ہو

خوب ہونے میں خوشی، محبوب ہونے میں مزا — کیوں نہ ہو محبوب، جس کے دل کا حق مطلوب ہو

مرنے کے آگے سیں مرنا کام درویشوں کا ہے　　رند بے پروا کسی کے آگے کب مغلوب ہو

---

۵ دم مست قلندر شہ شہباز قلندر　　ہم دست خداوند کا ہم راز قلندر
سلطان فقیروں کا حقیروں کا ہے صاحب　　بخشندہ اسیروں کا غریبوں کا ہے راہب
حاکم ہے امیروں کا یتیموں کا ہے یارب　　مختار ملائک کا مولا کا ہے نائب!
دم مست قلندر شہ شہباز قلندر [۵۶]

صورت بہار کا جو دیوان موسومہ پریم نت معروف بہ صورت بہار مطبوعہ و دیا دنود کراچی بشیر مخفی مرحوم کے کتب خانہ علمیہ میں موجود ہے۔ اس میں ایک منظوم تقریظ منشی کھیم سنگھ کی بھی شامل ہے جو سندھ میں اُس دور کے ایک اور سندھی شاعر کا سراغ دیتی ہے۔ تقریظ کے اشعار کی روانی شاعر کی قادر الکلامی کو ظاہر کرتی ہے۔

۵ یہ گلزار بے خار صورت بہار　　کھلیں جس میں معنی کے غنچے ہزار
شگفتہ ہیں گل اس میں رنگین ہزار　　کئی بلبلیں ان پہ ہوئیں نثار
جو اس باغ کی سیر کرتا رہے　　سو کب خواب میں جم کا دیکھے دوار

مخدوم محمد ابراہیم خلیل ٹھٹوی

مخدوم محمد ابراہیم خلیل ۱۲۴۳ھ میں ٹھٹہ میں پیدا ہوئے۔ سات برس کی عمر میں کلام مجید ختم کرکے عربی و فارسی کا درس لینا شروع کیا اور ہوش سنبھالتے سنبھالتے تمام علوم میں دستگاہ حاصل کر لی۔ شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ ابتداءً مسکین تخلص کرتے تھے پھر مسلک تصوف کے تحت "ولی" اور آخر میں "اداسی" کو اختیار کیا۔

خلیل فارسی کے زبردست انشا پرداز اور صاحب دیوان شاعر تھے۔ دیوان خلیل اور تکملۂ مقالات الشعراء ان کی یادگار ہیں۔ اردو شاعری کا شوق انہیں غلام محمد گدا کی دوستی میں ہوا جس کا تذکرہ انہوں نے مقالات الشعراء میں کیا ہے۔ جس سے یہ حالات ماخوذ ہیں

---

[۵۶] "مضمون صورت بہار" از بشیر مخفی مشمولہ ماہ نو کراچی صفحہ ۴ جلد ۲ شمارہ ۸، نومبر ۱۹۴۹ء

غلام محمد گدا جب ٹھٹھ میں قیام پذیر ہوتے تو دن میں ایکبار ابراہیم خلیل سے ملنے ضرور جاتے تھے۔ ایک دن وہ نہیں پہنچے تو خلیل نے ایک فارسی قطعہ لکھ کر ناراضگی کا سبب پوچھا۔ گدا اس کو پاتے ہی چل پڑے اور خلیل کے سامنے پہنچتے ہی کہنے لگے

خلیل سے جو گدا لحظۂ رمیدہ ہو — تو پھر زمانے میں کس طرح آرمیدہ ہو

اس ملاقات کے بعد عصر کے وقت گدا پھر آئے تو خلیل نے ایک شعر میں وضاحت کی کہ ملاقات نہ ہونے کا وقفہ ایک لحظہ نہیں بلکہ ایک دن دو راتیں تھا۔

کہاں ہے لحظۂ، دو شب ایک دن جدائی تھی
مجھے یہ صبح بھی اک شام بے نوائی تھی!

خلیل کا اُردو کلام نایاب ہے۔ [۵۷]

نواب حسین علی خاں حسین

نواب حسین علی خاں نواب اللہ داد خاں صوفی کے چھوٹے بیٹے تھے ۱۲۶۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۱۷ھ میں وفات پائی۔ سندھی کے کافی گو شاعر تھے، اُردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہے۔

ہوا روشن چمن سارا بہارستاں لگی دل میں
کھلے گل ہر طرف ظاہر برہ جب بوند برسائی

حسینؔ اس عشق کا نعرہ جسے کی دل میں ظاہر ہے
نہیں اُس خوف اور خطرہ نہ آخر کہ ہے رسوائی [۵۸]

شاہ نصیر الدین نقشبندی

پیر نصیر الدین نقشبندی حضرت مجدد الف ثانی کی اولاد میں تھے اور اپنے والد

---

۵۷ تکملۂ مقالات الشعراء از مخدوم محمد ابراہیم خلیل ٹھٹھوی صفحہ ۵۹، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدر آباد ۱۹۵۸ء

۵۸ سندھ میں اُردو شاعری صفحہ ۷۰، مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدر آباد ۱۹۷۰ء

پیر عبدالحئی کے سجادہ نشین تھے، جھوک کی خانقاہ سے ارادت رکھتے تھے، بڑے صاحب کمال اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ عمر کا بیشتر حصہ سلسلہ تبلیغ میں باہر ہی گذرا۔ بلوچستان، قندھار، اجمیر، سرہند، بمبئی کہاں نہیں گئے مگر ان کا مستقل مرکز فیض لاڑکانہ ہی رہا اور وہیں ۱۳۱۹ھ میں وصال فرمایا۔ نصیر نقشبندی سندھی اور اردو کے شاعر تھے اور ہر دو زبان میں مرثیے بھی کہتے تھے۔ نمونہ کلام میں چند شعر دیئے جاتے ہیں۔

قامت سے ترے سرو خراماں ہے حیراں — لعلوں سے ترے لعل بدخشاں ہے حیراں
نالہ جو کروں ہجر میں شب روز نصیرا — نالوں سے مرے رعد پریشاں ہے حیراں
وہ

یوسف خاں ظہیر

سندھ میں کسی مقام کے رہنے والے تھے۔ تاریخ ولادت و وفات کا پتہ چل نہ سکا ان کے والد عہد برطانیہ میں محکمہ بندوبست میں ملازم تھے۔ خود ظہیر کو تلاش معاش میں سندھ سے باہر جانا پڑا۔ بھوپال و حیدرآباد میں ملازمت کی اور شاعری کا شوق ہوا تو غلام محمد خبر فرخ آبادی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہے۔

جوش سودا میں نہ زنداں کو میں زنداں سمجھا — طوق کو عالم وحشت میں گریباں سمجھا
ہے جگر میں یہ ہجوم گل داغ سودا — چاک سینہ کو در گلشن رضواں سمجھا

ذرا اس کی نہ تم نے کچھ خبر لی — تمہارے ہجر میں نالاں رہا دل!
نہیں بے موت ممکن ہے رہائی — یہ کس کے دام الفت میں پھنسا دل

نہیں کٹتی ہے یہ کسی صورت
شاق کیسی شب جدائی ہے

وہ صوفیائے سندھ اور اردو از پروفیسر معین الدین دردائی صفحہ ۲۰۰ مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۶۳ء

دل لگا کر ظہیر نے تا دم کیسی ایذا بتوں سے پائی ہے [۱]

نوٹ: قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا انتقال انیسویں صدی عیسوی کی نویں دہائی میں ہوا۔

سید غلام محمد شاہ "گدا"

سید غلام محمد شاہ مشہد کے رضوی سادات میں تھے۔ آپ کا خاندان کلہوڑہ دور میں سندھ آیا اور خدا آباد میں بس گیا۔ تالپوروں کی حکومت میں سیدوں کا یہ خاندان حیدرآباد آکر متوطن ہوا اور اسی مقام پر ۱۲۵۲ھ میں غلام محمد شاہ کی ولادت ہوئی۔

آپ کے والد حسن علی شاہ نے تعلیم کے لیے اخوند احمد بن عبدالعلیم ساوُنی کی خدمات حاصل کیں۔ سن شعور پر پہنچ کر لحاظ شاعری پر خود غلام محمد شاہ نے محمد روشن حیدرآبادی سے تلمذ حاصل کر کے گدا تخلص اختیار کیا۔

گدا نے تالپوروں کا عروج اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا تھا۔ بزرگوں سے سُنا تھا مگر زوال کا مشاہدہ بچشم خود کیا اور اس سے ان کے دل پر خاصا اثر پڑا۔ مزاج فطری طور پر متصوفانہ تھا، سلسلۂ قادریہ سے وابستہ تھے۔ دنیا کی بے ثباتی کے نقشے نگاہوں کے سامنے سے گزرے تو آپ واقعی گدا بن گئے اور ہندوستان کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ اس سفر میں دلی کے بعض استادوں سے بھی ملاقی ہوئے اور ان سے شاعرانہ استفادہ کیا۔

گدا فارسی، سندھی اور اُردو کے شاعر تھے۔ اُردو میں آتش و ناسخ دونوں سے متاثر تھے اور اس کے نتیجے میں اُردو اور فارسی کے مصرعے سندھی شاعری میں نظم کر جاتے تھے جس سے واقعی ایک شاعرانہ حُسن پیدا ہو جاتا تھا۔

آپ کی شخصیت اور علم و فضل یکساں طور پر موثر تھے اور ملی جلی بلند کرداری نے

---

[۱] "سندھ میں اُردو شاعری کا ارتقاء"، صفحہ ۱۰۸، مطبوعہ الحمراء اکیڈمی لاہور ۱۹۶۳ء
بحوالہ یادگار ضیغم از محمد عبداللہ خاں حیدرآباد دکن صفحہ ۲۳۹، ۲۴۰، ۱۸۹۲ء

پرستاروں کا ایک بڑا حلقہ پیدا کر دیا تھا جن میں ادیب اور ادب پرور سب شامل تھے میر شاہنواز خاں، جام میر خاں میر بہرام خاں، میر عبدالحسین سانگی گدا کے ممدوحین میں تھے سانگی کے بیلے گدا کہتے ہیں۔

ے امیر زماں میر عبدالحسین گدا کو سخا سے بھلا تا نہیں

سندھ کے اس عظیم شاعر نے ۱۱ جنوری ۱۹۰۵ء کو حیدر آباد میں وفات پائی اور وہیں سپرد لحد کئے گئے۔ آپ کی شاعرانہ عظمت تینوں زبانوں میں یکساں ہے مگر اردو میں خاص طور پر آپ نے سندھ کو سربلند کیا ہے نمونتہً چند شعر ملاحظہ ہوں۔

(تضمین)

ے سیدا! مجھ کو تری ذات مقدس کی قسم واسطے تیرے بنے ارض و سما لوح و قلم
نور تیرے سے منور ہوئے دونوں عالم مِن بیدل بجمال تو عجب حیرانم

اللہ اللہ چہ جمالست بدیں بوالعجبی

(منقبت)

علی ہے آب و رنگ دلوئے گلزار الٰہی کا علی ہے لؤلؤ لالائے عمان خدائی کا
علی ہے مصدر الانوار نور کبریائی کا علی ہے مظہر الاسرار ستہ مصطفائی کا

علی کا نام ہے رہبر رہ صدق و صفائی کا

(انتخاب غزلیات)

ے خوش کیا ہم نے اُس ستم گر کو توڑ کر اپنے کاسۂ سر کو
کیا عجب کردیں لحہ میں غرقاب چشم گریاں سے شہر کو بر کو
یہ تمنا ہے میری جا کے دھروں اس کے قدموں میں کاٹ کر سر کو
یاالٰہی تو پھر حکومت دے جام صاحب غریب پرور کو

مجھ کو حاصل ہو دولت دیدار
ہے گدا کی صدا یہ حیدر کو

(قطعہ)

سہ وہ جس محفل میں کل مستوں کا برپا شور اور غل تھا ۔ عجب تھا دور ساغر کا عجب مینا کا قلقل تھا
وہاں دیکھا جو میں نے آج اک گردش سے گردوں کی ۔ نہ وہ مجلس، نہ وہ ساقی، نہ وہ مینا کچھ تجمل تھا

(متفرقات)

ہے جس سے نیکی کروں بدی وہ کرے ۔ یہ عجب طرح کا زمانہ ہے
تیرے بیمار محبت میں رہا ہے نہ رمق ۔ آئیے آئیے یہ وقت مسیحائی ہے
کبھی کرے نہ کسی کو اسیر کنج قفس ۔ اگر سنے مری اک بار داستاں صیاد
نعت نبی صیقل زنگار دل ۔ وصف علی دافع آفات ہے
برنگ کرمک شب تاب ہو گیا مہتاب ۔ جمال عارض جاناں نے جب فروغ کیا
[۲۱]

غلام مرتضیٰ شاہ مرتضائیؒ

غلام مرتضیٰ شاہ کے والد روشن علی شاہ ٹھٹھہ کے رضوی سادات سے تھے اور فارسی کے اچھے شاعر تھے لہٰذا غلام مرتضیٰ شاہ کی تربیت علمی اور ادبی ماحول میں ہوئی۔ سید امام بخش فدوی شروع ہی سے ان کے استاد رہے تھے اس لیے شاعری میں انہوں نے اصلاح دی اور غلام مرتضیٰ کی فطری صلاحیت نے تیزی کے ساتھ انہیں ایک بلند ادبی مقام پر لا کھڑا کیا۔

شروع میں غلام مرتضیٰ شاہ فارسی میں شعر کہتے تھے پھر سندھی کی طرف متوجہ ہو گئے اور کئی فارسی کتب سندھی میں منتقل کردیں۔ ٹھٹھہ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۲۲ھ میں ٹھٹھہ ہی میں انتقال کیا۔

مرتضائی کو سندھ کا ایک اچھا شاعرانہ دور ملا تھا۔ فارسی اور سندھی کے ساتھ

---

[۲۱] تکملہ مقالات الشعراء از مخدوم محمد ابراہیم خلیل ص ۵۲۳ تا ۵۲۶ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد ۱۹۵۸ء
○ کلیات گدا، مرتبہ رشید احمد لاشاری مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد ۱۹۵۷ء

اُردو شاعری کا بول بالا ہو رہا تھا اس لیے انہوں نے بھی اس طرف توجہ کی۔

مرتضائیؔ سندھ میں مشہور ہے تیرا کلام
اب تو اُردو میں کہا کر، ہو غزل خواں یار کا

اب یہ مرتضائیؔ کا جوہر قابل تھا کہ اُردو کے میدان میں بھی انہوں نے اکثر کو پیچھے چھوڑ دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس بلندی پر جا پہنچے جہاں آج بھی ان کا نام مہرتاباں کی طرح چمک رہا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

آہ میرے دل سے گزرا نوک پیکاں یار کا — ہے کیا خاطر کو خستہ تیر مژگاں یار کا
صد قیامت عاشقوں پر عکس قامت دیکھ کر — رخنہ زن اسلام میں زلف پریشاں یار کا

لیلۃ القدر اب یقیں ہے، وصل کی شب آئی ہے
گیسوئے مشکیں ہوا ہے عطر افشاں یار کا [۶۲]

میر محمد حسن علی خاں حسنؔ

میر محمد حسن علی خاں، میر محمد نصیر خاں تالپور کے بیٹے تھے، ۱۲۴۰ھ میں حیدر آباد میں پیدا ہوئے اور میروں کا زوال ہوتے پر ۱۲۵۹ھ میں گرفتار ہو کر کلکتہ بھیج دیے گئے ۱۲۷۹ھ میں رہائی ملی تو حیدر آباد واپس آئے اور ۱۲۲۴ھ میں خالق حقیقی سے جا ملے۔

آپ ایک عالم و فاضل انسان تھے، فارسی نظم و نثر دونوں پر قدرت رکھتے تھے اور سندھی تو مادری زبان تھی ہی۔ فارسی اور سندھی کی بہت سی کتب آپ کی یادگار ہیں۔

کلکتہ کے قیام میں اُردو کا ذوق پیدا ہوا تھا جو رہائی کے بعد بھی جاری رہا۔ "احسان البیان" آپ کی اُردو نثر کی کتاب ہے۔ نظم کا نمونہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

---

۶۲ تکملہ مقالات الشعراء از مخدوم محمد ابراہیم ٹھٹھوی صفحہ ۵۵۴ تا ۵۵۹ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدر آباد ۱۹۵۸ء

یہ دونوں تو ہیں لخت دل صاحب معراج — بے شبہ ہیں خلق دو عالم کے ہیں سرتاج
شاہان جہاں ان کے غلاموں کے ہیں محتاج — ان دونوں سے تو کفر کی بستی ہوئی تاراج
اسلام کی کشتی کے جو لنگر ہیں تو دو ہیں۔ ۶۳

مرزا قاسم علی بیگ "قاسم"

مشہور و معروف میرزا فتح علی بیگ کے صاحبزادے میرزا قاسم علی بیگ ۱۲۵۳ھ میں ٹنڈو آغا حیدر آباد میں پیدا ہوئے، علوم مروجہ کے ساتھ ساتھ طب کی تعلیم حاصل کی اور سن شعور پر پہنچ کر باپ دادا کی طرح مرثیہ خواں بن گئے۔

میران حیدر آباد شروع ہی سے ان کے خاندان کے مربی تھے لہذا قاسم کی بھی قدر افزائی ہوئی قاسم نے سندھی اور اردو میں مراثی، سلام، مناقب، قصائد اور رباعیات کے علاوہ غزلیں بھی کہی ہیں۔ اردو غزل کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

مقتل میں کامیاب ہر اک اس کا وار ہے — جس زخم دل کو دیکھتا ہوں، شاہکار ہے
محلوں میں رہنے والے فنا کو نہ بھول جا — جب کاخ کو الٹ دیا خاک مزار ہے

فریب محبت کو سچا بنا دے — دل اس کو بھی اللہ درد آشنا دے
مجھے جام دے ایک مست انکھڑیوں سے — مجھے اپنی آنکھوں سے ساقی پلا دے ۶۴

قائم فقیر قائم

قائم فقیر غلام حیدر فقیر کے بیٹے تھے جو ۱۲ رشوال ۱۲۸۴ھ کو گنبال ضلع ٹھٹھہ میں پیدا ہوئے، فارسی، عربی اور طب کی تعلیم مکمل کر کے علوم باطنی کی طرف متوجہ ہوئے

---

۶۳ تکملہ مقالات الشعراء از مخدوم محمد ابراہیم خلیل ٹھٹھوی صفحہ ۹۰ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدر آباد ۱۹۵۸ء
سندھ میں اردو شاعری صفحہ ۱۰۶ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدر آباد ۱۹۷۰ء
۶۴ "سندھ میں اردو شاعری" صفحہ ۱۹۰ از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدر آباد ۱۹۷۰ء

اور جلد ہی تصوف کا وہ درجہ حاصل کر لیا جو آبائی مسلک کے شایان شان تھا۔ آپ کو بھی بزرگوں کی طرح شعر و شاعری کا ذوق تھا، فارسی اور سندھی کے ساتھ اردو میں بھی شعر کہتے تھے مگر عمر نے زیادہ وفا نہ کی، چالیس سال کی عمر میں آپ کا وصال ہو گیا۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

؎ مولیٰ تو نگر ہے سخی جسکو کہتے ہیں علی	بحر کرم کا ناخدا اعظم علی اعظم علی!
تعریف مولیٰ کرتا ہوں کہتے ہیں مجھ کو رافضی	ملک و فلک میں ہے صدا اعظم علی اعظم علی
شافع محشر مصطفیٰ، ساقی کوثر مرتضیٰ	قائم شوی غمگین چرا اعظم علی اعظم علی[۶۵]

میاں جی محمد صالح خاکی (تیرھویں صدی کے آخر سے چودھویں صدی ہجری کے اوائل تک)

میاں جی "مانجھوٹ" کے میرزا صاحبان کے خدمت گار تھے۔ اکثر سندھی، فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے اور خاکی تخلص کرتے تھے۔ میرزا صاحبان کے خاندان کے بیشتر افراد اردو میں طبع آزمائی کرتے تھے لہٰذا بعض لوگ شاعری کے رشتے سے خاکی کی بڑی عزت کرتے تھے، بالخصوص عباس علی بیگ نے انہیں مصاحب بنا لیا تھا۔ ان کا ایک قطعہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے "سندھ میں اردو شاعری" میں درج کیا ہے۔

؎ آج گھر کو گیا میں دلبر کے	تھا کھڑا اپنے در او پر گھر کے
میں نے پکڑا بغل میں تب وہ کہا	چھوڑ صالح، بنام پر در کے[۶۶]

پیر کمال الدین کمال

پیر کمال الدین نوشہرہ فیروز میں ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا ماحول شروع ہی سے صوفیانہ تھا لہٰذا عربی، فارسی، سندھی اور انگریزی کی تعلیم حاصل کرنے کے باوجود تصوف کے راستے پر لگ گئے۔ آپ کو درگاہ ہالہ شریف سے بڑی عقیدت تھی اور

۶۵؎ "سندھ میں اردو شاعری کا ارتقاء" صفحہ ۱۳۱ مطبوعہ الحمرا اکیڈمی لاہور ۱۹۷۲ء

۶۶؎ "سندھ میں اردو شاعری" صفحہ ۱۹۱ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۷۰ء

ہر جمعرات کو آپ محفل سماع منعقد کرتے تھے جس میں یکتارے اور ڈھولک پر کافیاں گائی جاتی تھیں اور وہ خود بھی گاتے تھے۔ ۱۳۲۸ھ میں آپ کا وصال ہوا۔

پیر کمال الدین سندھی اور سرائیکی کے شاعر تھے اور کافیاں، ابیات اور سی حرفیاں کہتے تھے اُردو کا بھی ذوق تھا نمونہ ملاحظہ ہو۔

نیم بسمل ہو کے کھاتے ہو بلائی دربدر　　عشق کشتہ کی کرو تم دستگیری اے صنم

ہے خدا تیرا ثنا گو والضحیٰ واللیل میں
یٰسین میں تعریف تیری دلپذیری اے صنم　　[۶۶]

میرزا عباس علی بیگ علی

میرزا عباس علی بیگ میرزا بندہ علی بیگ کے بڑے صاحبزادے تھے، ماٹھو کے میرزا خاندان کے فرد تھے۔ فارسی، سندھی اور اُردو کے شاعر تھے اور انگریزی دور میں مختار کار کے عہدے پر فائز تھے۔ اُردو کا نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

ابھی مجھ پہ کچھ بھید وا ہو گیا ہے　　کہ یہ درد دل بے دوا ہو گیا ہے
صبا جا کے میرے مسیحا کو کہہ دو　　کہ بیمار کا حال کیا ہو گیا ہے

خیال یار کو آنے کا شوق آج ہوا　　جو آج دل کو مرے سخت اختلاج ہوا [۶۷]
ارے طبیب تو میرے سرہانے سے اٹھ جا　　مریض عشق کا اب درد لاعلاج ہوا! (سرہانے)

نواب نظر علی خاں لغاری

نظر علی خاں، نواب غلام محمد خاں کے چھوٹے بیٹے تھے، تکملۂ تعلیم کے بعد انگریزوں کی ملازمت کرلی مگر کر نہ سکے اور بدین سے اپنے گاؤں تاجپور واپس آگئے

---

[۶۶] کلیات کمال مرتبہ اظہر گیلانی مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ۔ حیدرآباد ۱۹۶۲ء

مضمون فقیر کمال زنشروی از خانزادہ حبیب الوری مشمولہ سندھی ادب نمبر نئی قدریں ۱۹۶۳ء

[۶۸] "سندھ میں اُردو شاعری" مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۷۰ء

پھر وطن کو خیر باد کہہ کر گھومتے پھرتے رنگون میں جا بسے۔ وہاں سے حج بیت اللہ کو گئے اور مدینہ منورہ میں مقیم ہو گئے۔

مدینے سے اکثر ان کے خطوط اُردو میں آتے رہے۔ اُردو میں شعر بھی کہتے تھے رنگون کے ایک منظوم خط کے دو شعر "سندھ میں اُردو شاعری" سے نقل کئے جاتے ہیں ——— مدینے ہی میں غالباً ۱۳۳۰ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

ے فتح خیبر کیا لاریب جس نے   پہلوان وہ علی حیدر دکھا دے
دکھا ہمشیر زادہ تینوں مجھ کو   اور ان کی آبرو بہتر دکھا دے

نواب فقیر ولی محمد خاں لغاری

ولی محمد خاں بن نواب احمد خاں ۱۲۵۲ھ میں بمقام حیدر آباد پیدا ہوئے۔ ابھی وہ سن شعور نہ پہنچے تھے کہ انگریزوں نے سندھ پر قبضہ کر لیا اور نواب احمد خاں اپنے بیٹوں کو لے کر پنجاب چلے گئے۔ ۱۸۴۶ء میں وہ واپس آئے تو اپنی جاگیر مرزاں پور میں اقامت گزیں ہوئے۔ اور صحیح معنی میں یہیں ولی محمد خاں کی تربیت ہوئی۔

ولی محمد خاں ایک تعلیم یافتہ انسان تھے مگر ان کا رجحان تصوف کی طرف تھا جس میں ان کے والد کی ترغیب بھی شامل تھی۔ انجام کار نواب ولی محمد خاں نے صوفی ابراہیم شاہ کے ہاتھ پر بیعت کر کے فقر کا لبادہ اوڑھ لیا۔

۱۳۰۱ھ میں وہ مستقلاً تاجپور میں آکر بس گئے اور اسّی سال کی عمر میں ۱۳۳۲ھ میں عالم باقی کی طرف سفر کر گئے۔ نواب ولی محمد خاں لغاری سندھی، سرائکی، فارسی اور اُردو میں شعر کہتے تھے۔ چند اشعار نمونے کے طور پر پیش ہیں۔

ے   اے دل گزر مکاں موں چلنا ہے رین دن میں
رنگپور کا سیر دیکھا اب جاؤں گا وطن میں   وزگمرا
ظلمات سے سکندر خالی نکل گیا وہ !
عاشق وصال پایا معشوق کے ذقن میں

دنیا سرائے ماتم جس کو بقا نہیں ہے

عاشق مدام رہتے دیدار کے جشن میں

حب الوطن کے معنی یوں حج اکبری ہے

دیکھو ولی محمد تم قلب کے صحن میں ! [۹]

سید مصری شاہ نصرپوری

مصری شاہ بن سید بلند شاہ ۱۲۳۵ھ میں بمقام خیرپور پیدا ہوئے ۔ آپ نصرپور کے مشہور رضوی خاندان سے تھے ۔ والد کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا لہذا بڑے بھائی فتح شاہ نے آپ کی پرورش کی اور عربی و فارسی کی تعلیم دلوائی ۔

مصری شاہ کو موسیقی سے بڑا شغف تھا اور ستار خوب بجاتے تھے ، مولانا روم اور شاہ بھٹائی سے بڑی عقیدت رکھتے اور ہر سال دلی ، اجمیر اور کاٹھیاوار جا کر وہاں کی خانقاہوں کی زیارت کرتے ۔

آپ سندھی ، سرائیکی ، فارسی اور اردو کے شاعر تھے ۔ سندھی کافیاں مشہور ہیں ۔ اردو اور ہندی میں بھی کافیاں ہی کہتے تھے ۔ نمونہ ملاحظہ ہو ۔

کرو جام الغام سے ناب مستی خودی ، خود پرستی ، مٹے خام ہستی

نحس نفس تر بھاگ ، جلوے زرا سا [۱۰]

پیر بہاون علی شاہ ، ساقی

پیر بہاون علی شاہ کے والد پیر محمد شاہ درگاہ شاہ قادری بدین کے سجادہ نشین تھے

---

[۹] ماخوذ از " سندھ میں اردو شاعری کا ارتقاء " مطبوعہ الحمرا اکیڈمی لاہور ۱۹۶۲ء

بحوالہ یادرفتگاں از طالب المولیٰ و سندھی مقالہ گل حسین برائے ایم اے سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۶۶ء

کلام نواب ولی محمد لغاری مرتبہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ ، ۱۹۶۸ء

[۱۰] ماخوذ از کلیات مصری شاہ مرتبہ مقبول احمد مطبوعہ مصری شاہ میموریل کوآپریٹیو کونسل ۱۹۶۱ء

اسی مقام پر ۱۳۰۵ھ میں پیر بہاون علی شاہ کی ولادت ہوئی۔ چودہ سال کے سن تک پہنچتے پہنچتے آپ نے علوم ظاہری و باطنی حاصل کر لیے اور سلسلۂ قادریہ سے بیعت ہو گئے۔

کتب بینی کے بچپن ہی سے عادی تھے لہٰذا عربی و فارسی کے ساتھ ساتھ انگریزی میں بھی درس حاصل کر لیا۔ اور ساقی تخلص اختیار کر کے سندھی، فارسی اور اردو کے شاعر بن گئے۔ نثر نگاری کا ذوق بھی رکھتے تھے اور اپنے خاندانی حالات اردو میں تحریر کیے تھے۔ نمونہ شاعری درج ذیل ہے۔

حضور داور محشر اکیلا جا کھڑا ہوں گا ۔۔۔۔۔ بجز تیرے نہ ہوئے گا سہارا یا رسول اللہ!

بتا اے مرغ دل تو نے کہاں اپنا وطن چھوڑا
نہ رستہ دشت میں پایا کہاں اپنا چمن چھوڑا
کہاں وہ آب انگوری کہاں وہ عنبری ساغر
کہاں وہ نرگس شہلا کہاں مشک ختن چھوڑا [۲]

رئیس شمس الدین بلبل

شمس الدین بلبل ۱۸۵۷ء میں بمقام میہڑ ضلع دادو پیدا ہوئے۔ انہوں نے مروجہ علوم کے ساتھ انگریزی کی تعلیم بھی حاصل کی اور محکمۂ آبپاشی میں ملازمت کر لی۔ مگر فطری لگاؤ ادب و صحافت اور شعر و شاعری سے تھا لہٰذا ملازمت ترک کر کے کراچی کے سندھی اخبار "معاون" کے ایڈیٹر بن گئے پھر "الحق" سکھر کی ادارت کی۔ ۱۹۱۹ء میں انتقال فرمایا۔

شمس الدین بلبل نظم و نثر دونوں میں طنزیہ و مزاحیہ انداز رکھتے تھے۔ اسی لیے سندھ کے اکبر کہلاتے تھے۔ وہ بیک وقت شاعر، ادیب اور صحافی سب کچھ تھے اور ہر صنف پر انہیں قدرت حاصل تھی۔ سندھی نظم و نثر کی کئی کتابیں ان کی یادگار ہیں اردو میں بھی شعر کہتے تھے مگر اس زبان میں ان کا رنگ کبھی کبھی سنجیدہ بھی ہو جاتا تھا۔

---

[۲] "سندھ میں اردو شاعری" ص ۲۱۶ از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدر آباد سنہ [illegible]

ہر دو رنگ کے چند شعر نمونے کے طور پر پیش ہیں۔

(سردار محمد یعقوب کی تعریف میں)

۵ ہیں منتظم حسن تدابیر سیاست | ہیں عقدہ کشا مہم امورات ریاست!
تا زندہ انہیں سے ہے فن فہم و فراست | بالندہ انہیں سے ہیں امن و عدل قیامت
تدبیر میں ایسے ہیں کہ تسخیر جہاں ہو | تحریر میں ہر نکتہ تو یر عیاں ہو

(تضمین بر غزل حافظ)

ہوئے ہیں علم، دنیا، نور، ایماں قلب سے زائل | ادھر کالج کا بیڑا پار کرنے پر ہے دل مائل!
ادھر ہے نوکری دشوار، چکر میں ہے ہر سائل | شب تاریک و بیم موج گرداب چنیں حائل

کجا دانند حال ما سبکساران ساحلہا!

جو ہونا چاہتا ہے بدر، بن جا ماہ تو حافظ | نہ کر آرام، رہ راہ طلب میں تیز رو حافظ
ونیوٹ ارات ذینھاں ذات میتونہ نہیں تو حافظ | حضوری گر ہمیں خواہی از و غافل مشو حافظ

متی ما تلق من تہوی دع الدنیا و اہملہا [۴۲]

میاں محمد یوسف علوی عرف "میوں وڈل" حیدری

میاں محمد یوسف میاں یعقوب علوی کے بڑے بیٹے تھے، ۱۲۷۸ھ کے لگ بھگ قصبہ سعید پور ضلع حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پدر محترم سے حاصل کی پھر طب پڑھی اور اپنے عہد کے کامیاب طبیب ثابت ہوئے۔ ۱۳۳۸ھ میں ساٹھ سال کی عمر پا کر انتقال فرمایا۔

میاں محمد یوسف عرف میوں وڈل ایک حکیم حاذق ہونے کے ساتھ ساتھ نکتہ سنج ادیب اور بلند پایہ شاعر تھے، حیدری تخلص کرتے تھے۔ آپ گدا اور ساگی کے معاصر تھے مگر ان سے عمر میں چھوٹے تھے۔ ان ہی کی صحبت میں حیدری کو اردو شاعری کا

---

[۴۲] ماخوذ از کلام بلبل مرتبہ غلام محمد گرامی مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدر آباد سنہ ۱۹۶۹ء

مضمون جدید سندھی ادب کے معمار از میمن عبدالمجید سندھی مشمولہ سندھی ادب نمبر نئی قدریں حیدر آباد صفحہ ۷۷، سنہ ۱۹۶۳ء

شوق بڑھا اور جلد ہی فارسی کے ساتھ اُردو کے اچھے شاعروں میں شمار کیے جانے لگے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

قدم سر کا نہیں سکتا ہوں یارو — بہت بوجھا جدائی کا گراں ہے
سراغ اس کا نہیں پایا کسی جا — نشان اس کا تو مطلق بے نشاں ہے
نہیں خواہش ہے دلکو بوستاں کی — میرا سینہ تو رشک گلستاں ہے

ساقی کے سوا مئے کا کبھی پینا نہیں اچھا — بے یار کے جگ میں کبھی جینا نہیں اچھا
ظاہر بہ غم فرقت دلبر کا نشاں ہے — زخم دل بے دل کو تو سینا نہیں اچھا
قسمت میں نہ جس کی ہو کبھی دوست کا دیدار — اس طرح کا تو دیدۂ بینا نہیں اچھا

نہیں چلنے کی طاقت ہے فقط اٹھتا ہوں رہ رہ کر
یہ حالت ہو گئی پیارے تمہارے جور سہہ سہہ کر
پرندوں کو یہ حاصل حق سے ہے بہرہ محبت کا
گلوں پر بلبلوں نے کیا مچائے شور چہہ چہہ کر [۲]

میرزا دوست محمد دوست

میرزا دوست محمد میرزا علی بخش کے بیٹے تھے۔ ۱۲۷۹ھ میں ٹنڈو آغا حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اعلیٰ تعلیم پائی تھی۔ اور سندھی شاعری میں غلام محمد گدا کے شاگرد تھے۔ اردو فارسی میں ابوالحسن لکھنوی سے اصلاح لیتے تھے۔ ۱۳۲۹ھ میں انتقال کیا۔

آپ مرثیہ گو خاندان سے تعلق رکھتے تھے لیکن مرثیے کے ساتھ غزلیں بھی کہی ہیں۔ اُردو غزل کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

---

[۲] سندھ میں اُردو شاعری از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صفحہ ۲۱۸ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدر آباد ۱۹۷۰ء

؎ بارک اللہ باغ میں بلبل ہے شاداں آجکل
پھر بہار آئی چمن میں گل ہے خنداں آجکل
شاخ گل پر نغمہ زن کیونکر نہ ہو اب عندلیب
باغ میں باد بہاری ہے خراماں آجکل

؎ میرے دلبر کے بال کالے ہیں | سر پہ دو سانپ گویا پالے ہیں
سوال دوست ہرگز رد نہ کر یار | یہ بیکس بھی ترے در کا گدا ہے ف ۵

میر عبدالحسین سانگی

میر عباس علی خاں کے فرزند دلبند میر عبدالحسین سانگی کلکتہ کی قید فرنگ کے زمانے میں سنہ ۱۲۶۹ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کی والدہ ایک انگریز خاتون تھیں۔ بارہ سال کی عمر میں رہا ہو کر اپنے چچا کے ساتھ سندھ آئے۔ سنہ ۱۳۴۲ھ میں وفات پائی اور حضرت شاہ بھٹائی کے مزار کے قریب دفن کئے گئے۔

سانگی ایک عالم فاضل، ادیب اور شاعر تھے، انگریزی ماں کی زبان تھی لہٰذا عہد برطانیہ میں فرسٹ کلاس اسپشل مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز رہے۔ فارسی، اردو، سندھی، تینوں زبانوں کے نثر نگار بھی تھے اور تینوں زبانوں میں شعر بھی کہتے تھے۔ سندھی میں سانگی اور فارسی میں عبدالحسین تخلص کرتے تھے۔ چند سندھی افسانے، لطائف لطیفی اور کلیات سانگی آپ کی یادگار ہے۔

سانگی نے پہلے پہل سندھی مشاعروں کی ابتدا کی جس کے بعد ہی اردو مشاعروں کا آغاز بھی ہوا۔ف اردو کلام کا انتخاب درج ذیل ہے۔

؎ کب ضرورت مجھے مسجد کی رہے گی کہ خدا | ابروئے یار کو محراب دعا کر دے گا
کیا ضرورت ہے چراغوں کی اگر یار آیا | رُخِ پُر نور سے اس گھر میں ضیا کر دے گا

ف ۵ سندھ میں اردو شاعری از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صفحہ ۲۲۶ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سنہ ۱۹۷۰ء

خون میرے کا پتہ تجھ سے ملے گا آخر — رنگ لائے گا ترا رنگ حنا میرے بعد
عشق والوں کا ہوا خاتمہ بالخیر ابھی — عالم الغیب سے آئے گی ندا میرے بعد

زلف دلبر کا جو ہے کالا سانپ — وہ تو میرا ہے ہاتھ پالا سانپ
لے کے عبدالحسین کا کل یار — اپنی گردن میں آپ ڈالا سانپ

ہوں حوادث ہزار، فکر نہیں — مرد کو چاہیئے نہ ہرگز یاس
دشمنوں نے کیا نہیں ہرگز — دوستوں نے کیا ہے دل کو اداس
جلایا شعلۂ رخسار گل نے دامن سرو — خیال قامت جاناں نے اسکو طوع کیا
اپنے جنوں کا خلق میں افسانہ ہو گیا — مشہور اپنا نام تو دیوانہ ہو گیا
بلبلوں سے کہو، کہاں ہے بہار — بے وفا دیکھ، یہ زمانہ ہے
سُن کے عبدالحسین میری غزل — وجد میں سب درخت ہلتے ہیں [۲۶]

میرزا مراد علی بیگ عرف بڈھل بیگ

میرزا مراد علی میرزا فتح علی بیگ کے بیٹے تھے۔ ۱۲۷۹ھ میں بمقام حیدر آباد پیدا ہوئے فارسی کی اعلیٰ تعلیم اور طب کے ساتھ ساتھ خوش نویسی میں مہارت تامہ حاصل کی اور میر نور محمد خاں تالپور سے وابستہ ہو گئے اور ترقی کرتے کرتے وزارت عظمیٰ تک پہنچے۔

میرزا بڈھل بیگ کو موسیقی سے بھی شوق تھا اور شعر و شاعری سے بھی طبعی لگاؤ

---

[۲۶] تکملہ مقالات الشعراء از مخدوم محمد ابراہیم خلیل صفحہ ۳۸۲، ۳۸۵ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدر آباد سنہ ۱۹۵۸ء
کلیات سانگی مرتبہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدر آباد سنہ ۱۹۶۹ء
مضمون سندھ کا ایک شہزادہ شاعر از غلام رسول بلوچ مشمولہ سندھی ادب نمبر نئی قدریں صفحہ ۱۲۶ حیدر آباد سنہ ۱۹۶۳ء
سانگی شخصیت و فن از احسان بدوی ملنے کا پتہ سندھ مسلم کالج بک اسٹال، برنس روڈ کراچی سنہ ۱۹۶۵ء

رکھتے تھے۔ ۱۲۳۴ھ میں انتقال فرمایا۔

بنیادی طور پر آپ مرثیہ گو تھے۔ سندھی مرثیہ کے لیے آپ کی خدمات کبھی فراموش نہیں کی جا سکتیں لیکن غزلیں اور کافیاں بھی کہی ہیں۔ سندھی میں بدھل اور اردو فارسی میں میرزا تخلص کرتے تھے۔

آپ کی تصانیف میں دیوان غزلیات، کلیات مراثی، مختار نامہ، حملہ حیدری، سفرنامہ کربلا اور شگوفۂ ماتم موجود ہیں۔ غزلوں کے چند منتخب اشعار پیش ہیں۔

تیرے کوچے میں عجب میں نے تماشا دیکھا — جس کو دیکھا سو تیرا چاہنے والا دیکھا
میرزا بندش مضمون کا تیرے بے شک — ہر گلی کوچے میں ہر رند نے چرچا دیکھا

شمع عارض دیکھ کر موسیٰ نہ پہنچا طور تک — جل گئے کہسار سارے جوں ہی آیا نور تک
کون سے عاشق نے دعویٰ کی انا الحق دوستو — یہ فسانہ ختم لیکن ہو گیا منصور تک[1]

میرزا قلیچ بیگ قلیچ

میرزا قلیچ بیگ میرزا فریدوں بیگ کے بیٹے تھے، ۱۲۷۰ھ میں حیدرآباد کی مضافاتی بستی ٹنڈو ٹھوڑو میں پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم قاضی احمد منغلوی سے حاصل کی۔ بمبئی الفنسٹن کالج سے فارغ التحصیل ہوئے۔ وطن واپس آکر تحصیلداری کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۰۹ء میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدے سے پنشن حاصل کی۔

آپ کو اوائل عمر ہی سے علمی اور ادبی ذوق تھا۔ قلیچ تخلص کرتے تھے۔ فارسی، سندھی، سرائیکی کی تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ کبھی کبھی ترکی میں بھی شعر کہتے تھے۔

آپ تین سو سے زائد کتابوں کے مصنف، مترجم اور مولف ہیں۔ ڈرامہ، ناول

---

[1] سندھ میں اردو شاعری از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صفحہ ۲۱۰ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۷۰ء

مقالات، تاریخ، لغت، فلسفہ، تعلیم، سائنس، طب، تصوف، سوانح کوئی موضوع چھوٹا نہیں جس پر قلم نہ اٹھایا ہو۔

حکومت کی طرف سے علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر شمس العلماء اور قیصر ہند کے خطابات عطا ہوئے تھے۔ ۱۹۲۹ء میں حیدر آباد میں انتقال فرمایا۔

اُردو کے بھی اچھے شاعر تھے۔ کلام کا ایک مختصر سا انتخاب پیش ہے۔

؎ ترے عشق کو میں سدا چاہتا ہوں — محبت تری جابجا چاہتا ہوں
نسیم بہشتی نہ بھاتی ہے دل کو — میں تری گلی کی ہوا چاہتا ہوں

؎ جسے کو شوق کامل ہے لقائے نور اللہ کا — زیارت کیلئے اسکو تیری تصویر کافی ہے
خدا جانے صبح تا شام واعظ کیا بہکتا ہے — دل بینا کو تیری چشم کی تفسیر کافی ہے

؎ مارنا جب تھا اے مسیحا دم — کیوں جلایا دوا کر کے

؎ یارب مرادہ یار یگانہ کب آئے گا — پھر عیش اور خوشی کا زمانہ کب آئیگا

؎ لحظہ اک، دیدار سے فارغ کبھی رہتے نہیں — چشم موسیٰ کو تو حسرت رہ گئی دیدار کی [۳]

زرک خاں لاشاری زیرکؔ

زرک خاں لاشاری بلوچستان کے رہنے والے تھے۔ آپ نے فارسی اور پشتو عبدالمجید خاں کا کڑ سے پڑھی۔ اُردو کی تعلیم تھانے کے ایک منشی عبدالعزیز سے حاصل کی اور مختلف زبانیں حاصل کر کے پولیس میں ملازمت کر لی۔ اس سلسلے میں آپ کا آنا

---

[۳] دیوان قلیچ مرتبہ مرزا اجمل بیگ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ ۱۹۵۹ء
مضمون ”جدید سندھی ادب کے معمار“ از میمن عبدالمجید سندھی مشمولہ ادب نمبر نئی قدریں حیدر آباد ۱۹۶۳ء

سندھ میں ہوا اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ آپ کا انتقال ۱۴، مارچ ۱۹۳۲ء کو ہوا۔

آپ کو داستان گوئی سے بھی دلچسپی تھی۔ داستان امیر حمزہ اردو میں پڑھتے اور بلوچی میں اس کا ترجمہ کرتے جاتے، موسیقی سے بھی لگاؤ تھا، اپنا بلوچی اور فارسی کلام خود رباب پر گاتے تھے۔ وقت کے مشہور گویے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے لیکن آپ کی زیادہ شہرت ہفت زبان شاعر ہونے کی حیثیت سے ہے۔ سندھی سرائیکی، فارسی، بلوچی، پشتو، پنجابی اور اردو ہر زبان میں آپ نے شعر کہے ہیں۔ اردو کا نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

مرے اس گلشنِ امید میں یارب بہار آئے
مرے دل کو قرار آئے، اگر وہ گلعذار آئے

نہ چھوٹے ہاتھ سے میرے جہاں میں صبر کا دامن
مصیبت زندگی میں سر پہ گر لیل و نہار آئے

گئے سب ہاتھ خالی دولت دنیا کی لعنت سے
ہزاروں مرد کار آئے، ہزاروں نابکار آئے

مرا سایہ بھی جب مجھ سے ہوا انکار جاتا ہے
بھلا وہ کون سی ہے چیز جس پر اعتبار آئے

زبان اپنی سے ہر لحظہ خدا کا نام لیتا رہ
کبھی لب پر ترے زیرک نہ ذکر روزگار آئے ۵۹

میرزا مدد علی بیگ مددؔ

میرزا مدد علی بیگ ٹنڈو آغا، حیدر آباد میں ۱۳۰۱ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد میرزا انور محمد بیگ نے مروجہ زبانوں کی تعلیم دلوائی مگر میرزا مددؔ ابتدائے عمر میں جم کر سندھ میں رہ نہ سکے، ہندوستان اور ایران کی سیاحت کرتے رہے۔ ۱۳۵۱ھ میں شہر حیدر آباد میں انتقال فرمایا۔

آپ سندھی، فارسی اور اردو کے ادیب بھی تھے اور شاعر بھی، سندھی میں ایک رسالہ صراط مستقیم جاری کیا تھا، سندھی میں کئی ناول بھی لکھے ہیں، چمن جو شہزادو، عقل چرخ، انار کلی، سیف الملوک، فن طب پر بھی بعض کتابچے آپ کی تصنیف ہیں۔

---

۵۹ "سندھ میں اردو شاعری کا ارتقاء" از معراج نیر صفحہ ۱۲۹ مطبوعہ الحرا اکیڈمی لاہور ۱۹۴۳ء

میرزا امدد کو فن تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا۔ اردو میں سلام اور نظمیں بھی کہتے تھے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

(قومی نظم)

کم ہمتی کو زور، شجاعت کو ضعف ہے ۔۔۔ جرأت رہی نہ پہلی سی اب اور نہ حوصلہ
افسوس در پہ غیر کے ہم بات بات پر ۔۔۔ پھرتے ہیں کھاتے ٹھوکریں، یہ حال ہو گیا
اک دن وہ تھا، عنان حکومت تھی ہاتھ میں ۔۔۔ اک دن یہ ہے کہ ہم کو نہیں کوئی پوچھتا

اے قوم اجا ہیں کس سے مدد ہم، بتا تو ہی
ہم بیکسوں کا تیرے سوا کیا ہے آسرا

ہوا جو بام پر وہ جلوہ گر آہستہ آہستہ ۔۔۔ لگا گم ہونے غیرت سے قمر آہستہ آہستہ
محبت دے کے پہلے دل لیا پھر جان پھر راحت ۔۔۔ کیا قبضے میں اپنے میرا گھر آہستہ آہستہ [۱]

میرزا قربان علی بیگ قربانؔ

میرزا قربان علی بیگ میرزا قاسم کے بیٹے تھے، ٹنڈو آغا حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ تعلیم سے فراغت پا کر میر نور محمد خاں تالپور کے میر منشی ہو گئے پھر میر علی نواز خاں نازؔ کی استادی کا شرف حاصل ہوا۔

میرزا قربان ایک ممتاز خوش نویس بھی تھے اور عربی، فارسی، سندھی اور اردو کے شاعر بھی ۱۹۳۲ء میں وفات پائی۔ اردو غزل کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

ہے نزا آنا گر اے رشک مسیحا ہو نہیں سکتا ۔۔۔ تو بیمار محبت، جانو، اچھا ہو نہیں سکتا
زمانہ چھوڑ دے تو چھوڑ دے، پروا نہیں قربانؔ ۔۔۔ محبت چھوڑ دوں پیارے کی ایسا ہو نہیں سکتا

---

[۱] "سندھ میں اردو شاعری" از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صفحہ ۲۴۸ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدر آباد سنہ ۱۹۷۰ء

؎ عشق میں ہے ضرور رسوائی	دل نہ مانے تو کیا کرے کوئی
نبض چھوٹی ہے سانس رکتا ہے	اب تو وعدہ وفا کرے کوئی [۸۱]

میر علی نواز خاں تالپور، ناز

میر علی نواز خاں ۱۸۸۴ء میں ریاست خیرپور کے قدیم پایۂ تخت کوٹ ڈیجی میں پیدا ہوئے اور ۱۹۲۱ء میں اپنے پدر عالی مقام میر امام بخش خاں کی وفات پر سریر آرائے ریاست ہوئے۔

آپ نے لاہور اور لندن سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ علوم مشرقی میں خاص دستگاہ رکھتے تھے اور ایک لائق حکمراں ہونے کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کے دلدادہ تھے ۲۵ر دسمبر ۱۹۳۵ء کو آپ نے وفات پائی۔

میر علی نواز خاں ناز ادیب بھی تھے، ادب نواز بھی، شاعر بھی تھے اور شاعر پرور بھی، سندھی، سرائیکی اور فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ اردو میں آپ کا مطبوعہ دیوان موجود ہے۔ مختصر سا انتخاب کلام نمونے کے طور پر پیش ہے۔

؎ تصویر تیری پائی آئینۂ نظر میں	فانوس دل میں دیکھا روشن خیال تیرا
گیسو کی الجھنوں سے اس ناز کو نکالا	احسان مند یارب ہے بال بال، تیرا

؎ بدمزہ ہو نہ کہیں خنجر قاتل کی زباں	دہن زخم کو لازم ہے نمکداں ہونا
دل مرا جب سے لیا، آنکھ ملاتے ہی نہیں	ان سے سیکھے کوئی شرمندۂ احساں ہونا

؎ آئینہ دے گا کہاں سے بندہ پرور کا جواب	یہ مرا دل ہے کہ دیتا ہے برابر کا جواب
سخت باتوں پر عدو کی ناز دل کو جل نہ کر	سیکھ تحمل بار در سے جا کے پتھر کا جواب

---

[۸۱] سندھ میں اردو شاعری از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صفحہ ۲۵۲ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۷۰ء

؎ بے خودی میں حسرتؔ دل کی تلاش　　　بیچ دریا میں ہے ساحل کی تلاش

؎ بلائیں لی ہیں کیا کیا زلف نے رخسار جاناں کی
تلاوت کی ہے کس کس شوق سے کافر نے قرآں کی　۸۲؎

کلیم اللہ شاہ

سید کلیم اللہ شاہ ولد محمد ارشد شاہ شابانی سادات سے تھے، ۱۲۹۳ھ میں نزول ڈیرو متصل شاہ جو گوٹھ ضلع لاڑکانہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا بچپن بلوچستان میں گزرا عربی و فارسی کے ساتھ آپ نے طب بھی پڑھی تھی۔ موسیقی کے ماہر تھے، بڑے بڑے گویئے آپ کے پاس آتے تھے، سندھی، سرائکی، فارسی اور اُردو میں شعر کہتے تھے۔ اُردو شعروں کا نمونہ پیش ہے۔

؎ پیر یروبوں کی ہے تجھ کوں امامت　　　امامت ہے امامت ہے امامت
جدائی دن کھوں عین قیامت　　　قیامت ہے قیامت ہے قیامت
کلیم اللہ جوں در گوشِ بندہ　　　غلامت ہے غلامت ہے غلامت　۸۳؎

پیر جمال الدین علوی

پیر جمال الدین پیر محمد ہاشم کے بیٹے تھے، ۲۷ رجب ۱۲۹۶ھ کو شاہ ابراہیم دادانی گوٹھ (حیدرآباد) میں پیدا ہوئے۔ کئی زبانوں پر عبور تھا۔ عربی، فارسی، ترکی، اُردو، گجراتی، بلوچی اور پشتو میں گفتگو کر سکتے تھے۔ ۱۳۵۵ھ میں وفات پائی۔ آپ ایک جوشیلے مسلمان تھے، تحریک خلافت میں جب آپ کی زبان بندی کا حکم صادر ہوا تو فرمایا

۸۲؎ ماخوذ از کمات تاز مطبوعہ ادارہ سہ روزہ "مراد" خیرپور میرس ۱۹۶۶ء

تاریخ خیرپور از نسیم امروہوی صفحہ ۹۹ مطبوعہ مراد پریس خیرپور، فروری ۱۹۵۵ء

۸۳؎ سندھ میں اُردو شاعری از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صفحہ ۲۰۵ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۷۰ء

؎ تمہاری ہتھکڑی بیڑی نہیں کافی ڈرانے کو
رکھا جب سر ہتھیلی پر تو کیا پرواہ زنداں کی

جیل میں جب اذان کی ممانعت ہوئی تو کہا!

؎ اذاں دیں گے بلند اعلاں، سُنے سا ، تمام عالم
حکم حق نے دیا ہم کو، کہا احمد نبی اکمل [۲۸۹]

سائیں عبدالغنی

سائیں عبدالغنی ۱۲۶۰ھ میں بمقام کراچی پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کے بعد داناپور (پٹنہ) سے ہجرت کرکے کراچی آگیا۔ اس وقت سائیں کے پدر محترم مولانا شاہ محمد بشیر کا عالم جوانی تھا۔

سائیں عبدالغنی نے ابتدائی تعلیم اپنے بہنوئی حافظ علم الدین قادری سے حاصل کی پھر آپ کا دل روحانیت کی طرف مائل ہوگیا۔ شروع میں آپ نے کراچی ہی میں اعتکاف کیا پھر مرشد کامل کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ اجمیر شریف میں بشیر شاہ نامی فقیر سے ملاقات ہوئی۔ اس کے ساتھ احمد نگر کے خانوادہ ادھمیاں پہنچے۔ وہاں سے کراچی آگئے۔

اب آپ اپنے مسلک طریقت میں کامل ہو چکے تھے لہٰذا دھوبی گھاٹ لیاری میں ایک عمارت بنوائی اور وہاں رشد و ہدایت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ۱۲ ربیع الاول ۱۳۵۷ھ کو آپ خالق حقیقی سے جا ملے مگر آپ کا مرکز تبلیغ اب بھی باقی ہے اور اس سے آج بھی معرفت الٰہی کے درس دیئے جاتے ہیں۔ سائیں عبدالغنی اُردو کے قادرالکلام شاعر تھے "کلام عرفان غنی" آپ کی یادگار ہے۔

؎ معشوق سے نہیں ہے عاشق کی زندگانی — پر عشق ہی سے حاصل ہو عمر جاودانی
گر عشق دل میں پیدا، مت وصل کی طرف جا — دنیا و دیں دونوں کا لطف لے اے جانی

---

[۲۸۹] سندھ میں اُردو شاعری، صفحہ ۲۶۷ مطبوعہ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۷۰ء

؎ جسم میرا ہے جگ میں اسکی جاں   اور میرا وطن عدم یارو!

؎ یہی زینہ فنا کا ابتدائی ہے جو جانے تو   مسلماں، ورنہ، یوں ہر وقت بسم اللہ کہتے ہیں

؎ قرار اس سرا میں نہیں ہے کسی کو   کوئی آرہا ہے کوئی جا رہا ہے
کہیں کس کو مظلوم اور کس کو ظالم   کہ اک دوسرے کو یہاں کھا رہا ہے[۸۵]

ہدایت علی تارک

ہدایت علی، میاں تراب علی کے منتوں مرادوں کے بیٹے تھے۔ ۱۳۱۲ھ میں بمقام تعلوراننگ تعلقہ وارہ میں پیدا ہوئے، مروجہ علوم کی تکمیل سے فراغت ہی پائی تھی کہ عشق کا سودا ہو گیا۔ اس میں ناکامی نے دل و دماغ کو بہت متاثر کیا اور دل کی چوٹ بلا ارادہ شعر کا قالب اختیار کرنے لگی۔

آپ ہفت زبان شاعر تھے، فارسی، سندھی، سرائیکی، پشتو، ہندی، اُردو سب میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ پہلے نجمی تخلص کرتے تھے پھر تارک ہو گئے۔ اردو میں آپ کا سرمایہ غزلوں کے دو مجموعے اور چند مراثی ہیں۔ سندھی میں بہت کچھ کہا ہے۔ اُردو کلام کا نمونہ پیش ہے۔

ہے جس کو عشق میں مدہوش پایا   اسے ہی خلق سے روپوش پایا
چمن میں رہتے ہیں گل خار باہم   غم و شادی کو ہم آغوش پایا
ملا ہے نطق، ما ینطق سے جسکو   وہ بزم عقل میں خاموش پایا
پڑا ہے میکدے میں عشق کے پاؤں   دل افسردہ کو پُر جوش پایا[۸۶]

۸۵؎ "صوفیائے سندھ اور اُردو" از پروفیسر معین الدین دردائی صفحہ ۲۲ مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی سنہ ۱۹۷۳ء

۸۶؎ "سندھ میں اُردو شاعری کا ارتقاء" از معراج نیر صفحہ ۷۱ مطبوعہ الحمرا اکیڈمی لاہور سنہ ۱۹۷۳ء

بحوالہ مقالہ محمد مبارک بروہی برائے ایم اے سندھی، سندھ یونیورسٹی حیدر آباد سنہ ۱۹۶۵ء

پیر محمد اسمٰعیل جان روشن

پیر محمد اسمٰعیل جان پیر آغا محمد حسین خاں سرہندی کے بڑے صاحبزادے تھے، ۱۳۰۶ھ میں بمقام سکھر پیدا ہوئے۔ آپ علمی و ادبی گھرانے کے فرد تھے لہٰذا تعلیم و تربیت اسی معیار پر ہوئی۔ بیس سال کی عمر میں حیدر آباد منتقل ہوئے پھر مستقلاً ٹنڈو محمد خاں میں بس گئے۔

سندھی، اُردو، عربی، فارسی اور پشتو کئی زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ آخر عمر میں صرف عربی و فارسی کی نعتوں تک محدود ہو گئے تھے۔ بہت سی کتابوں کے مصنف تھے اور صاحبِ دیوان تھے۔ اُردو کا کلام اب تک دستیاب نہ ہو سکا۔ [۵۷]

مولوی محمد صادق رانی پور

محمد صادق قصبہ خلیل موضع عبدالواحد کھمبڑا ضلع رحیم یار خاں میں ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ کچھ دن بعد ان کے والد ترک وطن کر کے ریاست خیر پور میں آبسے۔ اس طرح محمد صادق کا بچپن بھاولپور میں، جوانی اور بڑھاپا سندھ میں گزرا۔

ابتدائی تعلیم وہ بھاولپور میں حاصل کر چکے تھے، تکمیلِ تعلیم رانی پور میں کیا اور پھر سجادہ تصوف کے مسند نشین ہو گئے۔ میر علی نواز خاں ناز، والی خیر پور ان پر بہت مہربان تھے۔ انہیں کی تحریک پر اُردو کی طرف توجہ کی اور نثر و نظم دونوں میں ملکہ حاصل کیا۔ نظم کا نمونہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

ء بہت ممکن ہے، خار و گل کی یکتائی کا ماتم ہو — نظر کانٹوں پہ رکھتے ہیں گلستاں دیکھنے والے

گل و بلبل پہ جو افتاد آئی، کیا خبر ان کو — بہاروں میں جو ہیں رنگِ گلستاں دیکھنے والے

ہنسی میں بھی مری اک آہ کا عالم نکلتا ہے — ہوئے برداشتہ دل مجھ کو خنداں دیکھنے والے [۵۸]

---

[۵۷] "سندھ میں اُردو شاعری کا ارتقاء" از معراج نیر صفحہ ۱۵۱، مطبوعہ الحمرا اکیڈمی لاہور ۱۹۶۲ء

[۵۸] "سندھ کے جدید اُردو شعراء" از مشتاق علی جعفری صفحہ ۹۰ مطبوعہ ظہیر سنز حیدر آباد ۱۹۶۱ء

میر غلام حسن احسن

میر غلام حسن ۱۸۸۴ء میں بمقام خیر پور پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم خیر پور ہی میں حاصل کی۔ تکملۂ تعلیم لاہور اور اجمیر میں کیا۔ ذوق شعری ریاست کی طرح ورثے میں ملا تھا جس پر اجمیر و لاہور کے علمی ماحول نے جلا کر دی اور فکری صلاحیتوں میں نکھار پیدا کر دیا۔ آپ نے اُردو فارسی دونوں میں طبع آزمائی کی ہے اور حقیقتاً شعر گوئی کا حق ادا کیا ہے۔ اُردو کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

؎ بے کیف زندگی تھی دردِ جگر سے پہلے	کچھ بھی نہ تھا جہاں میں پہلی نظر سے پہلے
اب مل گیا ہے جسکو اک مرکزِ عقیدت	بکھرے ہوئے تھے سجدے اس سنگِ در سے پہلے

؎ نام جس چیز کا زمانہ ہے	بے ثباتی کا کارخانہ ہے
فرصتِ مستعار و قصۂ عمر	وقت کم اور بڑا افسانہ ہے

؎ اللہ رے جمالِ رخِ سید البشر	جل جل کے بجھ رہا ہے کنول آفتاب کا
رنگین لبوں کو رحلِ کتابی میں دیکھئے	قرآں میں رکھا ہے ورق اک گلاب کا

انجمن ترقی اُردو کے مشاعروں کے شاعر

سیٹھ علی محمد احسن

ہارون فیملی سے متعلق تھے۔ آپ کے والد کا نام سیٹھ حاجی ہارون تھا جو میمن قوم کی ایک ممتاز فرد تھے، بیسویں صدی عیسوی کے نصف تک کراچی میں قیام فرما

---

[۱] تاریخ خیر پور از نسیم امروہوی صفحہ ۱۸۵ مطبوعہ خیر پور پریس ۱۹۵۵ء

تھے۔

ے طلب منزل کی صادق ہے تو سرگرم سفر ہو جا
مسافر او مسافر، انتظار کارواں کب تک
خیال آئے گا کب اس کی ترقی واشاعت کا
رہے گی منہ کو تکتی آپ کی اردو زباں کب تک
وہ میرا آشیاں جو چار تنکوں کا ہے مجموعہ
گریں گی اس پہ، یارب، قہر کی یہ بجلیاں کب تک

احمد خاں جوہر

آپ کے والد نے جیسلمیر سے آکر کراچی میں سکونت اختیار کی تھی۔ آپ کی ولادت کراچی ہی میں ہوئی۔ یہیں پرورش پاکر بڑے ہوئے، بمبئی یونیورسٹی سے ڈرائنگ کی سند حاصل کی، محکمۂ تعلیمات میں ٹریسر کے عہدے پر ملازم تھے، آپ کا تخلص ڈھولا بھی تھا۔

ے خون میرا جب سوار دوش قاتل ہو گیا
سر اٹھانا بار سے ظالم کو مشکل ہو گیا
زندگی کا دے رہی تھی تابش اختر پیام
لیکن اک ہمراز جاں لینے پہ مائل ہو گیا

محمد عبداللہ حافظ لاڑکانوی

آپ کا آبائی وطن لاڑکانہ تھا، سندھی کے اچھے شاعر تھے، اردو میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ ۱۹۴۰ء میں کراچی میں قیام پذیر تھے۔

ے مجھکو دنیا کے حوادث ڈگمگا سکتے نہیں
حق پرستی سے قدم میرا ہٹا سکتے نہیں
داغ الفت کو مٹانا چاہتے ہیں وہ ضرور
داستان عشق کو لیکن بھلا سکتے نہیں

عبدالحمید حمید

انیسویں صدی عیسوی میں آپ کے بزرگ کراچی آکر آباد ہوئے تھے۔ آپ کی ولادت اور پرورش کراچی میں ہوئی۔ اُردو کا بڑا ستھرا ادبی ذوق رکھتے تھے۔ نظم و نثر دونوں پر قادر تھے۔ نظم کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

ؔ قربان ادا ہوں تیری صورت پہ فدا ہوں — کافر ہوں اگر تیرے سوا اور کو چاہوں
وہ طرزِ فغاں بھول گئے اہلِ قفس کیوں — کیا میں چمنستان میں بھی نغمہ سرا ہوں
حسرت ہے تری راہ میں راحت ملے مجھکو — ارمان ہے دل میں تری خاک کفِ پا ہوں

سید بچل شاہ راز

باپ دادا اندرون سندھ میں کسی مقام کے رہنے والے تھے، بچل شاہ کراچی ہی میں رہتے تھے، اُردو کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے۔

ؔ حقیقت میں مہماں سرا ہے یہ دُنیا — کوئی آرہا ہے کوئی جارہا ہے
یقیں ہے کہ ساحل پہ پہنچے گا جلدی — سفینہ ہمارا چلا جا رہا ہے

سیٹھ عبدالرحیم رحیم

کراچی کے رہتے ۔ رہے تھے۔ بچی مینن ڈیبیٹنگ سوسائٹی صدر بازار کے سکریٹری تھے۔ اُردو سے ایک خاص لگاؤ تھا۔

ؔ کس لئے اب یاد آتے ہیں جوانی کے مزے — دل کہاں سینے میں ہے اور دل میں کہاں وہ جوش ہے
محنت و تکلیف سے کٹتی ہے عمرِ ناتواں! — زیست بھی انسان کی دنیا میں بار دوش ہے

مول چند

آپ ملتان سے آکر سندھ میں آباد ہوئے تھے۔ اردو کا خاصا ذوق رکھتے تھے۔
نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

؎ اٹھو، طوق غلامی کو نکالو اپنی گردن سے
تمہارے پائے ہمت میں رہیں گی بیڑیاں کب تک
اٹھو، کرلو ابھی وہ کام جو کرنا ہے کل تم کو
خدا جانے رہے یہ اتحاد جسم وجاں کب تک

منشی عبدالستار کلیمؔ

آبائی وطن کلیانہ تھا۔ آپ کی ولادت ریاست خیر پور سندھ میں ہوئی، وہیں پرورش پائی، ملازمت کے سلسلے میں کراچی میں مقیم تھے۔

؎ زمانہ موت سمجھا ہے مگر میں یہ سمجھتا ہوں
کہ اک جامہ بدل کر آرہی ہے زندگی میری
اٹھیں موجیں جو میں ڈوبا، یہ حسرت رہ گئی دل میں
کہ ساحل تک نہیں پہنچی نگاہ آخری میری

عبدالمجید کیفؔ

حیدرآباد سندھ میں پیدا ہوئے۔ نصابی تعلیم میں میٹرک سے آگے نہ بڑھ سکے لیکن سندھی اور اردو دونوں پر دسترس رکھتے تھے اردو میں نظم اور غزل دونوں کہتے تھے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

ے نہ عندلیب کی خاطر نہ باغباں کے لیے — یہ گل کھلے ہیں چمن میں مگر خزاں کے لیے
مثالِ بوئے گل آزاد اس چمن میں رہا — نہ میں قفس کے لیے تھا نہ آشیاں کیلئے
نہ لب تک آسکا افسوس ماجرا دل کا — بیانِ حال ترستا رہا زباں کے لیے

محمد بخش راز

آپ کے بزرگ ابتداءً جیسلمیر کے رہنے والے تھے پھر آپ کا خاندان سندھ میں آ بسا تھا۔ آپ کی ولادت کراچی میں ہوئی۔ یہیں پلے بڑھے اور صاحب استعداد ہوئے اردو کے اچھے شاعر تھے۔ ملاحظہ ہو نمونۂ کلام۔

ے نگہ سیخ تغافل ہائے نمکیں آزما کیا ہوں — کہ اس غافل کی باتوں کو تو کچھ میں ہی سمجھتا ہوں
شکوہ جنبش امواج کی ساحل کو کیا پروا — تغیرّ ہائے عالم سے بہت بے فکر رہتا ہوں
کسی صورت زمانہ زیر کر سکتا نہیں مجھ کو — زمین و آسماں کو ایک کر دوں میں اگر چاہوں

عبد الکریم عزمی

آپ کراچی کے ایک بڑے سوداگر تھے، ۲۰ اکتوبر ۱۹۲۷ء میں انتقال فرمایا۔

ے بت پرستی نے سکھائی حق پرستی ایک دن — شکر کرتا ہوں کہ وہ کافر مسلماں ہو گیا
کھل رہا ہے پھر خدارا کھلے گل داغ جگر — دامن دل آج ہم رنگ گلستاں ہو گیا

حافظ نیاز احمد نیاز

آپ کے والد جھجر سے سکھر آ گئے تھے۔ خود آپ نے کراچی میں تعلیم پائی، رنچھوڑ لائن میونسپل اسکول میں ماسٹر تھے اور مسجد باگی لائن میں امامت کرتے تھے۔ کلام کا

نمونہ حسب ذیل ہے۔

خطائیں ہو رہی ہیں آجکل ہر مرد عاقل سے
الٰہی رحم کر سب بے خبر ہیں اپنی منزل سے

ہماری کوششیں موقوف انجام مخالف ہیں
ہماری کشتیٔ اُمید نامحرم ہے ساحل سے

لالہ سری رام گل

دہلی کے رہنے والے تھے مگر عمر کا بڑا حصہ کراچی ہی میں گزرا تھا اس لیے صحیح معنیٰ میں کراچی ہی کے متوطن تھے۔ ہندی اور اردو دونوں کے شاعر تھے۔ اُردو کا نمونہ پیش ہے۔

آنکھ نے تصویر لی، دل نے اچک کر دیکھ لی
تم سراسر بے خطا سر کو سزا دینے لگے

ہو گیا گھر پھونک کر یہ تو تماشا دیکھنا
آتش دل کو ہم آہوں سے ہوا دینے لگے

شک ہوا ان کو نہ پھر سے پھوٹ نکلے یہ کبھی
گلؔ کو مٹی قبر میں جب اقربا دینے لگے

وفا ایڈوانی

اندرون سندھ سے کراچی میں تعلیم حاصل کرنے آئے تھے۔ کراچی کے مشاعروں نے اردو کا شاعر بنا دیا۔ اچھے شعر کہتے ہیں۔

وہ جفا و جور سے گر باز آ سکتے نہیں
ہم بھی حال دل انہیں اپنا بتا سکتے نہیں

بھول جائیں وہ وفاؔ ہم کو تو ہے یہ اور بات
بھولنے والے کو لیکن ہم بھلا سکتے نہیں

ماخوذ از "رپورٹ مشاعرہ کمیٹی" انجمن ترقی اردو کراچی بتقریب سلور جوبلی ۱۹۴۳ء مرتبہ رضا ہمدانی مطبوعہ

سندھ میں اردو نثر اور نثر نگار

قیام پاکستان سے پہلے

تقسیم سے قبل سندھ میں اُردو کا نثری اثاثہ بہت مختصر تھا جس کے مبینہ اسباب تھے۔ حالانکہ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پر ہے کہ یہ زبان شمالی ہند اور دکن کی طرح سندھ کے خانقاہی حلقے میں ہمیشہ سے بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ شاہ لطیف کے بزرگ، پیر پگاڑو اور پیر جھنڈو کے سے برگزیدہ اسلاف اس کے مربی تھے اور شاید یہ ان ہی پیران طریقت کی سرپرستی کا نتیجہ تھا جو اس زبان نے سندھ کے بعض موقر گھرانوں کی نجی زندگی میں اپنی جگہ بنالی تھی مگر صرف بول چال کی حد تک۔ قلم کے میدان میں اس کی پذیرائی بہت بعد میں ہو سکی۔

نظم کا جہاں تک تعلق ہے وہ تو شمالی ہندوستان یا دکن کے متوازی چلتی رہی مگر باقاعدہ اُردو نثر کا آغاز کافی فصل سے ہوا۔ خطوط، فتاوے اور بعض تراجم کا سراغ تو اٹھارویں صدی عیسوی میں لگتا ہے لیکن نثر نگاری کی ابتداء صحیح معنیٰ میں انیسویں صدی کی چھٹی ساتویں دہائی میں ہوئی۔ اس کا تعین اس دور سے کیا جا سکتا ہے جب مرزا مخلص علی کے صاحبزادے مرزا جعفر علی نے سندھ سے اُردو کا پہلا اخبار "دوربین" جاری کیا۔[1] اس خاندان کے تمام افراد اور ایسے ہی بعض دوسرے خانوادوں کے لوگ اُردو کے شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی۔ ان کے ادب پارے لاہور اور دلی کے جرائد میں شائع ہوتے تھے مگر اب ان کا سراغ لگانا مشکل ہے پھر بھی اتنی بات دلائل کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اہل سندھ اپنے ذوق کی تسکین کے لیے دلی اور پنجاب سے اُردو کی کتابیں منگواتے تھے جس کا سلسلہ قیام پاکستان کے بعد تک باقی رہا۔

---

[1] مضمون "سندھی لیتھوگرافی" از مولانا غلام محمد گرامی "مشمولہ سندھی ادب نمبر نئی قندیل" ۱۹ مطبوعہ حیدرآباد ۱۹۶۳ء

کتابوں کے آنے جانے یا خط و کتابت کیلئے کسی عہد کو مختص نہیں کیا جا سکتا مگر اندازہ یہ ہوتا ہے کہ نظم کی طرح نثر میں بھی سندھ، دکن یا شمالی ہند سے متاثر ہوتا رہا جس کے ثبوت میں شاہ ولی اللہ اورینٹل کالج منصورہ میں موجود بھگوت گیتا کا مخطوطہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ مخطوطہ فارسی زبان میں گیتا کا ترجمہ ہے جس کے آخر میں بعض باتوں کی صراحت اُردو میں کی گئی ہے۔ مترجم سہون کے رہنے والے مول رام ولد آنند رام ہیں جنہوں نے ۲۵ ذوی الحج ۱۱۹۵ھ کو مخطوطے کا تکملہ کیا۔ نمونۂ نثر اُس عہد کی اُردو نثر کی ترجمان ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"بیاس دیو سری بھگوت گیتا سری کرشن جیو ارجن سنبادے۔"

"جب باندوار کیروں مہابھارتیہ کے جگڑہ کوں کورکھیتر کوں چلے تب راجہ دہراشٹ کہو ———— ہوں بھی جگڑہ کا کرتک دیکھن کوں چلوں ہوں۔ جب ایہہ بات دہراشٹ کہی تب تس کوں سری بیاس جیو کہیو۔ جو ہی راجہ تیرے نیتر ناہیں۔ نیتر بنا کیا دیکھیں کا۔ تب دہراشٹ کہو۔ جو ہوں دیکھوں کا ناہیں تو سروں دوار کر سر کروں کا۔"

ایک دوسرا اقتباس بھی قابل ملاحظہ ہے۔

"ارجنو واچہ۔ ہے جادو بنسیوں پکھی سریشٹ سری کرشن بھگوان کرپا ندہان جیوا ایہہ بات سبھی منکتہ سمجھتے ہیں۔ جو پاپ کئے تین دوکھ پائے ہے۔ جیسے بکھہ کھائے۔ تین پرانے کا مانس ہوتا ہے۔ تیسے ہی پاپ کرم تین دوکھ پائے ہے۔ ایہہ بات سمجھ کر ہے پر بہہ جیوا ان منکھوں کوں پاپ بل کر کے کوں کراوے ہے۔ سو مجھ کوں کرپا کر کہو۔" [۵]

ان اقتباسات سے ایک طرف سندھ میں نظم کے ساتھ اُردو نثر کے وجود کا پتہ چلتا ہے، دوسری طرف اُس ناگزیر ماحول پر روشنی پڑتی ہے جس نے فارسی ترجمہ کے

---

[۵] مضمون "سندھ میں اردو کا دو سو سال پرانا مخطوطہ" از پروفیسر محمد سلیم منشوا۔ قومی زبان میں دسمبر ۱۹۶۷ء مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان۔ کراچی

دامن میں صراحتی بیان کو اردو میں لکھنے پر مجبور کر دیا اور اگر صرف اتنا ہی مان لیا جائے کہ مول رام کو نوزائیدہ اردو سے ذاتی دلچسپی تھی تب بھی یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ مسلمان تو مسلمان ہندو تک اردو جانتے تھے اور اردو سندھ میں فارسی سے زائد قابل فہم تھی۔

نثر کے انداز پر بلاشبہ سندھ کی چھاپ لگی ہوئی ہے مگر الفاظ اور جملوں کی ساخت لگ بھگ وہی ہے جو اٹھارویں صدی عیسوی میں دلی یا دکن میں تھی۔ بالفاظ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو نثر کے قدم شروع ہی سے سندھ میں جم گئے تھے اور اس کا استعمال عوامی سطح پر ہوتا تھا، بول چال میں بھی اور تحریر میں بھی۔

کتابیں دوسرے علاقوں میں بھی آگے چل کر ہی لکھی گئیں اور سندھ میں بھی — یہ اور بات ہے کہ سندھ میں کتابوں کی رفتار کچھ سست رہی کیونکہ یہاں کی اصل زبان سندھی تھی، اردو کو اس کے بعد کا درجہ حاصل تھا اور اسی لیے سندھ میں شروع شروع اردو کے نثر نگار بہت کم پیدا ہوئے۔

سندھ کا ادبی سرمایہ اگرچہ بڑی تیزی سے سامنے آتا جا رہا ہے پھر بھی بہت کچھ کونوں کھدروں میں پڑا ہوا ہے۔ قیاس غالب ہے کہ مستقبل میں ان گنت "مول رام" منظر شہود پر آئیں گے اور خانقاہی حلقے سے بھی بعض چہرے ابھریں گے جو "حضرت گیسو دراز" کے متبع ہوں گے۔

سر دست جن مصنفین اور نثر نگاروں کا پتہ لگا ہے، ان کو سن وفات کی ترتیب سے پیش کیا جا رہا ہے۔

میر محمد حسن علی خاں حسن

(حصۂ نظم سے پیوستہ) آپ ایک عالم و فاضل انسان تھے۔ فارسی اور سندھی نثر میں آپ کی کئی کتابیں ہیں۔ کلکتہ کی نظر بندی کے زمانے میں آپ کو اردو کا ذوق پیدا ہوا۔ اردو نثر میں "احسان البیان" نام کی کتاب آپ کی تصنیف ہے۔

صورت سنگھ صورت بہار

(حصۂ نظم سے پیوستہ) سندھ میں اُردو کا یہ قدیم شاعر فن موسیقی کا ماہر بھی تھا۔ اس نے اُردو نثر میں ایک رسالہ مرتب کیا تھا جس کا نام راگ مالا تھا۔ اس میں اگرچہ موسیقی کے سروں پر بحث تھی مگر اس کو سندھ کی اُردو نثر کا ابتدائی نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے[۱]

پیر بھاون علی شاہ ساقی

(حصۂ نظم سے پیوستہ) اُردو، فارسی اور سندھی کے عالم تھے۔ اپنے خاندان کے حالات اُردو میں قلمبند کیے تھے۔

سید رشد اللہ شاہ

پیر رشد اللہ شاہ پیر محمد مکی کے خاندان سے تھے۔ آپ کے والد سید رشید الدین ایک عالم و فاضل اور اللہ والے بزرگ تھے۔ دادا اور پر دادا کی بھی یہی کیفیت تھی بلکہ پر دادا کی ذات میں زہد و تقویٰ بدرجہ اتم تھا۔ آپ کی ذات تک خاندان کا جھنڈا اور پگڑی یعنی جہاد اور تبلیغ ایک ہی شخص کے سپرد رہا لیکن آپ کے بعد دونوں بیٹوں میں برابر کی تقسیم ہوگئی۔ پگڑی پیر صبغۃ اللہ کو ملی اور جھنڈا پیر محمد یٰسین کو جو پیر رشد اللہ شاہ کے حقیقی دادا تھے۔

اس طرح پیر پگاڑو اور پیر جھنڈو نام کے دو خانوادے وجود میں آگئے۔ پیر صبغۃ اللہ شاہ اول پہلے پیر پگاڑو تھے اور پیر محمد یٰسین پہلے پیر جھنڈو۔ پیر صبغۃ اللہ سید احمد شہید کی تحریک احیاء دین سے بہت متاثر تھے اسی لیے اپنے مریدوں کو اس طرح منظم کیا تھا کہ ضرورت پڑنے پر تلوار اٹھا سکیں۔ یہ تھی ابتدا حُر تحریک کی۔

پیر رشد اللہ، پیر محمد یٰسین کے پوتے اور جانشین تھے۔ آپ کی پیدائش بمقام

---

[۱] مضمون صورت بہار کی راگ مالا از ڈاکٹر نجم الاسلام مطبوعہ نئی قدریں حیدرآباد نومبر ۱۹۶۸ء صفحہ ۲۰

پیر جھنڈو نزد سعید آباد (حیدر آباد) ہوئی۔ حصول تعلیم کے بعد آپ اپنے پدر محترم کی تاسی میں تحریک خلافت میں شریک ہو گئے اور اس سلسلے میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔

پیر رشد اللہ شاہ ایک ذی علم بزرگ تھے۔ سندھی زبان کے اچھے لکھنے والے تھے، دو کتابیں آپ نے اردو میں بھی تحریر فرمائیں ایک عین المنانۃ فی تحقیق تکرار الجماعۃ، جو قلمی ہے اور پیر صاحب کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہے۔ دوسرا ایک مطبوعہ رسالہ ہے، الفارقۃ بین اہل اللہ و بین المارقۃ جو پیروں اور مریدوں کی ہدایت کے لیے اردو میں لکھا گیا ہے۔ [۵۵]

میرزا قلیچ بیگ

(حصہ نظم سے پیوستہ) سندھی ادب میں آپ کی حیثیت اظہر من الشمس ہے بمبئی کے زمانہ قیام میں مرزا حیرت دہلوی سے بہت متاثر تھے اور اس زمانے میں اردو میں لکھا کرتے تھے۔ سندھ واپس آ کر زمانہ ملازمت میں یہ سلسلہ منقطع ہو گیا پھر سندھی نثر نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ تاہم اردو نثر نگاری آپ کی رہین منت ہے۔ عملی زندگی میں اکثر آپ نے اردو میں لکھا بھی ہے اور تقریریں بھی کی ہیں۔ سودائے خام، ابکار الافکار، مخزن القوافی، خصائص القرآن، توبہ اور اس کی حقیقت، خورشید اور لیل و نہار وغیرہ آپ کی اردو تصانیف میں ہیں۔

میرزا مدد علی بیگ

(حصہ نظم سے پیوستہ)۔ آپ سندھی کے نثر نگار تھے۔ اس زبان میں کئی ناول لکھے ہیں۔ ایک رسالہ صراط المستقیم بھی نکالتے تھے۔ کبھی کبھی اردو میں بھی لکھتے تھے۔

---

[۵۵] "صوفیائے سندھ اور اردو" از پروفیسر معین الدین دردائی ص ۲۴۳ مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۸۱ء

میر علی نواز خاں

(حصۂ نظم سے پیوستہ) میران خیر پور میں آپ کی علمی شخصیت ہر لحاظ سے مسلم ہے۔ آپ انگریزی، فارسی، سندھی اور اردو پر یکساں طور سے قادر تھے۔ اردو نثر میں آپ کا کوئی نمایاں حصہ نہیں ہے لیکن آپ اکثر اردو میں لکھا کرتے تھے۔ ۱۹۰۷ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کراچی میں ایک یادگار تقریر کی تھی۔ نومبر ۱۹۰۹ء میں علی گڑھ کانفرنس میں اپنے پدر محترم کی طرف سے آپ نے جو سپاسنامہ پیش کیا تھا وہ اپنی سلاست وروانی کے اعتبار سے اردو نثر کا اچھا نمونہ ہے جس کی شہادت اس دور کی علی گڑھ کالج میگزین سے مل سکتی ہے۔

مولوی محمد صادق ۔ رانی پور

(حصۂ نظم سے پیوستہ)، آپ کی وابستگی دربار خیر پور سے تھی۔ میر علی نواز خاں کی ہدایت پر آپ نے اردو میں ایک رسالہ لکھا تھا جس میں مسلمانوں کے تمام فرقوں کے اصول یکجا کئے تھے اور ایک مشترک عقیدہ "دین اللہ" تجویز کیا تھا۔

پیر جمال الدین علوی

(حصۂ نظم سے پیوستہ)، آپ تحریک خلافت کے سرگرم رکن تھے۔ اسی سلسلے میں "تھانہ" بمبئی میں مقید رہے۔ کئی زبانیں جانتے تھے۔ سندھی اور اردو میں سیاسی مضامین لکھا کرتے تھے اور اخبارات میں آپ کے بیانات تو اکثر چھپتے رہتے تھے۔

ہدایت علی تارک

(حصۂ نظم سے پیوستہ) آپ نے اردو میں بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ تعلیم کے موضوع پر آپ کے بہت سے مضامین ہیں۔ تصوف کی ایک کتاب فارسی سے

سندھی اور اُردو میں ترجمہ کی، اُردو میں ایک کتاب تحفۃ الاصفیائی بیان الاولیا تحریر کی۔

سائیں عبدالغنی

(حصہ نظم سے پیوستہ) آپ اُردو کے باقاعدہ نثر نگار تو نہ تھے لیکن آپ کے مطبوعہ ملفوظات کو نثر کا نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھی

آپ ۱۰ مارچ ۱۸۷۲ء کو میانوالی ضلع سیالکوٹ کے ایک سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائے عمر سے غور و فکر کی عادت تھی لہٰذا اسکول کی زندگی ہی سے اسلام کے اثرات قبول کرنا شروع کر دئے۔ شاہ اسمٰعیل شہید کی تقویت الایمان سے متاثر ہو گئے اور گھر سے فرار ہو کر سندھ میں "حافظ محمد صدیق بھرچونڈی والے" کی پناہ میں آگئے پھر قسمت نے انہیں دیوبند پہنچا دیا اور کئی برس تک مختلف استادوں سے مستفیض ہونے کے بعد آپ کا جوہر قابل نکھر آیا۔

اب مولانا ایک عالم دین اور ایک صوفی با صفا بن چکے تھے تبلیغ دین کی لگن نے آپ کو زیادہ دن کسی ایک مقام پر بیٹھنے نہ دیا۔ کبھی گوٹھ پیر جھنڈو میں تصوف کی تعلیم و تعلم میں وقت گزارا، کبھی امرکوٹ میں نشر و اشاعت کا سلسلہ جاری کیا اور اس طرح بھی قرار نہ آیا تو بارہ تیرہ سال مکہ معظمہ میں گزار آئے۔ آپ ولی اللٰہی فلسفہ کے شیدائی تھے اور تمام دنیا میں اس کی ترویج کر دینا چاہتے ہیں۔ آخر ۲ رمضان ۱۳۶۳ھ کو بمقام دین پور (بہاولپور) سفر آخرت فرمایا۔

مولانا ایک مفکر، عالم دین، صوفی، مفسر، خطیب اور ادیب تھے۔ سندھی، فارسی، عربی، نہ اُردو ہر زبان میں لکھتے تھے۔ خطبات و مقالات، المقام المحمود، آپ کی یادگار تصانیف ہیں۔ اُردو میں پانچ کتابیں پائی جاتی ہیں۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ، شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، قرآن مجید کا مطالعہ کیسے کیا جائے

دیباچۂ شرح حجۃ البالغہ، کابل میں سات سال۔

حد سے زیادہ علم اور فکر عموماً تحریر کو بلیغ اور ثقیل بنا دیتی ہے مگر مولانا کی زبان بہت سلیس اور شگفتہ ہوتی تھی۔ تقریروں میں بھی اور ان کتابوں میں بھی جو چھپ کر منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ۵

مولانا محمد قاسم

اپنے آبائی گاؤں میاں گوٹھ (شکارپور) میں ۱۳۰۵ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مولانا محمد ہاشم مدرسۂ ہاشمیہ کے بانی اور گڑھی لیسین کے ثقہ عالم تھے لہٰذا آپ کی تربیت خالص علمی اور مذہبی ماحول میں ہوئی اور آپ جلد ہی علوم متداولہ میں ماہر ہو گئے۔

آپ ایک صاحب کرامات بزرگ تھے اور عوام کو آپ سے بڑی عقیدت تھی۔ مادری زبان سندھی تھی لیکن فتاوے عموماً اردو ہی میں لکھتے تھے۔ آپ فارسی اور اردو کے شاعر تھے، قاسم تخلص کرتے تھے لیکن نثر میں آپ کا قلم بہت رواں تھا۔ مجموعہ فتاوی قاسمیہ کا قلمی نسخہ مدرسۂ ہاشمیہ گڑھی لیسین میں محفوظ ہے جو آپ کی نثر کا نمونہ ہے۔ ۶

پیر سید فضل اللہ شاہ

پیر فضل اللہ شاہ چوتھے پیر جھنڈو تھے، بڑے صاحب علم و فضل اور باکرامت بزرگ تھے۔ آپ ۷ رمضان ۱۳۱۳ھ کو عالم شہود میں آئے اور والد ماجد کے وصال پر درگاہ شریف کے سجادہ نشین ہوئے۔

آپ کو عربی، فارسی، سندھی، اردو چاروں زبانوں پر یکساں دسترس حاصل تھی۔ سندھی

---

۵ صوفیائے سندھ اور اردو از پروفیسر معین الدین دردائی ص۲۰۳ مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۷۵ء

۶ صوفیائے سندھ اور اردو از پروفیسر معین الدین دردائی ص۲۲۵ مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۷۵ء

کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی لکھتے تھے۔ آپ کی دو اردو کتابیں کتب خانہ درگاہ میں محفوظ ہیں۔ البلاغ التحقیق بالتحقیق العمیق اور المقالۃ المحبوبہ فی الدعا بعد الصلوٰۃ المکتوبہ۔

اول الذکر ایک خطبۂ صدارت ہے۔ دوسری کتاب ایک خالص مذہبی تصنیف ہے۔ تحریر میں اگرچہ عربی فارسی الفاظ کا استعمال زیادہ ہے مگر اس سے روانی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ؎

حکیم فتح محمد سیوہانی

سندھ کا یہ عظیم صحافی و ادیب ۱۸۵۲ء میں اپنے آبائی وطن سہون میں پیدا ہوا اور فارغ التحصیل ہو کر نوشہرہ فیروز میں طبابت کرنے لگا پھر کچھ دن حیدرآباد رہ کر کراچی کا عازم ہوا جہاں کچہری روڈ پر ۱۹۱۵ء میں مطب کا آغاز کیا۔

فتح محمد سیوہانی نے ایک دردمند دل پایا تھا۔ ادب سے فطری لگاؤ تھا اور پیشہ ورانہ مصروفیت کے باوجود اس کے لیے وقت نکال لیتے تھے۔ آپ عربی، فارسی سندھی اور اردو سب پر دستگاہ رکھتے تھے اور سندھی، فارسی اور اردو تین زبانوں میں شعر بھی کہتے تھے۔ اردو کا نمونہ شاعری صحافت کے باب میں پیش کیا جا چکا ہے سندھی میں آپ کی ان گنت تصانیف ہیں۔ اردو میں صرف دو کتابوں کا سراغ لگا ہے، آئینہ سکندر، اور فتح محمدی۔ مضامین بے شمار پائے جاتے ہیں۔ مدینہ بجنور، تیج، الجمعیت، ہمدرد، زمیندار اور نیرنگ خیال وغیرہ کی پرانی فائلیں جس کی شہادت دیں گی۔ ۱۳ دسمبر ۱۹۴۲ء کو آپ نے وفات پائی۔ ؎

؎ "صوفیائے سندھ اور اردو" از پروفیسر معین الدین دردائی صفحہ ۲۸۲ مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۷۳ء

؎ ماخوذ از "سندھ کے اردو نثر نگار" غیر مطبوعہ مقالہ ڈاکٹر محمد صلاح الدین برائے پی ایچ ڈی

سندھ میں اردو شاعری کا ارتقاء

قیام پاکستان کے بعد

سندھ میں اُردو شاعری کا موجودہ دور ادبی تاریخ کا ایک روشن باب ہے جس کو اس اعتبار سے تشکیل پاکستان کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے کہ شاعروں کی گنتی کراچی کو شامل کرکے ہزاروں تک پہنچ گئی لیکن حقیقتاً سندھ میں اُردو کی ترویج نہ پہلے شمالی ہند اور پنجاب کے ادباء و شعراء کا کام تھا اور نہ سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد انہوں نے اس سلسلے میں کوئی کارنمایاں انجام دیا —— اس خطے میں تو اُردو کو خود اہل سندھ نے پروان چڑھایا اور مادری زبان نہ ہونے کے باوجود اس زبان کو لائق اعتناء قرار دیا۔

بیسویں صدی عیسوی میں بلاشبہ بعض نام ایسے نظر آتے ہیں جنہوں نے باہر سے آکر اس سرزمین کو اپنا وطن بنا لیا تھا اور اُردو کے کاروان کو آگے بڑھانے میں سندھیوں کے دوش بدوش کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں افسر صدیقی، قاضی مجتبیٰ، الطاف حسین احقر، مولا بخش ہمدم وغیرہ شامل ہیں پھر تشکیل پاکستان کے بعد کچھ لوگ ایسے آئے جنہوں نے صحیح معنیٰ میں فرزندانِ سندھ ہونے کا کردار ادا کیا۔ ان لوگوں کی تعداد معتدبہ ہے اور ہر ایک نے اُردو کے ساتھ سندھی ادب کی خدمت بھی کی ہے جن میں اختر انصاری اکبرآبادی، الیاس عشقی، آذر نایاب بدایونی، آفاق صدیقی وغیرہم سرفہرست ہیں۔

چاہیئے تو یہ تھا کہ ارتقائے اُردو کے تذکرے میں ان سب کو زیر بحث لایا جاتا لیکن صفحات کی تنگ دامانی اس کی اجازت نہیں دیتی اور اسی لیے ان ادیبوں اور شعراء کو بھی نظر انداز کر دیا گیا ہے جنہوں نے اُردو کی درجنوں تخلیات کو سندھی نثر یا منظومات کا جامہ پہنایا اور ان لوگوں کو بھی چھوڑ دیا گیا ہے جن کا کام ابھی ابتدائی منزلوں میں ہے حالانکہ حقیقتاً یہ سب اُردو کے معمار ہیں اور ہماری زبان کا مستقبل ان سے وابستہ

ہے مگر بمجبوری انہیں کل کے تذکرہ نگاروں کے حوالے کر کے آج صرف ان اکابر کے نام لیے جا رہے ہیں جو ڈاکٹر محمد ابراہیم خلیل، شیخ عبدالرزاق راز، لطف اللہ بدوی، رشید احمد لاشاری اور اسی طرح کے دوسرے حضرات کی تعریف میں آتے ہیں۔

سندھ میں اردو کا روشن ماضی بہر طور یہ ثابت کر چکا ہے کہ سندھی اہل زبان کی اکثریت سندھی کے ساتھ اردو میں طبع آزمائی بھی کرتی رہی اور خامہ فرسائی بھی۔ کسی نے اگر اور کچھ نہیں کیا تو سیاسی سطح پر مولانا اللہ بخش ابوجھو اور شیخ عبدالمجید سندھی کی طرح تقاریر کے دریا ہی بہا دئے۔ یہی صورت حال کی بھی ہے۔ قائدِ عوام ذوالفقار علی بھٹو سے لے کر قاضی اکبر تک کتنے ہی افراد ہیں جو اردو میں اظہار خیال فرماتے ہیں، اور شاعروں اور ادیبوں کا کہنا کیا، ان میں تو شاید ہی کوئی ایسا ہو جو اردو میں کہتا یا لکھتا نہ ہو اور اگر اس اندازے کو مبالغہ قرار دیا جائے تو نصف سے زائد سندھی شاعر اور ادیب اردو کے شاعر اور نثر نگار ضرور ہیں۔ ان سب کی تخلیقات اگر تذکرے میں آجائیں تو اختصار کے باوجود ایک علیحدہ دفتر درکار ہو گا لیکن انتخاب شعراء میں احتیاط اور اختصار دونوں باتوں کو مدِ نظر رکھا گیا ہے پھر بھی جن شعراء کو بلحاظ سن ولادت شامل تذکرہ کیا گیا ہے۔ وہ بہر طور سندھ کی اردو بساط شاعری کی نمائندگی کرتے ہیں۔

اس میں منظوم تراجم کا اضافہ وقت کی ایک ضرورت ہے اور وہ صحیح معنی میں اردو کے ادبی خزانہ کا ایک ... ہیں۔

مولانا حبیب اللہ حبیب

آپ کا سن ولادت ۱۸۹۱ء ہے۔ شہداد کوٹ کے مستقل ساکن ہیں۔ کئی زبانوں میں شعر کہتے ہیں اور مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

کہتے ہیں کیمیا نہیں ملتا	پھونک دو گھر تو کیا نہیں ملتا
آج غفلت ہے کل پشیمانی	وقت گزرا ہوا نہیں ملتا

وہ دیں دشنام یا انعام بخشیں | مری امید لا حاصل نہیں ہے
حقوق عام سب ہونے ہیں باطل | ستم کا کوئی مستحق باطل نہیں ہے
حبیب اک اصطلاحی مولوی ہے | ولیکن مولوی فاضل نہیں ہے [۱]

سردار گل محمد خاں زیب

آپ ۱۳۰۱ھ میں بمقام جبل مگسی پیدا ہوئے۔ آپ کے والد اور ان کے بعد خود آپ مگسی بلوچ قبیلے کے سردار ہوئے پھر شہداد کوٹ میں مستقل سکونت اختیار کر لی ۱۳۷۲ھ مطابق ۱۹۵۳ء وفات پائی۔

آپ ایک عالم و فاضل آدمی تھے اور کئی زبانوں کے شاعر تھے۔ اردو میں آپ کا غیر مطبوعہ قلمی دیوان موجود ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

تضمین بر غزل سیماب اکبر آبادی

اگر یہی حال ہے تو مشکل ہے پر ہو تسکیں سے جام اس کا
نہیں ہے جب دل میں موج کوئی اثر کرے کیا کلام اس کا
نہ عام سے خوش ہے خاص اس کا نہ خاص سے کم ہے عام اس کا
ابھی احساس ہے خام اس کا شعور ہے ناتمام اس کا
یہ حال ہے کچھ مرے وطن کا نہ جاگتا ہے نہ خواب میں ہے [۲]

شاہ غلام رسول

شاہ غلام رسول، حافظ شاہ علم الدین قادری کے صاحبزادے تھے، ۱۳۰۶ھ میں کراچی میں پیدا ہوئے اور والد ماجد کے مدرسہ العلمیہ قادریہ متصل مسجد قصابان صدر کراچی

---

[۱] بحوالہ خط مولانا عبداللہ اثر مورخہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۶۲ء

[۲] بحوالہ خط مولانا عبداللہ اثر مورخہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۶۲ء

میں تعلیم حاصل کی۔آپ کا ماحول درویشانہ اور متصوفانہ تھا۔لہٰذا سائیں عبد الغنی کے ہاتھ پر بیعت کی اور رشد و ہدایت میں مصروف ہو گئے۔

آپ ایک شعلہ بیان مقرر تھے اور بلادِ ہند، عرب و عراق کا دورہ کرتے رہتے تھے، عربی، فارسی اور اردو پر قدرت رکھتے تھے اور فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے نمونہ کلام حسب ذیل ہے۔

الٰہی تو رحمت کا اظہار کر دے | نگاہ کرم ہم پہ اک بار کر دے
بری عادتوں سے بچالے ہمیں تو | نکو سیرت و نیک کردار کر دے
نہ غافل تری یاد سے ہم ہوں یارب | ہمیں خواب غفلت سے بیدار کر دے

خیر اور خیرات کو ہرگز نہ چھوڑ | خیر ہے ساری عبادت کا نچوڑ [سه]

سید عمر شاہ سیّار

سیّار ۱۸۸۹ء میں بمقام کوٹری پیدا ہوئے۔ والد ماجد کا نام حکیم دین محمد شاہ تھا تعلیم حیدرآباد میں مکمل کی اور محکمہ زراعت میں ملازم ہو گئے۔

ملازمت کے دوران آپ کو شاعری کا ذوق پیدا ہوا۔ سندھی کے اچھے شاعر ہیں۔ اردو میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں۔نمونۂ کلام پیش ہے۔

مقدر میں پڑے چکر تو قسمت سے نہ کچھ حاصل | مری تقدیر کا طائر اڑانا کس سے سیکھے ہو

شیشۂ دل شد شکستہ آرزو بھی اڑ گئی | ساحل مقصود سے سیّار اب معذور ہے [سله]

سه "صوفیائے سندھ اور اردو" پروفیسر محمد معین الدین دردائی صفحہ ۲۰۵ مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۶۳ء

سله "سندھ کے جدید اردو شعراء" از مشتاق علی جعفری صفحہ ۸۰ مطبوعہ ظہیر سنز حیدرآباد ۱۹۶۱ء

افقر سندھی

میر محمد چانڈیہ بلوچ المتخلص بہ افقر یکم ستمبر ۱۸۹۲ء کو بمقام ٹنڈو ولی محمد پیدا ہوئے پیشہ مدرسی رہا ہے۔ سندھی، اُردو اور فارسی میں خاصی دستگاہ رکھتے ہیں۔ سندھی اور اُردو دونوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اُردو کا مختصر نمونہ ملاحظہ ہو۔

سہ رازِ جلوہ آج طشت از بام ہونا چاہیئے — طور پر پھر نامہ و پیغام ہونا چاہیئے
آ رہی ہے جھومتی قبلے سے وہ کالی گھٹا — دور میں ساقی مئے گلفام ہونا چاہیئے

شوق منزل اپنے دل میں اس قدر پاتا ہوں میں — بے خبر ہوں راہ سے لیکن چلا جاتا ہوں میں
اس توقع پر، نشانِ منزلِ مقصد ملے — جادۂ ذوقِ طلب میں ٹھوکریں کھاتا ہوں میں[۵]

غلام علی مسرور

غلام علی مسرورؔ مولوی رحیم بخش کے بیٹے تھے۔ ۱۸۹۳ء میں بمقام شکارپور پیدا ہوئے مزاج بچپن ہی سے متصوفانہ تھا، مجالس سماع سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا لہٰذا اعلےٰ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ حصول معاش کے لیئے شکارپور ہی میں ملازمت کر لی اور شعر و شاعری میں لگ گئے۔ بیدلؔ سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔ سندھی کے اچھے شاعر تھے۔ ۱۹ اگست ۱۹۵۳ء میں وفات پائی۔ اُردو کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

سہ نہ اپنوں سے محبت ہے، نہ نفرت غیر سے اسکو — سبھوں کی ذاتِ حق دیکھے، یہی اس کا نظارا ہے
کہانی عشق والوں کی سمجھ سکتا ہے تو عاشق — سمجھ سکتا کہاں عاقل، اسے اس کا نہ یارا ہے
بتائی بات جو بیدلؔ محبت کی نیاری ہے — ہمیں مسرورؔ در داس کا سہارا ہے، پیارا ہے[۶]

---

۵ تذکرہ شعرائے اردو حیدرآباد صفحہ ۴۲ مطبوعہ بزم فروغ ادب حیدرآباد ۱۹۶۰ء

۶ "سندھ میں اُردو شاعری کا ارتقاء" از معراج نیر صفحہ ۱۶۳ مطبوعہ الحمرا اکیڈمی لاہور ۱۹۶۲ء

• بحوالہ مقالہ عبدالواحد خاں برائے ایم اے سندھی، سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۶۴ء

مولانا دین محمد ادیب

مولانا دین محمد ۲۲ مارچ ۱۸۹۷ء کو فیروز شاہ کے تعلقے میں میہڑ کے مقام پر پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت بہاء الدین زکریا سے ملتا ہے۔

ابتدائی تعلیم دستور کے مطابق گھر ہی پر حاصل کی، اعلیٰ تعلیم کے لیے مولانا الٰہی بخش کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ ادبی و شعری ذوق اوائل عمر ہی سے تھا۔ عملی زندگی میں اصلاح دین کی مساعی کے ساتھ ساتھ آپ نے ادب کے چراغ بھی روشن کئے۔ سندھی اور اردو دونوں میں لکھتے ہیں۔ نثر اور نظم دونوں کا ذوق ہے۔ تیس چالیس مذہبی اور علمی کتابوں کے مصنف ہیں۔ اردو کلام کا نمونہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔

یا رب کلام میرا حقیقت نما بنے	خاصوں کے سینے سے ملے نور نظر مجھے
دیدار کوئے دوست نصیب ادیبؔ ہو	ملنذ کر زیادہ شراب دربدر مجھے[1]

شیخ محمد ابراہیم خلیل

شیخ محمد ابراہیم ۱۹۰۰ء میں بمقام کراچی پیدا ہوئے۔ آپ نے بمبئی سے ڈاکٹری کی سند حاصل کرکے "ویانا" سے جلدی امراض میں امتیاز کی سند حاصل کی۔ کچھ دن کراچی میں رہے پھر مستقلاً حیدرآباد منتقل ہوگئے۔

ایک پیشہ ور ڈاکٹر اور ادبی مشاغل یکجی کی مشقت کے ساتھ مشق سخن کے مرادف ہیں مگر ڈاکٹر خلیل نے اپنی ذات سے اس کو سچ ثابت کر دیا۔ سندھی اور اردو کی ادبی سرگرمیاں انہیں کبھی فراموش نہیں کرسکتیں۔ آپ سندھی اور اردو دونوں زبانوں کے نثار بھی ہیں اور شاعر بھی۔ اردو کی کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور اس پایہ کے شاعر ہیں کہ نمونہ کلام میں اختصار پر بڑا جبر کرنا پڑ رہا ہے۔ ادیبوں کی ایک مجلس نے انہیں محقق الادب کے لقب سے نوازا ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

---

[1] "سندھ میں اردو شاعری کا ارتقاء" از معراج نیر صفحہ ۲۰۲ مطبوعہ المجرا اکیڈمی لاہور ۱۹۸۰ء

؎ سرور و کیف ہوتا، وجد ہوتا، بیخودی ہوتی
شراب عشق جس نے آپ کی آنکھوں سے پی ہوتی

؎ شب کو کچھ آنکھوں سے میری خون ٹپک کر رہ گیا
بادۂ گلگوں کا ساغر تھا، چھلک کر رہ گیا
یاد آیا وہ بت سفاک جب مجھ کو خلیلؔ
اشک حسرت میری آنکھوں سے ٹپک کر رہ گیا

؎ رعب جاناں تھا تجلی تھی کہ شوق دید تھا — طور پر موسیٰ کو کس نے محو حیراں کر دیا

؎ شب فراق میں ہم نے بھی آہ سوزاں سے — بجھا بجھا کے چراغ وفا جلائے ہیں

؎ کعبے گئے تو ذوق تجسس نے یہ کہا — منزل یہاں سے آگے ہے اک اور بھی ابھی[ش]

عبدالکریم گدائی

آپ جنوری ۱۹۰۱ء میں بمقام کریم آباد ضلع جیکب آباد پیدا ہوئے۔ میٹرک پاس کر کے عملی زندگی میں داخل ہو گئے۔ شروع شروع میں عشقیہ غزلیں کہتے تھے۔ اب آپ کا رجحان نظم کی طرف ہے۔ اقبال سے بہت متاثر ہیں۔ شاہ لطیف کی عوام دوستی، حب الوطنی اور جوش کی اشتراکیت کا پرتو بھی آپ کی شاعری میں پایا جاتا ہے ؎

ہمارے دل پہ کیا گزری بتائیں، راز داں! کیا کیا — خموشی ہے زباں سمجھو، کریں شرح بیاں کیا کیا

ش بحوالہ بیان ڈاکٹر خلیل

تذکرہ شعرائے اردو حیدرآباد صفحہ ۲، سندھ کے جدید اردو شعراء صفحہ ۶۲، سندھ میں اردو شاعری کا ارتقاء صفحہ ۲۰۷،

کبھی تو عرش والے! دیکھ لے اپنے خرابے کو
مرے دست و قلم تو کیں یہاں گلکاریاں کیا کیا

وبائیں، بھوک، رشوت، چور بازاری و بیکاری
ہمیں آزاد ہوتے ہی لگیں بیماریاں کیا کیا

امیر کارواں کچھ ملک و ملت پر رحم فرما
قیادت میں تری ہم نے اٹھائے ہیں زیاں کیا کیا

نظر آئیں کئی ویراں نگاہیں ان گنت لاشیں
پتہ دیتی رہی اٹھ اٹھ کے گرد کارواں کیا کیا ۹؎

عاجز ہالائی

اصلی نام محمد عیسیٰ ہے۔ آپ کی ولادت ۱۹۰۲ء میں سلیم راہو نامی گاؤں میں ہوئی (ہالا اور بھٹ شاہ کے درمیان)۔ ابتدائی تعلیم مکمل نہ ہونے کے باعث آپ کو شروع ہی سے محنت مزدوری کر کے گزر بسر کرنا پڑی لیکن شعر و شاعری سے فطری لگاؤ ہے۔ ۱۹۳۸ء سے سندھی اور اردو دونوں میں شعر کہہ رہے ہیں۔ اردو میں مہارت تامہ حاصل ہے۔ کلیات عاجز آپ کے شعری مجموعے کا نام ہے۔ نمونہ اشعار ملاحظہ ہو۔

میرزا دبیر کے ایک شعر پر تضمین

حاصل اگر کرم ہوا امام ہمام کا
حور وارم عطا ہو صلہ اس کلام کا

ہم سر مگر کلام ہو کس کا سلام کا
مسطور اگر کلام ہو سرد امام کا

مصرعہ ہمارا سرد ہو دار السلام کا ۱۰؎

عبداللہ خواب

عبداللہ خواب ۱۹ ر شوال ۱۲۲۱ھ کو بمقام حیدر آباد پیدا ہوئے۔ آپ کے

۹؎ "سندھ میں اردو شاعری کا ارتقاء" از معراج نیر صفحہ ۲۲ مطبوعہ الحمرا اکیڈمی لاہور ۱۹۶۲ء
بحوالہ خط نقش نایاب منگی بنام مصنفہ مورخہ ۲۲ ر اکتوبر ۱۹۷۶ء

۱۰؎ سندھی لیکھکن جی ڈائرکٹری صفحہ ۱۴۰ مطبوعہ سندھالوجی انسٹی ٹیوٹ حیدر آباد ۱۹۷۷ء۔ نمونہ کلام فراہم کردہ فاضل زیدی نواب شاہ

والد میاں علی بخش ایک محب رسول مسلمان تھے اور مقامی محافل نعت خوانی کی روح رواں تھے۔ اس ماحول نے عبداللہ خواب کے ذوق شعری کو بیدار کر دیا اور آپ سترہ سال کی عمر میں سندھی کے شاعر بن گئے۔ آپ کی شاعرانہ صلاحیت کو آگے بڑھانے میں ڈاکٹر شیخ محمد ابراہیم خلیل کا بڑا ہاتھ ہے۔

سندھی اور اُردو کی ادبی سرگرمیوں میں عبداللہ خواب کو ہمیشہ سے بڑا شغف رہا اور اسی شغف نے انہیں اُردو کا شاعر بنا دیا۔ اُردو کلام کا نمونہ قابل ملاحظہ ہے

رہبر قوم ہیں دلدادۂ عشرت اتنک ان کو موجوں کے تھپیڑوں سے شناسا کر دے
یا تو سیارۂ گردش کو مٹا دے یارب گردشوں میں مری، یا، اور اضافہ کر دے

پانی ہوا ہے غم سے لہو انتظار میں اب خون نام کو بھی نہیں جسم زار میں
ہر لمحہ انقلاب و تغیر کے باوجود آیا نہ فرق گردش لیل و نہار میں

خون سے سینچا گیا امت کا نخل آرزو کس قدر شاداب ہے صحن گلستان حسین[۱۱]

لطف اللہ بدوی

لطف اللہ بدوی ۱۲ رجولائی ۱۹۰۴ء کو شکارپور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام امام بخش خادم تھا۔ حصول تعلیم کے بعد آپ نے ایک اسکول میں ملازمت کی پھر گورنمنٹ کالج شکارپور میں لیکچرر ہو گئے۔ تشکیل پاکستان کے بعد اُردو کے کشتی استاد مقرر ہو گئے۔ ۱۹ ر نومبر ۱۹۶۸ء میں انتقال فرمایا۔

لطف اللہ بدوی کو بچپن ہی سے علم و ادب سے لگاؤ تھا۔ سندھی اور اُردو دونوں میں لکھتے تھے۔ پہلے جوگی تخلص کرتے تھے پھر تخلص ترک کر دیا اور پورا نام لکھنے لگے۔

---

[۱۱] "سندھ کے جدید اُردو شعراء" از مشتاق علی جعفری، صفحہ ۶۸، مطبوعہ ظہیر سنز حیدرآباد ۱۹۶۱ء
تذکرہ شعرائے اُردو حیدرآباد صفحہ ۱۸، مطبوعہ بزم فروغ ادب حیدرآباد ۱۹۷۰ء

تصانیف کی فہرست کافی طویل ہے۔ اُردو میں اقبال سے بہت متاثر تھے ان کی کئی منظومات سندھی میں منتقل کی ہیں اور سندھی شعراء کی بعض نظموں کا منظوم ترجمہ اُردو میں کیا ہے۔ طبعزاد اُردو کلام کا نمونہ پیش ہے۔

نظامِ جدید و کہن کا یہ جھگڑا — زمانے پہ لاتا رہا ہے تباہی
کبھی قیصریت جلاتی ہے یہ دنیا — تشدد کی اٹھتی ہے جس میں سیاہی
کبھی دوشِ مزدور پر ہے حکومت — تزلزل میں جس سے ہوئی کجکلاہی
کبھی رائے آمر سے مجبور ہو کر!
سپاہی کے قدموں میں ہے تاجِ شاہی

میرا وطن

جس کی زمیں میں زرفشاں — دریائے مہراں ہے رواں
جس کا تمدن اوّلیں سے — موئن جو داڑو کی زمیں
گہوارۂ تہذیب و فن
میرا پیارا ہے وطن

تارِ غم پر حرکتِ مضراب ہے میری غزل — درد کے عنوان کا اک باب ہے میری غزل[۱۱]

سائیں عبدالرشید

سائیں عبدالرشید سائیں عبدالغنی کے بیٹے تھے، ۱۹۰۷ء میں کراچی میں پیدا ہوئے اور گھریلو دینی تعلیم حاصل کرکے تجارت میں لگ گئے لیکن صوفیانہ ماحول کی پرورش نے انہیں کسی کام کے قابل نہ رکھا تھا لہٰذا اسکول میں پڑھانے لگے پھر والد کے بعد دھوبی گھاٹ

---

۱۱ بحوالہ خط غلام احمد بدوی بنام مصنف مورخہ ۱۴ ستمبر ۱۹۷۶ء

سندھ کے جدید اُردو شعراء صفحہ ۵۴، سندھ میں اُردو شاعری کا ارتقاء صفحہ ۱۹۴۔

کی خانقاہ کے سجادہ نشین ہو گئے۔

آپ کو اُردو نظم و نثر دونوں کا ذوق تھا۔ نعت کے دو شعر نمونے کے طور پر درج کئے جاتے ہیں۔

ے میں پلکوں سے در اقدس پہ جھاڑو دوں، یہ حسرت ہے
زہے قسمت غلامی کا شرف مل جائے، بہتر ہے
رشید قادری رکھا ہوا ہے کیا، یہاں پر اب!
مدینے میں پہنچ کر تو اگر مر جائے، بہتر ہے [۱۳]

سرشار عقیلی

فقیر اللہ بخش، سرشار عقیلی ۱۲ر جنوری ۱۹۰۷ء کو کراچی میں پیدا ہوئے، ۱۹۲۸ء میں بی اے آنرز کر کے محکمۂ ریونیو میں ملازمت کر لی اور ترقی کرتے کرتے ڈپٹی کمشنری کے عہدے تک پہنچ گئے۔

سرشار کو بچپن ہی سے ادبی ذوق تھا، مضامین لکھا کرتے تھے۔ سندھی کے ساتھ اُردو سے بھی دلچسپی تھی۔ عملی زندگی میں آکر بھی آپ نے اپنے کو دونوں زبانوں سے وابستہ رکھا اور آج آپ کا شمار سندھی اور اُردو کے نثر نگاروں میں بھی ہے اور شاعروں میں بھی۔ اُردو شاعری کا نمونہ پیش ہے۔

ے یہ اپنا آشنا ہے یا کوئی بیگانہ جاتا ہے ۔۔۔ کہ جو اس طور با صد غمزۂ جانانہ جاتا ہے
چھلکتا ہے ابھی پیمانۂ صبر و شکیبائی ۔۔۔ ہمارے ہاتھ سے اب تو دلِ دیوانہ جاتا ہے

ے وہ جس کا قدم ہے فاتحانہ ۔۔۔ وہ جس کا علم ہے خسروانہ
ہے جس کا وجود جاودانہ ۔۔۔ آفاق کا شاعر یگانہ

---

[۱۳] "صوفیائے سندھ اور اُردو" از پروفیسر معین الدین دردائی صفحہ ۳۶ مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۶۳ء

جو آپ ہی اپنا ترجمان ہے
وہ شاعر عہد نو کہاں ہے ؁[14]

سرور علی

سرور علی ۱۸ مارچ ۱۹۰۹ء کو کراچی میں پیدا ہوئے، ڈی جے کالج سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ذریعہ معاش ٹھیکیداری تھا لیکن اُردو نظم و نثر دونوں پر قدرت رکھتے تھے۔ ادبی مشغلوں میں بڑے سرگرم تھے۔ سندھ کے مایہ ناز ادیب و شاعر تھے۔ اُردو غزل میں بھی ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔ ۲۷ فروری ۱۹۶۹ء کو حیدرآباد میں انتقال فرمایا۔ نمونہ درج ذیل ہے۔

؎ موت کا انتظار کون کرے غم کی چالوں سے ٹل نہ جائے کہیں
ان کے آنے سے بزم میں سرور رسم دنیا بدل نہ جائے کہیں

؎ نمودِ صبح سے اختر شماری ختم ہوتی ہے چراغ آرزو بجھتے رہے ہیں شادمانی سے
یہاں کی خلد سامانی بھی تصویر جہنم ہے پریشاں ہوگیا ہوں میں فریب زندگانی سے

؎ ستاروں کو ضیا بخشی ہے ہم نے نور عرفاں سے
ضیائے حسن عالم کے ازل سے راز داں ہم تھے

؎ ہم اگر شکوہ بھی کرتے ہیں تو رہتے ہیں خموش
خامشی عشق میں بدنام ہوئی جاتی ہے ؁[15]

شیخ عبداللہ عبد

شیخ عبداللہ ۱۹۱۱ء میں بمقام کراچی پیدا ہوئے۔ نصابی تعلیم بی اے بی ٹی تک

؁[14] "سندھ میں اُردو شاعری کا ارتقاء" از معراج نیر صفحہ ۲۲۲ مطبوعہ الحمرا اکیڈمی لاہور ۱۹۶۳ء
"سندھ کے جدید اُردو شعراء" از مشتاق علی جعفری صفحہ ۶۰ مطبوعہ ظہیر سنز حیدرآباد ۱۹۶۱ء

؁[15] "سندھ کے جدید اُردو شعراء" از مشتاق علی جعفری صفحہ ۸۰ مطبوعہ ظہیر سنز حیدرآباد ۱۹۶۱ء
"سندھ میں اُردو شاعری کا ارتقاء" از معراج نیر صفحہ ۲۲۰ مطبوعہ الحمرا اکیڈمی لاہور ۱۹۶۳ء

حاصل کی۔ ۲۲ نومبر ۱۹۶۳ء کو انتقال فرمایا۔ محکمۂ تعلیم سے وابستہ تھے۔ سندھی، فارسی، انگریزی اور اُردو ہر زبان پر عبور رکھتے تھے اور سندھی اور اُردو دونوں کے اچھے شاعر تھے۔ اُردو کلام کا نمونہ درج ذیل ہے۔

وہ فتنہ خیز ترا عالمِ شباب ہوا | کہ خلق مٹ گئی، سارا جہاں خراب ہوا
وہ بدنصیب دلِ خانماں خراب ہوا | کبھی نہ تیری محبت میں کامیاب ہوا
پسند عبدؔ کو کیونکر نہ خاکساری ہو | وہ صدق دل سے غلام ابوتراب ہوا

مزہ ہے آج سرِ میکدہ قدح تو ارو | جناب شیخ کی پگڑی اچھالتے جاؤ
فلک پہ کالی گھٹا جھوم جھوم کر اے عبدؔ | یہ کہہ رہی ہے کہ ساغر کھنگالتے جاؤ[1]

ڈاکٹر آصف جاہ کاروانی

آصف جاہ کاروانی ۵ جون ۱۹۱۸ء کو ڈگری (تھرپارکر) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم میرپور خاص اور کراچی میں حاصل کی، ۱۹۵۶ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ ملازمت کا آغاز آپ نے ڈی جے کالج سے کیا، آجکل محکمۂ تعلیمات سے وابستہ ہیں اور ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔

ڈاکٹر کاروانی کو اُردو سے بنیادی لگاؤ ہے۔ اس کی تحریکوں میں آپ ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ ایک عرصے تک انجمن ترقی اُردو کے اعزازی معتمد کے فرائض انجام دیتے ہیں اُردو نظم و نثر دونوں پر قدرت رکھتے ہیں۔ نظم کا نمونہ قابلِ ملاحظہ ہے۔

ترے سر کی قسم ساقی، نہیں کچھ ایک بھی مجھ میں | بتا تو کچھ کہ کیسے آ بسا میخانہ دل میں
اٹھا رکھی نہ تھی کوئی کسر اربابِ ہمت نے | چھڑک کر تیل دیدیں آگ اس تمنا خانۂ دل میں
جوں ہی سرچشمۂ مستی نے رُخ پلٹا مری جانب | خزاں بھاگی، بہار آئی مرے ویرانۂ دل میں

---

[1] مثنوی ولکدومان از پروفیسر ایاز قادری مطبوعہ رشید اینڈ سنز کراچی ۱۹۶۳ء

سندھی لیکسکن جی ڈائرکٹری صفحہ ۱۳۰ مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ آف سندھیالوجی حیدرآباد ۱۹۶۴ء

"سندھ میں اُردو شاعری کا ارتقاء" از معراج نیر صفحہ ۱ مطبوعہ الحمرا اکیڈمی لاہور ۱۹۶۳ء

؎ امتیاز کفر و ایماں کا ہوا جب سے شعور
خار بن کر چشم مومن میں چبھا جاتا ہوں میں

آشنا جب سے ہوا دل راز ہست و بود سے
خیر خواہوں کی نگاہوں سے گرا جاتا ہوں میں

؎ مرحبا اے شوق گریہ، مرحبا اے چشم تر
دھو ہی ڈالا تم نے مل کر دل سے داغ زندگی[۱۱]

محمد زمان طالب المولیٰ

مخدوم محمد زمان، سندھ کے شہرہ آفاق بزرگ مخدوم نوح کی اولاد میں ہیں ۷ر اکتوبر ۱۹۱۹ء مطابق ۹ر محرم ۱۳۳۸ھ کو پیدا ہوئے۔ آپ نے قدیم علوم کے ساتھ انگریزی کی تعلیم بھی حاصل کی اور ۱۹۴۵ء میں اپنے پدر محترم مخدوم غلام محمد کے وصال پر درگاہ ہالہ شریف کے سجادہ نشین ہوئے۔ موسیقی سے آپ کو فطری لگاؤ اور ادب سے موروثی تعلق ہے۔ ابتدا میں "بیوس" تخلص کرتے تھے پھر فراقی، زمان شاہ اور طالب اور اب طالب المولیٰ کے نام سے لکھتے ہیں۔

سندھ کی بیشتر ادبی انجمنیں اور رسائل آپ کے رہین منت ہیں۔ سندھی کی کئی کتابوں کے مصنف اور کئی کے مترجم ہیں۔ سندھی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں اور دونوں میں شعر کہتے ہیں۔ مجموعۂ کلام کا نام کچکول ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

؎ خوف مرنے کا نہیں پھر موت سے گھبرائیں کیوں
جسم سے دم کے نکل جانے سے مرجائیں گے کیا!

میں نے اپنے آپ کو ہے آپ کا طالب کہا
غیر سے مطلب نہیں، ہم غیر بن جائیں گے کیا!

؎ جن کو تو پا نہ سکا شمع حرم میں اے شیخ
ایسے انوار نظر آتے ہیں بت خانے میں

؎ بے تعلق نہ رہو، مجھ سے عداوت ہی سہی
لطف و راحت نہ سہی دوست، تو نفرت ہی سہی

؎ خواب میں آیا تھا بس وہ رخ دکھانے کے لیے
میری سوتی حسرتوں کو پھر جگانے کے لیے[۱۲]

---

[۱۱] "سندھ میں اردو شاعری کا ارتقا" از معراج نیر صفحہ ۲۲۲ مطبوعہ الحمرا اکیڈمی لاہور ۱۹۶۲ء
سندھ کے جدید اردو شعرا از مشتاق علی جعفری صفحہ ۱۰۳ مطبوعہ ظہیر سنز حیدرآباد ۱۹۶۱ء

[۱۲] "سندھ میں اردو شاعری کا ارتقا" از معراج نیر صفحہ ۲۱۳، مطبوعہ الحمرا اکیڈمی لاہور ۱۹۶۲ء
"سندھ کے جدید اردو شعرا" از مشتاق علی جعفری صفحہ ۹۶، مطبوعہ ظہیر سنز حیدرآباد ۱۹۶۱ء

عبدالرزاق راز

شیخ عبدالرزاق جنوری ۱۹۱۹ء میں بمقام سکھر پیدا ہوئے۔ گھریلو ماحول ادبی تھا لہذا تاریخ اسلام میں ایم۔اے کر کے کچھ دنوں کے لیے روزنامہ الوحید کی ادارت سنبھال لی پھر سندھی ادب میں ایم۔اے کر کے سکھر اسلامیہ کالج میں سندھی کے لیکچرر ہو گئے۔ اسی کے ساتھ ساتھ سکھر کی ہر ادبی تحریک کے روح رواں بھی رہے۔

شیخ راز کو زمانہ طالب علمی ہی سے ادب کا ذوق تھا جس نے عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ ترقی کی اور آپ سندھی، اردو، انگریزی ہر سہ زبان کے مصنف بن گئے۔ سندھی کی نظم و نثر اور تنقید میں آپ کی تصانیف کا ایک مستقل مقام ہے اسی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی آپ کے مضامین کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔

سندھی کے بعض شہ پاروں کو آپ نے اردو نظم کا قالب عطا کیا ہے۔ طبع زاد شاعری میں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ آپ کا شعری مجموعہ دھڑکنیں ۱۹۶۸ء میں شائع ہو چکا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

گلستانِ تمنا کی سیہ بختی کو کیا کیجئے !	نظر آئے زمانے میں ہمیں ہر سمت ویرانے
چلی جب شمع محفل تو بجھانے تشنگی دل کی	کفن بر دوش، جاں بر کف چلے آئے ہیں پروانے

اس سفینے کی بات کیا کہئے	ناخدا نے جسے ڈبویا ہے
جام جم میں ہو جیسے عکس حیات	درد آنکھوں میں یوں سمویا ہے
ہوتا ہے دل پہ کیسے پریشاں پریشاں کبھی	اے زلف یار تیرے پہ احساں کبھی کبھی
ہر اشک غم متاع دل زار ہے کبھی	بنتا ہے میرے درد کا درماں کبھی کبھی
جھک جائیں ہزاروں تو کوئی بات نہیں ہے۔	یہ رند بلانوش تو سر خم نہیں کرتے [۱]

[۱] سندھ میں اردو شاعری کا ارتقاء از معراج نیر صفحہ ۲۱۰ مطبوعہ الحمرا اکیڈمی لاہور ۱۹۷۲ء
خط شیخ عبدالرزاق راز مورخہ ۲۸ اگست ۱۹۷۶ء

مظفر حسین جوشؔ

مظفر حسین جوشؔ آفندی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ ۲۲ر دسمبر ۱۹۱۹ء کو خیرپور میں پیدا ہوئے۔ پہلی ملازمت شاہی بحریہ میں کی۔ وہاں سے ریٹائر ہوئے تو ریڈیو پاکستان حیدرآباد سے وابستہ ہو گئے۔ سندھی کے ادیب ہیں، کبھی کبھی اُردو میں بھی کہتے ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

~ دل بنا، دیر بنا، کعبہ و بتخانہ بنے | کتنے مرکز ترے اے جلوۂ جانانہ بنے
راز رہتی مری ہستی تو بہت اچھا تھا | خیر اب بن گئی افسانہ تو افسانہ بنے

~ دل حزیں سے مجھے بے نیاز رہنے دے | یونہی مٹا ہوا ہستی کا راز رہنے دے
نشیب عشق کے سمجھا نہ تو فراز مجھے | جفائے حسن کو سرگرم راز رہنے دے[۲۰]

عطا محمد حامیؔ

عطا محمد یکم جنوری ۱۹۱۹ء کو کوٹ ڈیجی میں پیدا ہوئے۔ سندھ یونیورسٹی سے ایم اے کیا پھر ملکی سیاست میں حصہ لیتے رہے۔ آخر کار ان کا علمی ذوق انہیں تعلیمات کی طرف کھینچ لایا۔ آپ سندھی کے نامور شاعر ہیں اردو میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں اور اس سے ایک لگاؤ رکھتے ہیں۔ نمونہ کلام پیش ہے۔

~ میں ادیب و عالم و فاضل نہیں، کامل نہیں
ایک بھی ایسی سند ابتک مجھے حاصل نہیں
ابن اُردو بھی نہیں، بابائے اُردو بھی نہیں
ایک سندھی ہوں مگر اُردو سے بھی جاہل نہیں

۲۰؎ "سندھ میں اُردو شاعری کا ارتقاء" از معراج نیر صفحہ ۱۹۹ مطبوعہ الحمرا اکیڈمی لاہور سنہ ۱۹۶۲ء
"سندھ کے جدید اُردو شعراء" از مشتاق علی جعفری صفحہ ۷۰ مطبوعہ ظہیر سنز حیدرآباد سنہ ۱۹۶۱ء

؎ توقع ہی نہ تھی یہ حضرت آدم کے بیٹے سے
کہ انساں ہو کے انساں سے رکھے گا دشمنی اپنی
اگر ہم گلشن ہستی میں جب غفلت سے چلتے ہیں
شگفتہ ہو کے ہر غنچہ اڑاتا ہے ہنسی اپنی[۲۱]

مولانا عبداللہ اثر

آپ گوٹھ بیڑو چانڈیو میں بتاریخ ۱۴ ر جولائی ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے۔ ایم اے کر کے محکمہ تعلیم سے وابستہ ہو گئے اور ایجوکیشن آفیسر کے عہدے تک پہنچے۔ سندھی کے مستند شاعر ہیں، اردو میں بھی شاعرانہ حیثیت مسلم ہے بلکہ اشعار سے استادانہ رنگ جھلکتا ہے، چند شعر ملاحظہ ہوں۔

؎ میں ساحل سے تماشا دیکھتا تھا بحر ہستی کا
مری تقدیر مجھ کو کھینچ کر گرداب تک لائی
اسے نیرنگی قسمت کہوں یا شان محبوبی
مری وحشت ہی مجھ کو عشق کے آداب تک لائی
اثر کیا واسطہ رنگینی کیف بہاراں سے
مجھے تو بے خودی ہی محفل احباب تک لائی

؎ تبسم لب پہ ہے آنکھوں میں آنسو
سلیقہ پوچھئے مجھ سے فغاں کا

؎ جسکو کاٹا ہے بے ستوں کی طرح
ایک ایسا بھی دن گزارا ہے
پلکوں پلکوں کا فرق ہے ورنہ
ہے وہ آنسو وہی ستارا ہے[۲۲]

فیض بخشاپوری

پورا نام فیض اللہ خاں ہے۔ آپ ۱۹۲۲ء میں بمقام بخشاپور جیکب آباد پیدا ہوئے کئی زبانوں کے ماہر ہیں۔ اردو پر سندھی ہی کی طرح دسترس حاصل ہے۔ سندھی اور

---

[۲۱] "سندھ میں اردو شاعری کا ارتقاء" از معراج نیر صفحہ ۱۰۳ مطبوعہ الحمرا اکیڈمی لاہور ۱۹۷۲ء
"سندھ کے جدید اردو شعراء" از مشتاق علی جعفری صفحہ ۶۰ مطبوعہ ظہیر سنز حیدرآباد ۱۹۶۱ء
[۲۲] خط مولانا عبداللہ اثر مورخہ ۱۳ ر ستمبر ۱۹۷۶ء

اُردو شاعری میں آپ کی استادانہ حیثیت یکساں طور پر مسلم ہے۔ آپ کے کلام کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ چند شعر تبرک کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔

ے دے داد ہستی مستاں کر اے ندیم — ہوتا ہے چاک دامن یزداں کبھی کبھی

دیار عشق کا پروردگار ہوں واعظ — ہزاروں قیس مری گرد کارواں سے اٹھے

مئے خانہ کا میخانہ کیا فیضؔ نے خالی — اس رند خرابات کی کیا بات ہے ساقی

میں ہوں، درِ میخانہ ہے اور جام ہے ساقی — گردش میں ابھی گردش ایام ہے ساقی
صد گونہ ادب، فیضؔ خرابات نشیں کا — اس دور کا یہ حافظ و خیام ہے ساقی

رشید احمد لاشاری

رشید احمد ۱۶ مئی ۱۹۲۲ء میں بمقام گوٹھ ملگزار پیدا ہوئے۔ آپ زرک خاں زیرک کے بیٹے تھے۔ شعرو ادب ورثے میں پایا تھا لہذا تعلیم سے فراغت پاتے ہی سندھی اور اُردو میں رشید احمد لاشاری بن گئے۔ دونوں زبانوں میں آپ کا ایک مستقل مقام ہے۔ شاہ کے کلام کے ترجمے میں آپ نے بڑی قابلیت کے جوہر دکھائے ہیں۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۷۰ء کو انتقال فرمایا۔ اُردو کے کہنہ مشق شاعر تھے اور قادر الکلام نثر نگار تھے۔ ایک نظم کا اقتباس پیش ہے جس کا عنوان ہی اُردو سے متعلق ہے۔

ے یہ وہ اُردو ہے جو اہل عرب سے سندھ میں آئی — بڑھی ملتان میں اور پرورش لاہور میں پائی
اسے تقدیر دلی سے اٹھا کر لکھنؤ لائی — غرض مشرق سے مغرب تک ہوئے سب اسکے شیدائی

یہی تو شان اُردو ہے کہ اسکو سب سے الفت ہے
نہ پنجابی کی دشمن ہے، نہ سندھی سے عداوت ہے

۲۲۔ خط مولانا فیض بخشاپوری مورخہ ۱۹ ستمبر ۱۹۷۶ء

بہت سندھی بھی اُردو کو کلیجے سے لگاتے ہیں　　اسے پڑھتے ہیں لکھتے ہیں، اسی میں گنگناتے ہیں
جہاں ہو محفلِ اُردو وہاں کھنچ کھنچ کے جاتے ہیں　　وہ اربابِ سخن کو اپنی آنکھوں پر بٹھاتے ہیں
مگر بعضوں کو سندھی بغض کو اُردو سے نفرت ہے
کہاں کی یہ صداقت ہے، کہاں کی یہ مروّت ہے　　[۲۴]

شیخ ایاز

پورا نام شیخ مبارک، ایاز تخلص ہے، ۲۳ر مارچ ۱۹۲۲ء میں بمقام شکار پور پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم شکارپور ہی میں حاصل کی، ۱۹۴۳ء میں کراچی کالج میں داخلہ لیا اور کراچی ہی میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔

شیخ ایاز کی شاعرانہ زندگی سن شعور پر پہنچنے کے ساتھ ساتھ شروع ہوگئی تھی طبیعت میں جدت پسندی اور خیالات میں ندرت تھی لہٰذا آپ نے ابتدا ہی سے پرانی ڈگر کو چھوڑ کر اپنا علیحدہ راستہ بنایا، بیک وقت سندھی اور اُردو دونوں میں طبع آزمائی کرتے رہے اور ساتھ ہی ساتھ نثر بھی لکھتے رہے۔

سندھی میں شیخ ایاز کا نام زندگی ہی میں زندۂ جاوید ہوگیا ہے، اُردو میں آپ کا شمار صفِ اوّل کے ان شعرا میں ہے جن کا اپنا شاعرانہ مزاج ہے اور جن کے شعر بڑے سے بڑے ذخیرہ الفاظ میں "ایازیت" کے امتیاز سے پہچانے جا سکتے ہیں۔ آپ کے دو شعری مجموعے بوئے گل نالۂ دل اور رسالے کا اُردو ترجمہ شائع ہو چکے ہیں، بنمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

سہ
مری روح کی راگنی سن رہے ہو
پرانی سی نئے ہے پرانے سے نغمے
پرانی سی مئے ہے پرانے سے شیشے
جنھیں میں چرا لایا ہوں ساقیانِ ازل سے

---

[۲۴] "سندھ کے جدید اُردو شعراء" از مشتاق علی جعفری صفحہ ۳، مطبوعہ ظہیر سنز حیدرآباد ۱۹۶۱ء
"سندھ میں اُردو شاعری کا ارتقاء" از معراج نیر صفحہ ۲۳، مطبوعہ الحرا اکیڈمی لاہور ۱۹۷۳ء

ے بڑی جستجو کی ہے عمرِ رواں نے — ارے لامکاں کے مکیں تو کہاں ہے
بغاوت تو کر لی ہے دیر و حرم سے — جھکاؤں کہاں اب جبیں تو کہاں ہے

ے اے نگارِ حیات آ بھی جا — اے مری کائنات آ بھی جا
سنگِ مرمر، چاندنی کا عکس — جیسے تیرا شباب، آ بھی جا
پابجولاں ہے عمرِ رخش رواں — تو بھی اب ہم رکاب، آ بھی جا

ے الجھنے لگیں مشعلیں آندھیوں سے
سلجھنے لگی کاکلِ شب رفیقو
مگر جب رفیقو!
سحر سو گئی زندگی سو گئی

ے عزمِ خیبر شکن، آہنی جان و تن
بستر خواب میں موم سے ہو گئے
مشعلیں بجھ گئیں پاسباں سو گئے
اور نوعِ بشر کو یقیں ہو گیا
کہ نورِ سحر تا ابد لوٹنی درخشاں رہے گا
مگر یہ تو دستور روزِ ازل ہے
شب و روز اک دوسرے کا تعاقب کریں گے
رفیقو! انی مشعلیں ڈھونڈ کے لاؤ
شب تیرہ و تار ہو نے زمیں چیر کے افشاں ہوگی ہے [۲۶]

محمد علم الدین علمی قادری

محمد علم الدین، حافظ شاہ غلام رسول کے صاحبزادے ہیں ۱۹۲۳ء میں اپنے آبائی

---

[۲۵] سندھ کے جدید اردو شعراء، از مشتاق علی جعفری ص ۳۰۹ مطبوعہ شمیر پریس حیدرآباد ۱۹۲۱ء

"سندھ میں اردو شاعری کا ارتقاء" از معراج نیر صفحہ ۲۰۰ مجلس ادب مجرا اکیڈمی لاہور ۱۹۷۶ء

مضمون "شیخ ایاز" از شیخ عبدالرزاق راز مشمولہ سندھی ادب نمبر تحریری حیدرآباد فروری ۱۹۶۳ء

مکان کراچی میں پیدا ہوئے۔ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی سے بھی واقف ہیں۔
آپ کے پدر عالیمقام نے سولجر بازار کراچی میں مدرسہ علیمیہ قادریہ قائم کیا تھا آپ اُسی
کو چلا رہے ہیں۔

آپ کو اُردو نظم و نثر دونوں سے شغف ہے، بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں مثنوی
مولانا روم کے بعض حصّوں کا منظوم ترجمہ فرمایا ہے۔ نظم کے دو شعر پیش ہیں۔

~ غوث اعظم کی سیرت پہ لاکھوں سلام　　　قطب عالم کی شہرت پہ لاکھوں سلام
انس و جن و ملک کے بھی وہ پیر ہیں　　　ان کی شان امامت پہ لاکھوں سلام ۲۶

میرزا عباس علی بیگ

آپ مرزایان سندھ کے علمی گھرانے میں بمقام ٹنڈو آغا ۱۹۲۴ء میں پیدا ہوئے
خاندانی ماحول علمی تھا لہٰذا ہوش سنبھالتے ہی سندھی اور اُردو دونوں میں شعر کہنے لگے۔
نصابی تعلیم میٹرک سے زائد حاصل نہ کر سکے پھر بھی آپ کو دونوں زبانوں پر عبور حاصل
ہے۔ آپ کا خاندان مرثیہ گو مشہور ہے۔ آپ بھی اُردو اور سندھی دونوں زبانوں میں
مرثیے کہتے ہیں۔ اُردو شاعری کے نمونے میں ایک نظم کے دو شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

~ سندھ میں آباد ہیں حیدر کے مستانے بہت
آج خود موجود ہیں یاں سب حسینی جاں نثار
ہے دعا اللہ سے یہ مشتری کی بار بار
تا ابد رکھے علی آباد کو پروردگار ۲۷

(ٹنڈو آغا)

---

۲۶ "صوفیائے سندھ اور اُردو" از پروفیسر معین الدین دردائی صفحہ ۲۶۰ مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۷۳ء

۲۷ سندھی لیکھکن جی ڈائرکٹری صفحہ ۱۲۹ مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ آف سندھیالوجی حیدرآباد ۱۹۷۷ء
نمونہ کلام اور دیگر حالات ٹنڈو آغا کے ایک بزرگ کے ذریعہ مصنف سے حاصل کئے گئے۔

لطف علی شاہ منظور نقوی

لطف علی شاہ ۱۸ مئی ۱۹۲۴ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ حضرت جہانیاں جہاں گشت کی اولاد میں ہیں۔ ذوقِ شعری شاید گھٹی میں پڑا ہوا تھا تب ہی گیارہ سال کی عمر میں پہلا سندھی شعر نظم کیا۔ ادبی سرگرمیوں میں شروع ہی سے پیش پیش رہتے ہیں۔ حیدر آباد کی کئی انجمنوں کے رکن ہیں۔ سندھی، فارسی اور اردو کے ماہر ہیں۔ سندھی کی کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ اردو غزل گوئی کا بھی شوق ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

؎ رات کٹ جائے گی، سُن لو مجھ سے میرا حالِ دل
قصہ گو ایسے کہاں پھر ایسے افسانے کہاں

اب مرے بجھتے ہوئے دل میں کوئی ارماں نہیں
یہ چراغِ صبح ہے پھر اس پہ پروانے کہاں

؎ جلایا برق نے تنکوں کو، ناصبوری کی
ذرا سی دیر تھی، ہم آشیاں بنا لیتے

تھی سخت دل ہی سے الفت اگر تجھے منظورؔ
کسی مزار کے پتھر سے دل لگا لیتے

؎ سایوں سے مخاطب ہوتے ہیں، زنجیروں سے باتیں کرتے ہیں
زنداں کی فضاؤں میں رہ کر دیوانے بھی کیا ہو جاتے ہیں

؎ جدائی کی قسم، شب بھر نہ وہ ڈوبے نہ ہم سوئے
ستارے گوش بر آواز تھے، افسانہ خواں ہم تھے

؎ الفت کے زمانے میں اکثر سجدے بھی روا ہو جاتے ہیں
اعجازِ محبت کیا کہئے، بندے بھی خدا ہو جاتے ہیں [۲۸]

---

[۲۸] "سندھ کے جدید اردو شعراء" از مشتاق علی جعفری صفحہ ۱۰۷ مطبوعہ ظہیر سنز حیدر آباد ۱۹۶۱ء
"سندھ میں اردو شاعری کا ارتقاء" از معراج نیر صفحہ ۲۲۵ مطبوعہ الحمرا اکیڈمی لاہور ۱۹۶۲ء

مولانا محمد یوسف عزیز

آپ سنہ ۱۹۲۶ء میں تعلقہ شہداد کوٹ میں پیدا ہوئے۔ شعر کہنے کا شوق بچپن ہی سے "کریما" پڑھنے کے بعد پیدا ہوا۔ اس وقت سے مسلسل طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

ے زندگی ظلم بھی ہے، عدل کی تصویر بھی ہے — شمر کا ہاتھ بھی ہے، گردن شبیر بھی ہے

ے تیرا قائد ہو حسین ابن علی یا ہو یزید — منتخب کر لے مگر کرب وبلا سے پہلے

ے نہ گھبرا اے دل محزوں کہ جذب غم ہی بہتر ہے
مسائل عشق کے آہ و فغاں سے حل نہیں ہوتے

ے کیا آباد مے خانہ، جنہوں نے، اور رونق دی
وہی ہیں جو کہ آج اک جام کی خاطر ترستے ہیں ۲۹

منصور ویراگی

عبدالرؤف ۸ راکتوبر سنہ ۱۹۳۰ء کو بمقام ماجھند ضلع دادو سندھ میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج حیدرآباد سے ایف اے کر کے درس وتدریس میں لگ گئے۔ آپ سندھی کے مشہور ادیب وشاعر ہیں۔ اردو میں بھی بہت اچھا کہتے ہیں۔ آپ کی قومی نظموں کا مجموعہ "صدائے وطن" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

ے ہم کہ مجبور قفس آنسو بہاتے ہیں تو کیا — اہل گلشن کے بھی نغمے بے اثر ہوتے رہے
کتنی شدت تھی خدا جانے فراق دوست میں — کتنے ارماں تھے جو نذر بام و در ہوتے رہے

ے جنگل جنگل، بستی بستی، مسجد مسجد گونج اذاں کی
گلشن گلشن نور کے جلوے، پھر بھی نہیں ہے دل میں اجالا

---

۲۹ بحوالہ خط مولانا عبداللہ از مورخہ ۲۳ راکتوبر سنہ ۱۹۷۶ء

؎ مقام دار و رسن سے گزر گئے منصور — مگر سمجھ نہ سکے اہلِ اقتدار کی بات

؎ شہیدوں کے لہو سے ہے ملا یہ رنگ پھولوں کو — انہیں کے خون نے بخشی یہ عظمت لالہ زاروں کو[۴۰]

پروفیسر غلام احمد بدوی

آپ کی ولادت ۲۱ جولائی ۱۹۳۲ء کو بمقام شکارپور ہوئی۔ ادبی اور شعری ذوق کی ضمانت کے لیے آپ کے پدر مرحوم لطف اللہ بدوی کا نام ہی کافی ہوگا۔ بحالت موجودہ آپ شکارپور کالج میں پروفیسر ہیں اور اردو میں پی ایچ ڈی کا مقالہ مکمل کرچکے ہیں۔ بنیادی طور پر آپ کا رجحان نظم سے زیادہ نثر نگاری کی طرف ہے لیکن کبھی کبھی سندھی اور اردو میں غزل کہہ لیتے ہیں۔ ایک اردو غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

؎ دل وہ کیا ہے جو ترا کشتہ بیداد نہیں — خاک وہ کیا جو تری راہ میں برباد نہیں

آشیاں اس میں بنانے کا مزہ کیا بلبل — جس چمن زار میں بجلی نہیں، صیاد نہیں[۴۱]

بشیر احمد موریانی

بشیر احمد موریانی ۱۰ مارچ ۱۹۳۵ء کو شکارپور میں پیدا ہوئے۔ سندھ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اولاً آپ انگریزی کے استاد پھر سندھی کے لیکچرر مقرر ہوئے، بحالت موجودہ سی ایس پی افسر ہیں۔

بشیر موریانی کئی زبانوں کے ماہر ہیں۔ آپ کا مطالعہ بہت وسیع ہے، سندھی ادب سے خاص لگاؤ ہے بہت کمسنی میں لکھنا شروع کیا تھا تو آج تک لکھ رہے ہیں۔

---

[۳۹] بحوالہ خط منصور ویراگی بنام مصنف مورخہ ۲۰ رشوال ۱۳۹۶ھ

[۴۰] تذکرہ شعرائے اردو حیدرآباد مرتبہ مولانا محمد انوار الحق شالی صفحہ ۱۹۱ مطبوعہ بزم فروغ ادب حیدرآباد ۱۹۷۰ء

[۴۱] بحوالہ خط پروفیسر بدوی بنام مصنف مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۷۶ء

Scanned with CamScanner

شاعری خمیر میں داخل ہے۔ نظمیں بھی کہتے ہیں اور غزلیں بھی، سندھی میں بھی کہتے ہیں اور اردو میں بھی اور ہر زبان میں اسی کے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ اردو کا نمونہ پیش ہے۔

ؔ ظلمت میں اہتمام سحر کر سکے تو کر — تکمیل آرزوئے بشر کر سکے تو کر
لے آگئی ہے منزل دار و رسن ندیم — اپنی جبیں کو خون سے تر کر سکے تو کر
تو مسکراہٹوں کا تو نہ ساماں کر سکا — لیکن علاج دیدۂ تر کر سکے تو کر
تاریکیوں سے بر سر پیکار رہ اے دوست — مشکل تو ہے یہ کام مگر کر سکے تو کر

یہ تیری آرزو، یہ تیرا ولولہ بشیرؔ
نظم حیات زیر و زبر کر سکے تو کر ۳۲؎

یوسف شاہین

یوسف شاہین کے والد کا نام عبداللہ داؤد پوتہ ہے۔ آپ ۴ رمارچ ۱۹۳۹ء کو نصر پور میں پیدا ہوئے۔ نصابی تعلیم صرف میٹرک تک ہے لیکن سندھی اور اردو پر عبور ہے اور کماحقہٗ فارسی سے بھی واقفیت ہے۔ آپ ایک روشن خیال نوجوان ہیں اور انسانیت کے علمبردار ہیں۔ سندھی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ نمونہ شاعری ملاحظہ ہو۔

ؔ مجھے جنّت کا لالچ نہ دو
میں انسان کو قتل کرنے کے لیے تیار نہیں
چاہے وہ کافر، مشرک منکر ہی کیوں نہ ہو!
حکمرانوں، بادشاہوں اور آقاؤں کے
تمام احکامات ماننے کو تیار ہوں
مگر انسان ہو کر

۳۲؎ "سندھ کے جدید اردو شعراء" از مشتاق علی جعفری صفحہ ۵۲ مطبوعہ ظہیر سنز حیدرآباد ۱۹۶۱ء
"سندھ میں اردو شاعری کا ارتقاء" از معراج نیر مطبوعہ الحمرا اکیڈمی لاہور ۱۹۶۲ء

انسان کے خلاف
ہتھیار نہیں اٹھاؤں گا نہیں اٹھاؤں گا [۴۳]

منور بالائی

عبدالقادر منور بالائی ۴ جون ۱۹۳۹ء کو بالہ کے ابڑو خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ایل ایل بی کرکے عربی و فارسی کے اعلیٰ امتحانات بھی پاس کئے۔ بالا کی ادبی فضا میں آپ کا مقام بہت بلند ہے۔ سندھی اور اردو دونوں کے اچھے شاعر ہیں۔

رہزن ہوش نے لوٹا عجب انداز سے دل — باخبر ہو گیا ہستی کے ہر اک راز سے دل

بے خودی یا تو دآگہی کیا ہے — یا الٰہی یہ زندگی کیا ہے!

طالب دید ہوشیار رہیں! — دیدۂ و دل کی آزمائش ہے
مرحلہ میری سخت جانی کا! — دست قاتل کی آزمائش ہے [۴۴]

رانا بھگوان داس بھگوان

رانا بھگوان داس ۲۹ دسمبر ۱۹۴۲ء کو نصیر آباد (لاڑکانہ) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم نصیر آباد میں حاصل کرکے کراچی یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ اردو سے بہت لگاؤ ہے، ادبی تحریکوں کے روح رواں اور کئی اردو کتابوں کے مصنف ہیں۔

نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

ذکر خدا تھا درد کا درماں تمام رات — تھا بے نیاز غم دل سوزاں تمام رات

---

[۴۳] بحوالہ خط یوسف شاہین بنام مصنف مورخہ ۹ اگست ۱۹۷۶ء
[۴۴] تذکرہ شعرائے اردو حیدرآباد صفحہ ۱۹۲، مطبوعہ بزم فروغ ادب حیدرآباد ۱۹۰۰ء
بحوالہ خط منصور ویرانی بنام مصنف ۲۰ شوال ۱۳۹۶ھ

بھگوائی یہ رات بھی شب معراج شوق تھی | یادِ حبیب میں تھا غزل خواں تمام رات

؎ باقی ہے محبت کو احساس خرد اب تک | تو یوں ہی پلائے جا پیمانہ بہ پیمانہ
دیوانے مبارک ہو تکمیل جنوں تجھ کو | اب وہ بھی پکار اٹھے، دیوانہ ہے دیوانہ [۲۵]

سردار علی شاہ ذاکر

سید سردار علی شاہ ذاکر ۱۹۴۶ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ آپ کا آبائی وطن گھوڑکی ہے۔ تعلیم بی اے آنرز تک حاصل کی۔ کئی زبانوں کے ماہر ہیں۔ سندھی اور اردو دونوں کے ادیب و شاعر ہیں۔ آجکل روزنامہ مہران کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ اردو کلام کا نمونہ درج ذیل ہے۔

؎ منزل عشق ہے گو دور مگر جاتے ہیں | خوگر درد ہیں، بے خوف و خطر جاتے ہیں
ہم وہی ہیں جنہیں سرچشمہ میخانہ کہیں | میکدے ہاتھ پہ رکھتے ہیں، جدھر جاتے ہیں
رہبروں نے ہمیں کچھ ایسے دیئے ہیں دھوکے | ہم سفر اپنا ہی سایہ ہو تو ڈر جاتے ہیں [۲۶]

نقش نایاب منگی

پورا نام حق نواز ہے۔ ۷ دسمبر ۱۹۴۷ء کو بمقام شکارپور پیدا ہوئے۔ انٹر تک تعلیم حاصل کر کے محکمۂ آبپاشی میں ملازمت کر لی۔ سندھی اردو دونوں کا ادبی اور شعری ذوق رکھتے ہیں۔ سندھی میں ایک کتاب رات جا لطیف جی لکھی ہے اور ایک سندھی اردو گرامر مرتب کی ہے مگر دونوں کتابیں غیر مطبوعہ ہیں۔ اردو کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

؎ صنم ایک بے بس پہ اتنا تشدد | ہمیں دیکھ ہم کیا سے کیا ہو گئے ہیں
مرے ہم سفر دو قدم ساتھ چل کر | اچانک مرے رہنما ہو گئے ہیں

---

[۲۵] "سندھ میں اردو شاعری کا ارتقاء" از معراج نیر صفحہ ۱۰۹، مطبوعہ الحمرا اکیڈمی لاہور ۱۹۷۲ء
[۲۶] "تذکرہ شعرائے اردو حیدرآباد" صفحہ ۲۲۳، مطبوعہ بزم فروغ ادب حیدرآباد ۱۹۷۰ء

ے شمع بے معصوم پروانے نے کھیلا کر کیا ملا | خود بخود تو بھی سحر تک خاک میں مل جائے گی
ماہ و انجم، کہکشاں افلاک ہیں زیرِ قدم | رفتہ رفتہ اب سیاہی بخت کی چھٹ جائے گی [۳۷]

نظام الدین ناظم چانڈیہ

آپ سندھ کے مشہور شاعر مولوی عبداللہ اثر کے صاحبزادے ہیں۔ ایم اے بی ایڈ، ایل ایل بی ہیں۔ درس و تدریس سے لگاؤ کے باعث لاڑکانہ کے ایک اسکول میں معلم ہیں۔ سندھی میں آپ کی شاعرانہ حیثیت مسلّم ہے۔ ذوق کی تسکین کے لیے اکثر اُردو میں نعت اور غزل کہتے ہیں۔ نمونہ کے طور پر چند شعر درج کیے جاتے ہیں۔

ے تاریک زندگی کی ضیا آپ ہی تو ہیں | سارے جہاں کے راہ نما آپ ہی تو ہیں
ہم بحرِ حادثات کی موجوں سے کیوں ڈریں | کشتی کے ناخدا بخدا آپ ہی تو ہیں!

ے زباں سے اپنی جو نکلی تو اسکو لے اڑی دنیا
ہماری گفتگو بھی بن گئی ہے ایک افسانہ

ے آنکھوں کے جام یادِ تمنا سے بھر گئے | آنسو گرے تو فرش پہ موتی بکھر گئے
ے اس مہ جبیں کی زلف جو لہرا رہی ہے آج | صحنِ چمن پہ کالی گھٹا چھا رہی ہے آج [۳۸]

شیخ امداد علی امداد

شیخ امداد ۱۲ / اپریل ۱۹۵۳ء کو لاڑکانہ میں پیدا ہوئے۔ آپ سندھی اور اُردو ہر دو زبان کے شاعر ہیں اور دونوں زبانوں میں آپ کا کلام بہت شگفتہ ہوتا ہے۔ اُردو شاعری کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

ے کنجِ قفس میں فصلِ بہاراں کی دھوم ہے | موسم بدل رہا ہے بڑی آن بان سے
برہم جواں کو دیکھا تو خاموش ہو گیا | امداد کچھ بھی کہہ نہ سکا میں زبان سے

---

[۳۷] بحوالہ خط لقش نایاب منگی بنام مصنف مورخہ ۲۲ / اکتوبر ۱۹۷۶ء
[۳۸] بحوالہ خط مولانا عبداللہ اثر بنام مصنف مورخہ ۱۲ / ستمبر ۱۹۷۶ء

ھ آنکھ سے ٹوٹے ستاروں کو ذرا غور سے دیکھ — یہی روداد ہے، روداد کی تفسیر بھی ہے
طول کھینچا ہے اسیری نے یہاں تک امداد — اتنا بھی یاد نہیں، پاؤں میں زنجیر بھی ہے

ھ — اس کی آنکھوں کی بلاغت کے تصدق امداد
مجھ سے وہ حال مرا پوچھ رہا ہو جیسے — ھ۳۹

سندھ کے مترجم شاعر و ادیب

شاعروں کی موجودہ نسل میں ایک بڑی تعداد ایسے ادبا و شعراء کی ہے جو سندھی اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں اور دونوں میں لکھتے ہیں۔ ان لوگوں نے صحیح معنیٰ میں اُردو کی بڑی خدمت کی ہے۔ سندھی کے مایہ ناز ادب کو اُردو میں منتقل کیا ہے اور سندھی شاعری کے شہ پاروں کو اُردو نظم کا قالب عطا کیا ہے۔

اس کارِ عظیم میں چھوٹے اور بڑے سب شامل ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو ہمہ گیر ہیں اور سندھ کے لیے موجب تفاخر ہیں کچھ وہ ہیں جن کے کام بھی وقیع ہیں اور نام بھی معروف ہیں اور کچھ قلمکاروں نے ابھی لکھنا شروع کیا ہے۔

اتفاق سے ان میں بیشتر لوگ نثر نگار بھی ہیں اور شاعر بھی۔ سندھی اور اُردو کے درمیان ان کی شخصیتیں وجہ ربط اور موجب اشتراک ہیں۔ بعض کا جھکاؤ سندھی کی طرف زیادہ ہے اُردو کی طرف کم اور بعض کا اُردو کی طرف زیادہ ہے سندھی کی طرف کم لیکن ہیں وہ دونوں کے ادیب، جیسے پیر علی محمد راشدی، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ اور پیر حسام الدین راشدی وغیرہ بلا ترتیب بہت سے نام لیے جا سکتے ہیں جن کی اکثریت شاعر بھی ہے ان میں شیخ ایاز، ڈاکٹر محمد ابراہیم خلیل وغیرہ شامل ہیں۔ بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں مثلاً شیخ حفیظ، لطف اللہ بدوی، رشید احمد لاشاری وغیرہ اور بعض وہ لوگ بھی جو بحمد اللہ بقید حیات ہیں جیسے ڈاکٹر اسد اللہ شاہ حسینی، عبدالواحد سندھی، شیخ

ھ۳۹ بحوالہ خط مولانا عبداللہ اثر

عبدالرزاق راز، میمن عبدالمجید سندھی، آدم تاتایاب، سید الحق وغیرہ۔

شعراء و ادباء کے اس سلسلے میں ان گنت نام ہیں جن کو بلا لحاظ مراتب گنوایا جائے تو تعداد سیکڑوں میں ہوگی۔ رئیس امروہوی، اختر انصاری اکبرآبادی، سید ہاشم رضا، ابن انشاء، ایاز قادری، رشید بھٹی، ع۔ ف۔ شیخ، شاہد اکبرآبادی، الیاس عشقی، منظور نقوی، عثمان ڈیپلائی، آفاق صدیقی، محمد عمر چاند، غلام رسول بلوچ، غلام ربانی، امداد حسینی، تنویر عباسی، زیب بھٹی، انجم رامپوری، سمیع الوری، قادر بخش، مظفر حسین جوش، محمد بخش مجنوں، ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی، دلشاد حسین اختر، کبیر انور جعفری، تاج بلوچ، شمشیر الحیدری، عبدالحلیم جوش، آغا شاہین، بشیر موریانی، علی محمد مجروح، روشن مغل، جمال ابڑو، امر جلیل، آغا سلیم، مثال رضوی، قاصد عزیز، افشاں انجم، اختر رضوی وغیرہ وغیرہ وہ بے شمار اہل قلم ہیں جنہوں نے لسانی ترجمانی کے فرائض انجام دیئے ہیں اور ان سب کے کلام کو یکجا کر دیا جائے تو کئی ضخیم کتابیں بن سکتی ہیں۔ ایسے بعض مجموعے مرکزی محکمۂ اطلاعات پاکستان سے شائع ہوئے ہیں مگر ابھی بہت کام باقی ہے اور اس کے چھپنے تک مزید اتنا ہی کام ہو جانے کی توقع ہے۔

سندھی کے قدیم نثری اثاثے کی منتقلی میں پیر حسام الدین راشدی، ڈاکٹر بلوچ، اختر رضوی، لطف اللہ بدوی، عبدالرزاق راز، احمد رشید احمد لاشاری وغیرہ کی خدمات فراموش نہیں کی جاسکتیں۔ نظم میں بھی کافی کام ہوا ہے۔ شاہ بھٹائی، سچل سرمست اور دوسرے مشہور شعراء کے کلام کا بڑا حصہ اُردو منظومات کا جزو بن چکا ہے۔ مزید کام کے لیے نوجوان نسل مستعد نظر آتی ہے جس سے امید کی جاتی ہے کہ اگلے چند برسوں میں سندھی منظومات کے اُردو تراجم دوسری تمام علاقائی زبانوں کے ترجموں سے بڑھ جائیں گے بعض ترجموں کے اقتباسات مزاج شاعری کا اندازہ لگانے کی خاطر پیش کئے جا رہے ہیں۔

"تحفۂ لطیف"

مترجمہ رئیس امروہوی

سے حسینی قافلہ صحرا کی جن راہوں سے گزرا تھا — وہ راہیں آج تک اس قافلہ کو یاد کرتی ہیں

شہادت کیا ہے، اک درسِ محبت کے نکھرنے کا — کوئی شکوہ نہ تھا مولیٰ کو اعدا کے ستانے کا
شہیدِ عشق ہی واقف ہے اسرارِ شہادت سے — وگرنہ کس کو آتا ہے سلیقہ سر کٹانے کا
شکستِ ظاہری فتحِ مبین عشق ہوتی ہے — حسینی فوج نے باطل کی قوت کو کچل ڈالا

حسین، اللہ اکبر، اے حسین، اے کربلا والے
سبق لیں تجھ سے ایثار و شجاعت کا وفا والے

لیلاں اور چنیسر
(شاہ بھٹائی)
مترجم: ابن انشاء
لیلاں (چنیسر سے)

تو نے کیوں محو کیا ہے انہیں لوحِ دل سے — حاصلِ زیست سمجھتے ہیں جو پیارے تجھ کو
ان کو تعلقت کی نگاہوں میں نہ رسوا کرنا — واسطہ دیتی ہوں جینے کے سہارے تجھ کو
تیری سودائیاں تو میرا اکیلا پیتم! — دل بسا لے تو بھلا کیسے بسا لے تجھ کو

جواب

ایک ادنیٰ سا گلوبند تھا جس کی خاطر — کھو دیا دل سے خداوند کو ناداں تو نے
تجھ سے سرگشتہ ہوا تیرا چنیسر راجا — کپٹی کونرو سے کیا ایک جو پیماں تو نے
اپنی قسمت کا عجب الٹا ہے صفحہ غافل — بات کی ہے بڑی رسوائی کے شایاں تو نے

سوہنی مینہوال
شاہ بھٹائی
مترجم: شیخ ایاز

سوہنی کیا ہے اور کیا مینہوال — راز سربستہ ہی رہی یہ بات
فہم و ادراک کی رسائی کیا — عشق ہے ماورائے امکانات

بحر و بر ہی پہ کچھ نہیں موقوف — ساری دنیا ہے حسن سے معمور
کار فرما ہے اے مرے محبوب — فرش تا بہ عرش تیرا نور
خیز ہو دار و گیر کی یا رب — ذرہ ذرہ ہے پیر و منصور

جگ پانی کا حباب

(شاہ بھٹائی)

مترجمہ کبیر انور جعفری

اے بابا جگ پانی کا حباب

جگ ہے اک مستی کا پیالہ — جس کا نشہ ہے کالا
کوثر کا یہ جام نہیں ہے — جانو کالی شراب!
محفل کی یہ شمع نہیں ہے — جگ پانی کا حباب
جگ اک مستی کا پیالہ — جس کا نشہ ہے کالا

کالا کالا کالا

راہ طلب میں

(سچل سرمست)

مترجمہ شیخ ایاز

طبل تمنا گونج رہا ہے

اہل سلاسل چنگ بہ لب، زنجیر بہ پا ہیں
سارے خرفہ زنداں وا ہیں
شور بپا ہے
ساز نفس بر ضرب صبا ہے
ولولہ خیز آہنگ صدا ہے

سینۂ رنگینی شعلہ نوا ہے
بلبل تمنا گونج رہا ہے
راہ طلب میں

پھر رات ڈھلی
(جیٹھن رائے ساحی)
مترجمہ شیخ ایاز

سے وہ گاؤں کی گوری پنگھٹ پر جس وقت مٹکتی آتی ہے
ہر تیا گ لرزنے لگتا ہے بیراگ بہت بل کھاتا ہے
اے کوئل اتنا کوک کہ اس پاپی کے دل سے ہوک اٹھے
جو اس جیون کے پگ پگ پر ہر بھگون کو ٹھکراتا ہے

سندھی دوہے
(شیخ ایاز)
مترجمہ آفاق صدیقی

سے پیو میٹھے پی ہونٹوں پر کو ٹھی کھول گلال
پی لوں میں بھی جی لوں، تو بھی جئے ہزاروں سال
کو ٹھی کھول گلال، پیالے میں ہے مالا مال
پیار رہے جو تو گلی گلی میں ملیں گے سب کنگال

ساحر ایمیوں سے
(شیخ ایاز)
مترجمہ آفاق صدیقی

جیا تھا ہوں اور میرا جانا
ایک چنگاری کی دھیمی آنچ ہے

پھیل جائے گی کبھی جو برق بن کر ہر طرف
جل اٹھے گا یہ جہان پر فریب
جو تمہارے ظلم کی تخلیق ہے
بس یقیں کر لو یہی انجام آخر کار ہے
جیت ہماری اور تمہاری ہار ہے
آگ کے جلتے ہوئے شعلوں میں جب
راکھ ہو جاؤ گے تم
پھر سے یہ شعلے جنم دیں گے اک نئے انسان کو

الیاس عشقی

مترجمہ آذر نایاب

زسرتا قدم سانوری کا بدن ہے　　　مٹھائی کی والی ہے سچل کا فن ہے
تجھے بھول کر اپنے ہی شہر میں　　　مسافر بنے آج ہم بے وطن
لہو ہے بہاروں کا یا سرخ پھول　　　ہے چٹکی ہوئی چاندنی یا کفن ہے

غزل

تاج بلوچ

مترجمہ ایم قادر شفق

۵　جہاں جلوہ گر روئے تاباں ہوا　　　وہیں شہر دل میں چراغاں ہوا
بکھیری ہے کس نے یہ زلف دوتا　　　نظام دو عالم پریشاں ہوا
صراحی و ساغر نے سجدے کئے
جہاں ذکر چشم غزالاں ہوا

لومبا اور اس کے ساتھیوں کی شہادت کے بعد

شمشیر الحیدری

مترجم ایم قادر شفق

عشق کی سنسان وادی کے قریب
درد کے دریا میں وہ طغیانیاں
رفتہ رفتہ بیکراں ہوتی گئیں
قطرے قطرے میں محبت کا شعور
قطرہ قطرہ ہے زمانے کا ضمیر
فاصلوں کی وسعتیں کس کے لیے
وقت کی پیمائشیں کس کے لیے
فکر کو کب کر سکا کوئی اسیر

کینسر

امداد حسینی

مترجمہ قاصد عزیز

وقت کی دو زرد ٹھنڈی انگلیوں میں
زندگی جیسے کوئی سگرٹ جلے
حادثوں کی دھول ہے اس کا دھواں
راکھ ہیں سب خواہشیں
موت ہے اک ایش ٹرے

غزل

عبدالحلیم جوش

مترجمہ افشاں انجم

میکدے کی کیا خبر واعظ تجھے
جو ادھر آیا وہ انساں ہو گیا
گر گئی ظلمت کدے میں روشنی
برق کا مجھ پر یہ احساں ہو گیا
جوش جس کی عمر گزری کفر میں
آخری ساعت مسلماں ہو گیا

گیت

بشیر موریانی

مترجمہ: افشاں انجم

مرا من نادان سکھی ری ـــــ مرا من نادان

پل میں مارے پل میں جلائے
پل میں ہنسائے پل میں رلائے
کیا کیا باتیں یاد دلائے
دیکر آنسو دان سکھی ری ـــــ مرا من نادان

غزل

علی محمد مجروح

مترجمہ: آذر نایاب

فصل گل تو ہوا ہو گئی دوستو ۔۔۔ بخش کر زخم دل کو نئی زندگی
تیری اک اک ادا، تیری اک اک نظر ۔۔۔ زندگی زندگی، روشنی روشنی
حسن تیرا غزل جیسے مجروح کی ۔۔۔ سادگی، دلکشی، نغمگی، تازگی

غزل

میر عبدالحسین ساگی

مترجمہ: شیخ عبدالرزاق راز

رقص حوروں نے کیا وجد میں غلماں آئے ۔۔۔ مست تیرے جو قیامت میں غزلخواں آئے
دیکھ کر میری پریشانی فرقت اے دوست ۔۔۔ مدتوں شام و سحر چاک گریباں آئے
کیا کہوں اس رخ پرُ نور کا عالم ساگی ۔۔۔ ماہ و انجم بھی مرے سامنے حیراں آئے

غزل

آذر نایاب

مترجمہ انجم رامپوری

جو سمجھتے ہیں محبت کو خلل! ذہن میں ان کے خلل ہوتا ہے
ایک ہی بات ہے ہنسنا رونا ہر عمل ردِّ عمل ہوتا ہے ؎

؎ ماخوذ از سندھی ادب نمبر نئی قدریں حیدرآباد

سندھ میں اردو کا نثری اثاثہ

قیام پاکستان کے بعد

سندھ میں اُردو کا نثری سرمایہ تقسیم ہند سے قبل کتنا ہی کم کیوں نہ رہا ہو لیکن پاکستان بننے کے بعد سے اس میں معتدبہ اضافہ ہوا ہے اور صرف کتابوں کی تعداد ہی نہیں بڑھی ہے بلکہ سندھی ادب کے شہ پارے بھی اُردو میں منتقل ہوئے ہیں۔ سندھ کی روایات و ثقافت پر بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ سندھی مشاہیر کے کارنامے بھی قلم بند کئے گئے ہیں جن سے گویا ادب و تاریخ دونوں کو فائدہ پہنچا ہے۔

اکثر سندھی اکابر نے اُردو ادب میں بھی موشگافیاں کی ہیں اور اہل زبان نہ ہوتے کے باوجود اپنی زبان دانی کا لوہا منوالیا ہے جن میں پیر حسام الدین راشدی، عبدالواحد سندھی، شیخ عبدالرزاق راز، ڈاکٹر محمد ابراہیم خلیل، رشید احمد لاشاری اور لطف اللہ بدوی وغیرہ شامل ہیں۔

سندھی ادیبوں کی تعداد یوں تو بہت زائد ہے مگر شامل صرف ان لوگوں کو کیا جا رہا ہے جو اس میدان میں ایک طویل استقامت رکھتے ہیں۔ ان میں ان لوگوں کا شمار بھی ہے جنہوں نے سندھی زبان سے استفادہ کر کے اُردو میں لکھا ہے اور ان لوگوں کا بھی جنہوں نے بنیادی طور پر اُردو ہی میں خامہ فرسائی کی ہے۔

افراد کے تذکرے میں مصلحتاً محدود بجز اختصار سے کام لیا گیا ہے تاہم کوشش کی گئی ہے کہ ہر نثر نگار کا فن و شخصیت روشن ہو جائے۔

شاہ غلام رسول

(حصہ نظم سے پیوستہ) اُردو کے باقاعدہ نثر نگار تو نہ تھے لیکن مریدوں کو جو تحریری ہدایات دیتے تھے، ان سب کو یکجا کر لیا جائے تو تصوف کی ایک پوری

کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

مولانا محمد ابراہیم

آپ مولانا محمد قاسم کے چھوٹے بھائی تھے، ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد مولانا محمد ہاشم کے زیر سایہ حاصل کی پھر بڑے بھائی کے پاس گڑھی یٰسین آ گئے۔

آپ ایک عالم دین اور صوفی مشرب بزرگ تھے، عربی، فارسی، سندھی اور اردو چاروں زبانوں میں مہارت حاصل تھی، ۱۹۶۳ء میں انتقال فرمایا۔ فارسی زبان پر آپ کو بڑی قدرت حاصل تھی۔ کلیات ناظم، دیوان ناظم اور تواریخ منظومہ کے قلمی نسخے آپ کی یادگار ہیں۔

بڑے بھائی کی طرح آپ بھی فتاوے اردو ہی میں لکھا کرتے تھے۔ یہی فتوے آپ کی نثر کا نمونہ ہیں۔ پروفیسر دردائی نے اردو میں آپ کی ایک نعت کے چار مصرعے دیئے ہیں جو منقول ہیں۔

سرور عالم حبیب کبریا پیدا ہوئے	پیشوائے مرسلان وانبیا پیدا ہوئے
ناظما کیونکر گل اُمید پژمردہ رہے	نوبہارے موجب نشو ونما پیدا ہوئے[1]

میر رحیم داد خاں مولائی شیدائیؔ

آپ ۱۸۹۴ء میں بمقام سکھر پیدا ہوئے۔ آپ کے والد شیر محمد خاں ایک معزز اور ذی علم آدمی تھے۔ مولائی شیدائی اعلیٰ نصابی تعلیم حاصل نہ کر سکنے کے باوجود سندھی، انگریزی اور اردو میں مہارت رکھتے ہیں۔ ادبی ذوق ورثے میں ملا ہے لہذا ۱۹۳۹ء میں ریلوے کی ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد صحافت کی طرف متوجہ ہو گئے اور

---

[1] "صوفیائے سندھ اور اردو" از پروفیسر معین الدین دردائی صفحہ ۹۲ مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشل کراچی ۱۹۶۳ء

تصنیف وتالیف کا سلسلہ شروع کر دیا۔

سندھی کی بہت سی کتابیں آپ کی کاوش قلم کا نتیجہ ہیں۔ اُردو بڑی شگفتہ بولتے ہیں لیکن لکھا کم ہی ہے۔ "آئینہ بلوچ" اُردو میں آپ کی یادگار تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ روزنامہ جنگ اور بلوچی دنیا وغیرہ میں شائع شدہ مضامین آپ کی اُردو نثر کا سرمایہ ہیں۔ "تاریخ سیاست سندھ" کے اُردو ترجمہ پر عرضِ مولف کے عنوان سے جو کچھ آپ نے لکھا ہے اس کو آپ کی نثر کا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ [۲۲]

قاضی علی اکبر درازی

قاضی علی اکبر سندھ کے ایک ذی علم اور ممتاز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۲۸ر جولائی ۱۸۹۵ء کو روہڑی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد قاضی علی محمد روہڑی کے عمائدین میں تھے مگر آپ میٹرک سے زیادہ نصابی تعلیم حاصل نہ کر سکے اور ۱۹۱۶ء میں ریونیو ڈپارٹمنٹ میں ملازمت کر لی۔

لکھنے لکھانے کا شوق ابتدائے عمر سے ہے مگر ریٹائر ہونے کے بعد سے اس میں اضافہ ہو گیا ہے۔ بچل سرمست سے متعلق سندھی اور اُردو میں آپ کی بہت سی کتابیں ہیں۔ سندھی اور سرائیکی کے شاعر بھی ہیں۔ سندھی کی مطبوعہ کتابوں کی تعداد اکیس[۲۳] ہے۔ اُردو میں چار مطبوعہ مقالے ہیں۔ شاعر ہفت زبان، شاعر اعظم و مفکر، سرتاج الشعراء اور مختصر سوانح حیات (بچل سرمست)

قاضی درازی کا رنگ خالص مذہبی اور صوفیانہ ہے مگر اُردو نثر سلیس اور رواں ہوتی ہے۔ [۲۳]

---

[۲۲] بحوالہ خط ڈاکٹر عبدالمجید میمن بنام مصنف مورخہ ۹ راکتوبر ۱۹۷۶ء

[۲۳] "صوفیائے سندھ اور اُردو" از پروفیسر معین الدین دردائی صفحہ ۲۰۵ مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۷۳ء

میرزا گل حسن کربلائی

آپ ٹنڈو آغا کے ایک موقر اور ادب دوست خاندان کے فرد تھے، ۱۸۹۵ء میں اسی مقام پر پیدا ہوئے۔ ماحول کے اثر سے تکمیل تعلیم سے قبل ہی ادب کا چسکا پڑ گیا اور سندھی، سرائیکی، فارسی اور اردو میں لکھنے لگے۔

شاعری پورے گھرانے میں شغل کے طور پر کی جاتی تھی لیکن آپ نے نثر کی طرف بھی توجہ کی۔ آپ کے مضامین سرفراز لکھنؤ میں برابر شائع ہوتے رہتے تھے جن میں "حُسن کلام"، "سندھی شعراء کا نذرانۂ عقیدت"، "کلام ثابت" وغیرہ بڑے تحقیقی مضامین تھے۔ آپ نے شعراء کا ایک اردو تذکرہ بھی مرتب کیا تھا جو شائع نہ ہو سکا۔ ۴۴ھ

شیخ محمد ابراہیم خلیل

(حصۂ نظم سے پیوستہ) آپ سندھی کے بھی ادیب ہیں لیکن اُردو میں آپ کی فی زمانہ یہ حیثیت ہے کہ سندھ کا بابائے اُردو کہہ دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اُردو میں آپ کے مضامین بڑے محققانہ ہوتے ہیں جو ہمیشہ ادب کا سرمایہ رہیں گے کیونکہ ہیں بھی آپ "محقق الادب"۔

عبداللہ خواب

(حصۂ نظم سے پیوستہ) سندھی میں آپ کی بہت سی کتابیں ہیں۔ اُردو میں اکثر مضامین لکھتے رہتے ہیں جو یکجا کر لیے جائیں تو ایک تحقیقی کتاب بن سکتی ہے۔

جی ایم سید

پورا نام غلام مرتضیٰ شاہ ہے۔ آپ ۱۷ر جنوری ۱۹۰۴ء کو اپنے آبائی گاؤں "سن"

۴۴ھ بحوالہ "سندھ کے اُردو نثر نگار" مقالہ ڈاکٹر محمد منہاج الدین برائے پی ایچ ڈی

ضلع دادو میں پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان سندھ کے چند برگزیدہ خاندانوں میں سے جن سے رشد و ہدایت کی نسلی روایات وابستہ ہیں۔ خود جی ایم سید کی سیاسی شخصیت مرکزِ علوم بھی ہے۔ آپ نے کئی زبانوں میں لکھا ہے، سندھی، انگریزی اور اُردو میں۔
سیاسی زندگی میں اکثر اُردو میں تقریریں کرتے رہے۔ سندھی کی بہت سی کتابیں آپ کی تصانیف میں ہیں جن میں سے بعض کے تراجم اُردو میں ہو چکے ہیں۔ بعض کتابیں آپ نے براہ راست اُردو میں لکھی ہیں جیسے مسلم لیگ کی مخالفت کیوں؟ (۱۹۵۱ء) میں نے مسلم لیگ کیوں چھوڑی؟ (۱۹۴۶ء) چھوٹے چھوٹے سیاسی پمفلٹ کتب پر مستزاد ہیں۔ ؎

لطف اللہ بدوی

(حصہ نظم سے پیوستہ) سندھی میں آپ کی تصانیف کی فہرست طویل ہے۔ اُردو نثر میں بھی کافی کام کیا ہے۔ ساری زندگی مختلف موضوعات پر مضامین لکھتے رہے "پنچ اور سوہندی"، "شاہ عبداللطیف بھٹائی حیات و شاعری" اور "احمد شاہ ابدالی" آپ کی اُردو تصانیف میں ہیں۔ عربی شاعری کا فارسی شاعری پر اثر، فتح سندھ، تاریخ اندلس، رام راج کی سازشیں، تاریخ ادبیات سندھ غیر مطبوعہ ہیں۔

آغا تاج محمد خاں

آغا تاج محمد کے والد آغا عبدالمجید اور دادا شہاب الدین خاں سب ہی علم و ادب کے شیدائی تھے۔ آپ کی ولادت ۱۶ ستمبر ۱۹۰۴ء کو بگارجی گاؤں سکھر میں ہوئی۔ آپ سندھی، فارسی، اُردو اور انگریزی کئی زبانوں کے ماہر تھے۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۹ء سندھ یونیورسٹی کی ملازمت کے دوران انتقال فرمایا۔
آپ کی تصانیف بھی کئی زبانوں میں ہیں۔ اُردو میں آپ صاحب طرز انشا پرداز مانے جاتے ہیں، تحریر میں زور اور ایک عالمانہ وقار پایا جاتا ہے۔ عکس لطیف،

؎ سندھی لیکھکن جی ڈائرکٹری مطبوعہ انسٹیٹیوٹ آف سندھیالوجی حیدرآباد ——— بحوالہ بیان اختر رضوی

دیہاتی گیت، حسین اور اسلام، ٹھٹھ کی سیر، سندھ کے رسم و رواج اور آسان سندھی ریڈر آپ کی مطبوعہ تصانیف میں ہیں۔ کئی قلمی مسودے آپ کے ورثا کے پاس موجود ہیں۔ ۵۶ہ

پیر علی محمد راشدی

آپ کی شخصیت پاکستانی سیاست اور اردو صحافت میں محتاج تعارف نہیں، ۵ راگست ۱۹۰۵ء کو سندھ کے ایک برگزیدہ خانوادے میں پیدا ہوئے جس کا سلسلہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر جا کر منتج ہوتا ہے۔ آپ نے کسی مدرسے میں باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ میر پور خاص میں گھر ہی پر لائق استادوں سے اتنا کچھ پڑھ لیا کہ عربی، فارسی، انگریزی، تمام مروجہ زبانیں آگئیں۔

اور یہ آپ کے پدر محترم پیر سید حامد شاہ کی تربیت کا اثر تھا کہ تعلیم صرف گھریلو ہونے کے باوجود عملی زندگی میں آپ نے بڑے بڑے سند یافتہ لوگوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔

آپ کی صحافیانہ زندگی کا آغاز شکارپور کے اخبار الحرب سے ہوا۔ پھر سکھر کے الامین اور بعد کو سندھ زمیندار میں کام کیا۔ ۱۹۲۴ء میں خود ستارہ ہند نکالا، ۱۹۴۰ء میں مسلم وائس اور ۱۹۴۸ء میں سندھ آبزرور کا اجرا کیا۔ عرصے تک اسٹیٹس مین کے ایڈیٹر رہے۔ اس دوران سیاست میں بھی حصہ لیتے رہے اور غیر ملکی دورے بھی کئے

عربی، فارسی، سندھی اور انگریزی کی استعداد پہلے ہی مسلم تھی۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے اردو کی صلاحیت کو بھی آزمایا۔ اخبار جہاں اور جنگ کے کالموں سے اردو صحافت کا آغاز کیا اور اس میں بھی اپنی اہلیت کا لوہا منوا لیا۔

آج کی اردو صحافت میں آپ کا مستقل مقام ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ آپ

۵۶ہ بحوالہ سندھ کے اردو نثر نگار، مقالہ ڈاکٹر منہاج الدین برائے پی ایچ ڈی

سندھی یا انگریزی کے بجائے اردو ہی میں لکھنے کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ ؎

سرشار عقیلی

(حصہ نظم سے پیوستہ) سرشار نے طالب علمی ہی کے زمانے سے اُردو میں مضامین لکھنا شروع کر دئیے تھے، پھر علمی زندگی میں ماہنامہ تصوف لاہور اور دوسرے رسائل میں لکھتے رہے۔ یہ مضامین یکجا کر لئے جائیں تو اچھا خاصا مجموعہ بن سکتا ہے۔

سائیں عبدالرشید

(حصہ نظم سے پیوستہ) اُردو کے باقاعدہ نثر نگار تو نہ تھے لیکن رشد و ہدایت کے سلسلے میں یا خانقاہی ضرورت سے کبھی پمفلٹ کبھی کتابچے شائع کرتے رہتے تھے جن کے لیے نثر لکھنے کا اتفاق ہوتا تھا۔

محمد عثمان ڈیپلائی

آپ ۱۳ جون ۱۹۰۸ء کو ڈیپلو ضلع تھرپارکر میں پیدا ہوئے۔ نصابی تعلیم صرف بی۔ اے تک ہے لیکن اُردو، فارسی، سندھی کئی زبانوں کے ماہر ہیں۔ ادبی ذوق گھٹی میں پڑا ہے اور بارہ سال کی عمر سے برابر لکھ رہے ہیں۔ آپ نے پہلا ہفت روزہ اخبار طالب علمی کی زندگی ہی میں نکالا تھا جس کا نام "فرحت آثار" تھا۔ سولہ برس کی عمر میں پہلا اُردو مضمون "منادی" دہلی میں شائع ہوا جس کا عنوان "غازی محمد بن قاسم" تھا جس کے بعد آپ اکثر دین و دنیا اور بنارا ہی وغیرہ میں لکھتے رہے۔

سندھی میں آپ کا سا لکھاڑ شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ کوئی ایک سو اکتیس کتابوں کے مصنف ہیں جن میں بعض بہت اہم ہیں۔ آپ کی کئی سندھی کتب کے اُردو میں ترجمے

؎ "صوفیائے سندھ اور اُردو" از پروفیسر معین الدین دردائی، صفحہ ۲۰۳ مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۶۲ء

بھی ہو چکے ہیں ۔

بے شمار مضامین کے ساتھ ساتھ اردو استاد اور سندھی استاد آپ کی اردو تصانیف ہیں ہیں۔ ۵ؔ

سرور علی

اردو میں ان کے افسانے کافی مقبول ہیں ۔ افسانوں کا پہلا مجموعہ ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا تھا جس کو "سندھ کے جدید اردو شعراء" کے مولف سندھ میں اردو کی پہلی کتاب بتاتے ہیں ۔ ان کی تصانیف میں ایک ناول انجام تالم ہے ۔ "مغربی اور اسلامی طرز تعلیم" ان کا ایک اہم مضمون ہے ۔

شیخ عبداللہ عبد

(حصہ نظم سے پیوستہ) آپ سندھی اور اردو دونوں زبانوں میں صاحب تصنیف تھے اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے ہر دو زبان کی درسی کتب کے مدیر رہے تھے ۔ سندھی میں عملی تنقید اور شخصی خاکے آپ ہی نے شروع کئے ۔ اردو میں متعدد مضامین تحریر فرمائے ۔

عبدالواحد سندھی

عبدالواحد ضلع سکھر کے " ودھن مہر" نامی گاؤں میں پیدا ہوئے آپ کے والد کا نام عبدالوارث تھا ۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر حاصل کی پھر کراچی آ گئے اور کراچی سے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں تعلیم حاصل کرنے گئے جہاں انٹرمیڈیٹ کر کے درس و تدریس میں لگ گئے پھر اخبار نویسی کی طرف مائل ہوئے ۔

پاکستان بننے کے بعد رسالہ " نئی زندگی" کے ایڈیٹر ہوئے ۔ ۱۹۶۸ء میں اس

۵ؔ سندھی لکھکن جی ڈائرکٹری صفحہ ۲، مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ آف سندھیالوجی حیدرآباد ۱۹۷۴ء
بحوالہ خط ڈیپلائی صاحب بنام مصنف

منصب سے ریٹائر ہو گئے مگر ۱۹۷۴ء میں پھر بلا لئے گئے اور ابتک اس رسالے کے فرائض ادارت انجام دے رہے ہیں۔

اُردو میں لکھنے کا شغف شروع سے ہے۔ ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۰ء تک جامعہ تعلیم ملی کراچی سے بچوں کا رسالہ "ستارہ" نکالتے رہے۔

بچوں کے ادب میں آپ کو بڑا دخل ہے اور آسان اُردو لکھنے پر دسترس حاصل ہے۔ بچوں کے لیے اُردو میں آپ کی بکثرت تصانیف موجود ہیں جن میں اسلام کے مشہور سپہ سالار، اسلام کے مشہور امیر البحر، رسول پاک کون تھے؟ قرآن پاک کیا ہے؟ اسلام کیسے شروع ہوا؟ اسلام کیسے پھیلا؟ وغیرہ کافی مفید کتابیں ہیں۔ [۹]

پیر حسام الدین راشدی

آپ پیر سید حامد شاہ کے چھوٹے بیٹے اور علی محمد راشدی کے برادر خورد ہیں۔ آپ کی پیدائش ۲۰ ردسمبر ۱۹۱۱ء کو بہمن گوٹھ میں ہوئی۔ آپ نے بھی بڑے بھائی کی طرح گھر ہی پر تعلیم حاصل کی اور سندھی میں چھوٹی چھوٹی کہانیوں سے ادبی زندگی کا آغاز کیا پھر ان کہانیوں کو خود ہی اُردو میں منتقل کیا۔

آپ کا تعلق اُس خاندان سے ہے جو ہمیشہ سے حریت پسند رہا ہے اور جس کی دو شاخیں پیر پگاڑو اور پیر جھنڈو کہہ کر پکاری جاتی ہیں۔ یہ وہ خانوادے ہیں جو ہر اسلامی تحریک میں پیش پیش رہے ہیں اور اتفاق سے ان تمام تحریکوں کی زبان اُردو تھی لہذا راشدی خاندان ہر دور میں بالواسطہ اُردو کا پشت پناہ بنا رہا اور اس کی اُردو دانی سندھ میں مسلم رہی۔

کہا جاتا ہے کہ سندھ کے اکثر بڑے گھروں میں اُردو بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ خود علی محمد راشدی اور حسام الدین راشدی نے بھی بقول خود اس زبان کو سندھی ہی کی طرح گھریلو ماحول سے سیکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں بھائی اپنی صحافتی اور ادبی زندگیوں کی

---

[۹] مصنف کے بیان کے مطابق

ابتداء ہی سے اُردو کو استعمال کرنے لگے تھے۔ علی محمد راشدی اپنے سندھی اخبار میں اُردو شاعروں کے کلام کو سندھی میں منظوم کراکے شائع کرتے تھے اور پیر حسام الدین نے خود سندھی سے اُردو میں ترجمے کئے اور پھر براہِ راست اُردو اخبارات میں لکھنا شروع کردیا۔ زمیندار و سیاست لاہور، معارف اعظم گڑھ، ماہ نو، اُردو اور قومی زبان کراچی اس کے شاہد ہیں۔

مضامین کا سلسلہ ہر ادیب کو کتاب کی منزل تک لے جاتا ہے۔ پیر صاحب غیر معمولی استعداد اور خداداد ذہانت کی بدولت دوسروں کے مقابلے میں جلد ہی صاحب کتاب بن گئے۔ آج بہت سی کتابیں آپ کی تصنیفات اور تالیفات میں شامل ہیں جن میں اکثر سندھی میں ہیں پھر بھی اردو تصنیفات کی تعداد کم نہیں ہے اور مقدمے ان گنت ہیں۔ مرزا غازی بیگ ترخان اور اس کی بزم ادب آپ کی معروف کتاب ہے۔ میر معصوم بکھری، مکلی نامہ، دود چراغ محفل وغیرہ کتب آپ کی کاوشِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ تحقیق کے میدان میں آپ کا نام مستند سمجھا جاتا ہے، ملکی اور غیر ملکی علمی اعزازات آپ سے منسوب ہیں۔

ان تمام باتوں کے پس منظر میں علم کی گہرائی اور گیرائی، خیالات کی ندرت، طبیعت کی جولانی اور قلم کی روانی کی کارفرمائی ہے۔ پیر حسام الدین راشدی کی تحریر میں بہاؤ بھی ہوتا ہے اور ٹھہراؤ بھی اور انداز بیان میں ایک ایسا تیکھا پن جو قاری کو اپنے ساتھ آگے بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ یہی آپ کی کامیابی کا راز ہے۔

اُردو ادب کی ایک جامع تاریخ آپ کے زیر قلم ہے۔ خدا کرے، وہ جلد مکمل ہو کر منظر عام پر آجائے۔ [۱]

پیر اسحاق جان سرہندی

آپ پیر محمد اسمٰعیل جان روشن سرہندی کے صاحبزادے تھے۔ ۱۹۱۳ء میں بمقام

[۱] "صوفیائے سندھ اور اُردو" از پروفیسر معین الدین دردائی صفحہ ۲۴۱ مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۶۳ء

حیدرآباد دکن پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت آپ نے اپنے والد محترم کے زیر سایہ حاصل کی اور بیشتر وقت سیر و سیاحت میں گزارتے رہے۔

آپ کئی زبانوں کے ماہر تھے اور اردو سے بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ آپ کی ایک مطبوعہ کتاب سفرنامہ ایران اردو نثر کا اچھا نمونہ ہے۔ [۱۱]

پروفیسر علی نواز جتوئی

آپ کے والد کا نام حاجن خاں جتوئی تھا۔ ۱۱ر جنوری ۱۹۱۴ء کو اپنے آبائی گاؤں جتوئی ضلع نواب شاہ میں پیدا ہوئے۔ حصول تعلیم میں آپ کی زندگی نوجوانوں کے لیے ایک مثالیہ ہے۔ بحالت موجودہ آپ کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ سندھیالوجی سے متعلق ہیں اور آپ کا شمار ماہرین تعلیم میں ہوتا ہے۔

آپ سندھی اور اردو دونوں کے مصنف ہیں۔ "میکدۂ مصطفائی" آپ کی وقیع کتاب ہے۔ تحقیقی مضامین میں، "کیا عربی پاکستان میں اردو ایک اجنبی زبان ہے؟"، "اردو صوتیے اور ان کی تحریری صورتیں" اور "یہ الزام غلط ہے کہ سندھ میں اردو کے خلاف سازش کی جا رہی ہے" وغیرہ کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ [۱۲]

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ

نبی بخش خاں بلوچ ۱۶ر دسمبر ۱۹۱۷ء کو گوٹھ جعفر خاں لغاری ضلع سانگھڑ میں پیدا ہوئے۔ ایم اے ایل ایل بی کر کے محکمہ تعلیمات سے وابستہ ہو گئے۔ ترقی کر کے سکریٹری تعلیمات ہوئے پھر جام شورو یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے پر فائز ہوئے آج کل مرکزی حکومت میں افسر بکار خاص ہیں۔

---

[۱۱] "صوفیائے سندھ اور اردو" از پروفیسر معین الدین دردائی صفحہ ۲۲۳ مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۶۳ء

[۱۲] بحوالہ سندھ کے اردو نثر نگار مقالہ برائے پی ایچ ڈی، ڈاکٹر محمد منہاج الدین

"سندھی کے مسلم الثبوت نثر نگار اور محقق ہیں۔ اردو کی کئی معرکۃ آرا، کتابیں آپ کی تخلیقات و تالیفات میں ہیں، آپ کی بعض سندھی اور فارسی تالیفات سے بھی اُردو کا تعلق ہے جیسے اکثر سندھی شعرا کے دواوین اور اردو سندھی، سندھی اُردو لغات "سندھ میں اُردو شاعری" آپ کی تحقیقی اور سدا بہار کتاب ہے۔ بعض تحقیقی اور ادبی مضامین بہت موقر ہیں۔ ۱۳؎

ڈاکٹر عبدالواحد ہالیپوتہ

آپ یکم جنوری ۱۹۱۷ء کو موضع گل محمد ہالیپوتہ حیدر آباد میں پیدا ہوئے سندھ یونیورسٹی حیدر آباد سے متعلق ہیں، علوم مشرقی اور مغربی دونوں میں مہارت تامہ رکھتے ہیں اور کثیر التصانیف علمی شخصیت ہیں، یوں تو آپ نے کئی زبانوں میں لکھا ہے لیکن زیادہ کتابیں انگریزی میں ہیں۔ اُردو میں آپ کا سرمایہ قلم آپ کے مقالے اور مضامین ہیں جن میں علم کی گیرائی اور فکر کی گہرائی پائی جاتی ہے۔

"شاہ ولی اللہ کے اصول حکمت" "اساسات اخلاقی فاضل" "وحدت دین کا تصور" اور "اسلام اور مرکزیت وغیرہ آپ کے بڑے اہم مضامین ہیں۔ ۱۴؎

حبیب اللہ بھٹو

آپ یکم نومبر ۱۹۱۷ء کو بمقام شکارپور پیدا ہوئے۔ نصابی تعلیم صرف انٹر تک حاصل کر سکے اور تعلیمات سے وابستہ ہو گئے، سندھی اور اُردو دونوں کے مصنف ہیں۔ سندھی میں کئی کتابیں آپ کی تصنیف میں ہیں جن میں اقوال دانش، مشہور مستشرقین وغیرہ شامل ہیں۔ اُردو میں مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع ہی سے ہے جو حریت، آہنگ،

۱۳؎ بحوالہ "سندھ کے اُردو نثر نگار" مقالہ ڈاکٹر منہاج الدین برائے پی ایچ ڈی

۱۴؎ بحوالہ سندھ کے اُردو نثر نگار "مقالہ ڈاکٹر منہاج الدین برائے پی ایچ ڈی

ماہ نو، تجلی اور نئی روشنی میں شائع ہوتے رہے ہیں ۔ [۱۵]

ڈاکٹر آصف جاہ کاروانی

(حصہ نظم سے پیوستہ) آپ کی اُردو نثر نگاری کا آغاز الہ آباد کے زمانہ قیام سے ہوا۔ اس کے بعد اکثر تحقیقی مضامین لکھتے رہے۔ بہت کم لکھتے ہیں مگر جو کچھ لکھتے ہیں وہ ٹھوس اور مدلل بنیادوں پر۔

مرزا محمد افضل بیگ

آپ سندھ کے شہرہ آفاق ادیب مرزا قلیچ بیگ کے بیٹے ہیں، ۲۵ مئی ۱۹۱۸ء کو بمقام قلیچ آباد (ٹنڈو ٹھورو) پیدا ہوئے۔ علمی ماحول میں پرورش پائی۔ انگریزی، فارسی، سندھی اور اُردو سے اچھی طرح واقف ہیں لیکن شروع ہی سے مسلک تصوف سے وابستہ ہوجانے کے باعث اعلیٰ نصابی تعلیم حاصل نہ کرسکے۔

آپ کا مقصد حیات تبلیغ دین، رشد و ہدایت اور درس و تدریس ہے لیکن لکھنے لکھانے کا شغل بھی موروثی طور پر جاری ہے۔ آپ کو تحریر سے زیادہ تقریر سے دلچسپی ہے۔ مذہبی تقریروں میں اکثر خود اپنے ہی شعر پڑھتے رہتے ہیں جو عموماً دوسری زبانوں کے اشعار کا ترجمہ ہوتے ہیں۔ خطبات کا ایک مجموعہ افضل الخطبات کے نام سے شائع ہو چکا ہے جو اگرچہ مذہبی نوعیت کا ہے لیکن بہر حال مرزا قلیچ بیگ کے بیٹے کی زبان ہے۔ اُردو نثر میں اس کی حیثیت ایک موقر اضافے کی ہے۔ [۱۶]

عبدالرزاق راز

(حصہ نظم سے پیوستہ) سندھی میں آپ کی ادبی حیثیت مسلم ہے لیکن اُردو میں

---

[۱۵] بحوالہ خط حبیب اللہ بھٹو بنام مصنف مورخہ ۹ ستمبر ۱۹۷۶ء

[۱۶] "صوفیائے سندھ اور اُردو" از پروفیسر معین الدین دردائی صفحہ ۴۰، مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۷۳ء

بھی آپ کے قلم کی موشگافیوں نے نقش دوام بنا دیے ہیں۔ آپ کے بعض مضامین اور مقالے بہت اہم ہیں جن کی تعداد درجنوں میں ہے۔ "ماروی کے دیس میں" آپ نے سندھ کی لوک کہانیوں کو بڑے دل پسند انداز میں پیش کیا ہے۔ اسی ایک کتاب نے اُردو نثر میں آپ کا مستقل مقام بنا دیا ہے۔

عطا محمد حامی

(حصہ نظم سے پیوستہ) آپ سندھی کے ساتھ اُردو کے بھی پرانے لکھنے والے ہیں۔ بہت سے ادبی اور تحقیقی مضامین آپ کے قلم سے نکل چکے ہیں۔

مولانا غلام محمد گرامی

غلام محمد گرامی کا تعلق لغاری بلوچ شاہانی خاندان سے تھا۔ آپ کی پیدائش ۳۰ ستمبر ۱۹۲۰ء کو میہڑ میں ہوئی۔ راشدی برادران کی طرح آپ کی تعلیم بھی گھر ہی پر ہوئی اور آپ نے سندھی اور فارسی کے ساتھ اُردو میں بھی دستگاہ حاصل کر لی۔

شعر و ادب سے آپ کو فطری دلچسپی تھی لہٰذا ہوش سنبھالتے ہی قلم کے جوہر دکھانے لگے اور سندھی کے مسلم صحافی اور ادیب بن گئے اور مختلف ماہناموں اور اخبارات میں مقالہ نگار، کالم نویس اور ادارت کے فرائض انجام دینے لگے۔ اُردو کے لیے آپ کچھ زیادہ وقت نہ نکال سکے پھر بھی لطیفیات پر جو کام آپ نے اُردو میں کیا ہے وہ بڑی بڑی تصانیف کے ہم ردیف ہے۔ "لطیف کا نظریہ فن"، "لطیف انسان کامل"، "لطیف کا پیغام"، "لطیف کا نظریہ حیات"، "لطیف اور نظریہ وحدت الوجود"، "لطیف اور جدید دور"، "شاہ لطیف شاعرِ حیات"، "لطیف اور روح کے متشابہ اور متخالف پہلو" وغیرہ مقالات مجموعی طور پر کئی کتابوں کا احاطہ کرتے ہیں۔

"اسلامی تاریخ کا تنقیدی مطالعہ" آپ کی ایک اہم تصنیف ہے۔

وسط ستمبر ۱۹۷۶ء کو حیدرآباد میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ [۲۷]

---

[۲۷] "سندھ کے اُردو نثر نگار" مقالہ ڈاکٹر محمد منہاج الدین برائے پی ایچ ڈی

بشیر مخفی

آپ کا پورا نام شاہ بشیر الدین قادری مخفی تھا، شاہ غلام رسول قادری کے بیٹے تھے، ۱۹۲۱ء میں بمقام کراچی پیدا ہوئے۔ آپ شروع ہی سے اپنے نانا سائیں عبدالغنی سے متاثر تھے لہذا گھریلو تعلیم مکمل ہوتے ہی تصوف کے راستے پر آپڑے۔

آپ کی زندگی بڑی سیدھی سادی تھی اور قرآنی تصوف پر عمل پیرا تھے۔ بیشتر وقت رشد و ہدایت میں گزارتے۔ تصنیف و تالیف بھی آپ کا اچھا مشغلہ تھا۔ آخر ۱۹۶۲ء میں خالق حقیقی سے جا ملے۔

بشیر مخفی اردو نظم و نثر دونوں پر قادر تھے۔ عربی و فارسی کے ساتھ انگریزی بھی جانتے تھے مگر لکھا اردو ہی میں اور زیادہ کام نثر میں کیا۔ نظم کا سرمایہ برائے نام ہے۔ اقبال کی خودی اور حافظ کی بے خودی، مقالات مخفی اور عرفان اقبال مطبوعہ کتب ہیں۔ تین مسودے خانقاہ قادریہ کراچی میں محفوظ ہیں۔ بقیہ افادات نوادر، چند جرعات رومی و اقبال، اقبال، تصوف اور اسلام۔

کہا جاتا ہے کہ آپ نے اپنی بعض تصانیف اور مضامین کو تلف کر دیا تھا پھر بھی جو کچھ ہے وہ سلیس و فصیح نثر کا نمونہ ہے۔ ۵۱؎

پیر سید محب اللہ شاہ

پیر محب اللہ شاہ پانچویں پیر جھنڈو ہیں۔ آپ ۲ر اکتوبر ۱۹۲۱ء کو بمقام پیر جھنڈو پیدا ہوئے۔ آپ نے گھریلو تعلیم پر مستزاد سندھ یونیورسٹی سے بی۔ اے۔ پاس کیا پھر ایم۔ اے کی سند حاصل کی۔

آپ کو تعلیمی امور سے بڑی دلچسپی ہے۔ اپنے خرچ پر گاؤں میں علوم مشرقیہ کا

۵۱؎ صوفیائے سندھ اور اردو از پروفیسر معین الدین دردائی صفحہ ۲۰۷ مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۷۳ء

کالج قائم کیا ہے جس میں دوسری زبانوں کے ساتھ اردو کی تعلیم بھی ہوتی ہے۔

پیر صاحب کی زندگی بڑی درویشانہ اور عالمانہ ہے۔ احادیث و تفسیر میں آپ کو بڑا دخل ہے۔ سندھی اور اردو دونوں زبانوں پر قدرت حاصل ہے، دونوں میں بڑی روانی سے لکھتے ہیں۔

اردو میں آپ کا ایک خطبہ ۱۹۶۷ء میں لاہور سے شائع ہوا تھا۔ ایک مقالہ "پردہ اور اسلام" کے عنوان سے لاہور سے چھپا تھا۔ ان مضامین کی تحریر بڑی رواں اور پر مغز ہے۔ اردو میں کم لکھتے ہیں مگر کبھی کبھی لکھتے ضرور ہیں۔ [۱۹]

رشید احمد لاشاری

(حصۂ نظم سے پیوستہ) آپ کو سندھ میں اردو کا مجاہد کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ ساری زندگی سندھی کے دوش بدوش اردو میں بھی لکھتے رہے اور نثر کی مختلف اصناف پر قلم اٹھایا۔ مضامین کی کافی تعداد اخبارات و رسائل میں پھیلی ہوئی ہے۔ "معلم اردو"، "اردو اصول"، "سندھی اردو گائڈ"، "اردو اور وادی سندھ کی زبان"، "روح لطیف"، "ادب کی آڑ میں"، "سوانح سچل سرمست"، "پاکستان میں اردو قاعدہ" وغیرہ آپ کی نمایاں تخلیقات میں ہیں۔

ڈاکٹر نبی بخش قاضی

نبی بخش قاضی کا مولد روہڑی ہے۔ آپ نے اپنی عملی زندگی کا آغاز سندھ مسلم کالج کراچی میں عربی اور فارسی کے لکچرر کی حیثیت سے کیا پھر سندھ یونیورسٹی سے متعلق ہو گئے اور بحالت موجودہ مرکزی محکمۂ تعلیمات میں اہم خدمات انجام دے رہے ہیں۔

---

[۱۹] "صوفیائے سندھ اور اردو" از پروفیسر معین الدین درانی صفحہ ۲۸۔ مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۶۳ء

آپ فارسی، سندھی، انگریزی اور اردو کے عالم ہیں اور موخر الذکر ہر سہ زبان میں آپ کی تصانیف موجود ہیں۔ اردو میں آپ کا سرمایہ قلم صرف مقالات اور مضامین ہیں لیکن ان میں سے "غالب کی فارسی شاعری" اور "اقبال اور نژادِ نو" وغیرہ ایسے مقالے ہیں جو بعض کتابوں پر بھاری پڑیں گے۔ [۲۰]

محمد علم الدین علمی قادری

(حصۂ نظم سے پیوستہ) آپ اردو کے اچھے نثر نگار ہیں۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں قادری نامہ، تحفۂ علمی اور نغمۂ نور چھپ چکی ہیں۔ قدم النبی، جہادِ اصغر، بہشتی جہیز اور نومسلمہ زیرِ طبع ہیں۔ لکھنے کا سلسلہ جاری ہے اور اپنے موضوع پر آپ کی ذات سے امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

ابی محمد سید بدیع الدین شاہ

آپ موجودہ پیر جھنڈو کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ۱۰ رجولائی سنہ ۱۹۲۴ء کو بمقام پیر جھنڈو پیدا ہوئے۔ آپ ایک فاضل مشرقیات ہیں، زیادہ وقت مذہبی مشاغل اور تصنیف و تالیف میں گزرتا ہے۔

آپ ایک درویش باعمل ہیں، رشد و ہدایت پر ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ لکھنا لکھانا محبوب شغل ہے۔ سندھی کے علاوہ اردو پر بھی دستگاہ رکھتے ہیں۔ اردو میں آپ کے تین رسالے مطبوعہ ہیں جو فقہی مسائل سے متعلق ہیں۔ کئی کتابیں مسودات کی شکل میں تیار ہیں۔ توقع کی جاسکتی ہے کہ زیرِ طبع مواد میں اضافہ ہوتا رہے گا۔

آپ کے مضامین کبھی کبھی اخبارات میں بھی چھپتے رہتے ہیں جو ان پر مستزاد ہیں۔ پیر صاحب کی اردو شگفتہ اور ادبی ہوتی ہے۔ [۲۱]

---

[۲۰] "سندھ کے اردو نثر نگار" مقالہ ڈاکٹر محمد منہاج الدین برائے پی ایچ ڈی

[۲۱] "صوفیائے سندھ اور اردو" از پروفیسر معین الدین دردائی صفحہ ۲۹۲ مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی سنہ ۱۹۶۳ء

مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی

آپ ۲۴ ؍جون ۱۹۲۴ء کو رئیس جو گوٹھ ضلع لاڑکانہ میں پیدا ہوئے۔ آپ ابھی دو سال کے تھے کہ آپ کے والد ماجد حافظ محمود کا انتقال ہو گیا۔ تعلیم کا تکملہ آپ نے دارالعلوم تنبیر میں کیا پھر دیوبند چلے گئے۔

آپ مولانا عبیداللہ سندھی کے علم اور شاہ ولی اللہ کی تعلیمات سے بہت متاثر ہیں اور ان کو عام کرنے میں کوشاں ہیں۔ عربی، فارسی، سندھی اور اردو ہر زبان میں لکھتے ہیں اور ماہنامہ "الرحیم" کے مستقل ایڈیٹر ہیں۔ آپ کے مقالات اور مضامین اردو کے موقر جریدوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ آپ کو دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمے کرنے کا بڑا ملکہ ہے اور اس سلسلے میں آپ نے بڑا کام کیا ہے۔ آپ کی اردو نثر سلیس اور شگفتہ ہوتی ہے اور خالص علمی مباحث میں بھی لطفِ زبان باقی رہتا ہے۔ [۲۲]

مرزا عباس علی بیگ

(حصۂ نظم سے پیوستہ) عباس علی بیگ سندھی کے ساتھ ساتھ اردو کے نثر نگار بھی ہیں۔ آپ کے مضامین ماہ نو اور اخبار شیعہ میں شائع ہوتے ہیں۔ ایک بہت اچھا مقالہ رسالہ الشہید کراچی میں شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا "سندھ میں تالپور خاندان کی اہل بیت سے محبت"۔

محمودہ رضویہ

محمودہ رضویہ کے والد حافظ شریف حسین کراچی کے ایک ذی علم اور مذہبی

---

[۲۲] "صوفیائے سندھ اور اردو" از پروفیسر معین الدین دردائی صفحہ ۴۳ مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۶۳ء

بزرگ تھے جس کا اثر محمودہ کے ذہن و دماغ پر پڑا اور آپ ایم۔ اے کر لینے کے باوجود عربی اور فارسی سے بھی بہرہ ور ہوئیں۔

آپ کا شمار ان خواتین میں ہے۔ علم و ادب جنکی گھٹی میں پڑا ہوتا ہے اور شاید یہی سبب ہے جو اوائل عمر ہی میں آپ اردو کی کئی کتابوں کی مصنفہ بن چکی تھیں۔ بیسویں صدی عیسوی کی چوتھی دہائی سے کراچی کی ادبی سرگرمیاں آپ کی رہین منت رہیں اور مجلہ شارع ادب کی ادارت میں آپ کا نام درخشاں رہا۔

اب ایک عرصہ سے آپ گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہی ہیں لیکن اُردو ادب میں آپ کے افسانوی مجموعے سوز و ساز، مشک عود، ہست و بود اور نمود دراز کے نام باقی ہیں اور ادبی کتب کی فہرست میں دردانہ، لالہ زار، ارمغان، کہکشاں، آبشار، ذرات، نامہ تہدید، شمس باز غہ اور وطن پرست وغیرہ موجود رہیں گے۔ بچوں کے لیے بھی آپ نے بہت سی کتابیں تحریر فرمائی ہیں۔ [۲۲]

لطف علی شاہ منظور نقوی

(حصہ نظم سے پیوستہ) نظم کے ساتھ آپ کو اُردو نثر نگاری کا بھی ذوق ہے، فیچر، کہانیاں، ڈرامے، تاریخی اور تحقیقی مضامین آپ کا سرمایہ نثر ہیں۔ "عوامی کہانیوں میں معاشرے کی جھلک" آپ کا وقیع مضمون ہے۔

مولانا محمد سلیمان بگھیو

آپ گوٹھ کارانی ضلع لاڑکانہ میں ماہ جنوری ۱۹۲۴ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی پھر دیوبند سے فضیلت کی سند لی۔ بحالت موجودہ ایس ایم کالج کراچی میں دینیات کے اُستاد ہیں۔ تصنیف و تالیف اور تبلیغ اسلام آپ کے پسندیدہ مشاغل ہیں۔ سندھی اور اردو دونوں میں لکھتے ہیں۔ اردو میں اب تک چار کتابیں

---

[۲۲] "سندھ کے اُردو نثر نگار" مقالہ ڈاکٹر محمد منہاج الدین برائے پی ایچ ڈی

لکھ چکے ہیں۔ تحفۃ الطلباء، المدرس، اسلامک اسٹڈیز اور اردو سندھی بول چال۔[۲۴]

محمد صالح شاہ

آپ ۱۵ر جنوری ۱۹۲۵ء کو گوٹھ امین لاکو تعلقہ ہالا میں پیدا ہوئے۔ سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ کے سبجکٹ اسپشلسٹ ہیں۔ سندھی میں آپ کی ادیبانہ حیثیت مسلم ہے۔ درجنوں کتابوں کے مصنف ہیں۔ اردو سے بھی کماحقہٗ واقف ہیں۔ اردو سے متعلق آپ کی ایک کتاب "سندھی اردو تعلیم" شائع ہوئی ہے۔ دوسری کتاب سوانح پیر رشید الدین زیر طبع ہے[۲۵]

احسان بدوی

احسان احمد، سندھی اور اردو کے مشہور شاعر و ادیب لطف اللہ بدوی کے صاحبزادے تھے، ۱۴ر اپریل ۱۹۲۵ء کو شکارپور میں پیدا ہوئے اور ایم اے کرکے شعبۂ تعلیم سے وابستہ ہو گئے۔ آپ کو بھی اپنے نامور باپ کی طرح ادب سے خاصا لگاؤ تھا اور سندھی اور اردو دونوں میں لکھتے رہتے تھے۔ "سچل سرمست کا اردو کلام" آپ کا ایک موقر مضمون ہے۔ کبھی کبھی آپ اردو میں غزل بھی کہتے تھے لیکن جوانی کی موت نے اس میدان میں پختہ کار نہ ہونے دیا۔[۲۶]

ابن الیاس سومرو

آپ کا اصلی نام محمد لکانو ہے، ۱۵ر اپریل ۱۹۲۵ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے بحالت موجودہ حیدرآباد کے ایک اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہیں۔ سندھی نثر لکھتے ہیں۔ اردو سے بھی دلچسپی ہے۔ نئی اردو سندھی لغت کے مرتب ہیں۔[۲۷]

کریم بخش خالد

آپ ۱۵ر دسمبر ۱۹۲۸ء کو گڑھی یٰسین میں پیدا ہوئے۔ بحالت موجودہ سکھر کے

---

[۲۴] بحوالہ تحریر مصنف [۲۵] بحوالہ بیان مصنف [۲۶] بحوالہ خط غلام محمد بدوی بنام مصنف مورخہ ۱۴ر ستمبر ۱۹۶۷ء

[۲۷] سندھی ٹیکنکل جی ڈائرکٹری صفحہ ۲۵ مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ آف سندھیالوجی حیدرآباد ۱۹۷۴ء

ڈاکٹر اطلاعات ہیں۔ سندھی کے بڑے نثر نگار ہیں۔ اُردو اور انگریزی میں بھی خامہ فرسائی کرتے رہتے ہیں۔ کئی اُردو کتابوں کو سندھی میں منتقل کر چکے ہیں۔ مختلف زبانوں میں ترجمے پر آپ کو پوری دسترس حاصل ہے۔ لطیفیات میں سندھی، انگریزی اور اُردو تینوں زبانوں میں آپ کی کتابیں موجود ہیں۔ سچل سرمست کی شخصیت پر بھی آپ نے سندھی اور اُردو میں علیحدہ علیحدہ لکھا ہے اور پیام لطیف کو بھی آپ نے سندھی، انگریزی اور اُردو میں منتقل کیا ہے۔ [۲۸]

میر محمد نظامانی

میر محمد نظامانی جنوری ۱۹۲۹ء بمقام بدین پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محمد بخش خاں نے آپ کو اعلیٰ تعلیم دلوائی اور آپ محکمۂ تعلیمات سے وابستہ ہو گئے۔ آج کل سندھ یونیورسٹی سے متعلق ہیں۔ سندھی کے ادیب اور اُردو کے نثر نگار ہیں۔ ریڈیو پاکستان حیدرآباد سے آپ کے ثقافتی، ادبی اور تعلیمی مقالے اکثر نشر ہوتے رہتے ہیں۔ بعض رسائل میں آپ کے اُردو افسانے بھی شائع ہوئے ہیں۔ "محبوبۃ المحمودیہ" آپ کا ایک وقیع ترجمہ ہے جو فارسی سے اُردو میں کیا گیا ہے۔ [۲۹]

ڈاکٹر خواجہ غلام علی الانہ

آپ ۱۵ر مارچ ۱۹۲۰ء کو نزد خواجہ، جاتی میں پیدا ہوئے۔ آپ سندھی، فارسی اور انگریزی کے ساتھ عربی زبان کے بھی ماہر ہیں اور سندھ یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف سندھیالوجی کے صدر ہیں، کئی زبانوں کے عالم ہونے کے ساتھ ساتھ آپ موسیقی پر بھی پوری دستگاہ رکھتے ہیں اور اس لحاظ سے آپ میں ذوق شعری بھی پیدا ہو گیا ہے سندھی میں آپ کی اکیس کتابیں مطبوعہ اور نو غیر مطبوعہ ہیں۔ چالیس بیالیس مضمون

---

[۲۸] بحوالہ تحریر مصنف

[۲۹] "سندھ کے اُردو نثر نگار" مقالہ ڈاکٹر محمد منہاج الدین برائے پی ایچ ڈی

اور مقالے مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اُردو تحریر پر بھی آپ کو کسی حد تک قابو حاصل ہے۔ سندھی معلم آپ کی موقر تصنیف ہے۔ اردو کی کتاب علاقائی ادبیات کا باب دوم آپ ہی کا تحریر کردہ ہے۔ آپ کا ایک مقالہ "شیخ الاسلام کے عہد کا سندھ" کافی اہم ہے۔ [۱۳۰]

نیاز ہمایونی

پورا نام نیاز حسن قائم الدین ہمایونی ہے، ۳۰ راپریل ۱۹۳۰ء کو گوٹھ ہمایوں ضلع سکھر میں پیدا ہوئے۔ فارسی اور طب یونانی کے منتہی ہیں۔ سندھی اور اُردو پر عبور رکھتے ہیں اور ہر دو زبان کے مصنف ہیں۔ فارسی میں ارمغان لطیف اور سندھی میں سندھ جی طبی تاریخ آپ کی تصانیف میں ہیں۔

مرکزی اُردو بورڈ حیدر آباد کے نگراں ہیں۔ اردو میں اکثر لکھتے رہتے ہیں۔ آپ کی ایک کتاب سندھی نامہ زیر طبع ہے۔ [۱۳۱]

منصور ویراگی

دحصہ نظم سے پیوستہ) اردو نثر میں بھی آپ کا ذوق بہت ستھرا ہے۔ اکثر مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ "دو آنسو" آپ کی ایک اچھی تخلیق ہے۔

ڈاکٹر عبد المجید میمن

آپ ۱۹۳۱ء میں ماری تعلقہ سکھر میں پیدا ہوئے۔ سندھی، فارسی، انگریزی اور اُردو کے ماہر ہیں۔ پیشے کے لحاظ سے شاہ عبد اللطیف کالج قنبر کے پرنسپل ہیں اور سندھی کی پچیس تیس کتابوں کے مصنف ہیں جن میں کئی تحقیقی اور اہم کتابیں

---

۱۳۰ بحوالہ تحریر مصنف

۱۳۱ بحوالہ تحریر مصنف

شامل ہیں۔

اُردو میں آپ کی نثر نگاری بیسویں صدی عیسوی کی آخری تین دہائیوں کا احاطہ کرتی ہے۔ اس زبان میں بھی آپ کے مضامین عالمانہ اور محققانہ ہوتے ہیں۔ اُردو نامہ، سہ ماہی اُردو، ماہنامہ استقلال، بلوچی، ماہ نو، بصائر، العلم، الرحیم کون ادبی جریدہ ہے جس میں آپ کا مضمون نہیں چھپا۔ فی الوقت "سندھ کے سہروردی مشائخ" کے عنوان سے ایک بہت طویل مضمون رسالہ الرحیم میں قسط وار شائع ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر میمن جتنے وسیع النظر انسان ہیں، ان کے خیالات میں اتنی ہی کشادگی بھی پائی جاتی ہے جس میں اُردو کی زبان دانی شامل ہو کر مصنف کی طرح تصنیف کو بھی منفرد بنا دیتی ہے۔ [۳۲]

عبدالحلیم جوشؔ

آپ کی ولادت کراچی میں یکم مارچ ۱۹۳۱ء کو ہوئی۔ آپ سندھی اُردو کے مشہور شاعر و ادیب عبداللہ عبد مرحوم کے صاحبزادے ہیں۔ ادبی ذوق ورثے میں پایا ہے۔ حکومت سندھ کے محکمہ اطلاعات میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ سندھی میں آپ کی متعدد تصانیف ہیں۔ شعر بھی کہتے ہیں اور کسی مشاعرے میں آپ کی شرکت مشاعرے کی کامیابی کی ضمانت ہو جاتی ہے۔

اُردو میں بھی کبھی کبھی طبع آزمائی کرتے ہیں اور مضامین تو اکثر لکھتے ہیں۔ محکمہ اطلاعات کے ماہنامہ پیغام کے مدیر اعلیٰ ہیں جو سندھی اور اُردو میں علیحدہ علیحدہ چھپتا ہے۔ [۳۳]

آصف جیلانی

آصف جیلانی اُردو کے مشہور ادیب عبدالواحد سندھی کے صاحبزادے ہیں۔

---

[۳۲] بحوالہ تحریر مصنف

[۳۳] بحوالہ بیان مصنف

آپ کی پیدائش اگرچہ علی گڑھ کی ہے مگر نسلاً آپ سندھی ہیں اور والد محترم کی طرح اُردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں اور اخبار جنگ سے وابستہ ہیں۔ آپ کی تحریر شستہ اور رواں ہوتی ہے اور آپ ملکی سیاست پر بڑی خوبی سے روشنی ڈالتے ہیں۔ [۳۴]

سراج الحق

سراج الحق ۲۴ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو بمقام ٹنڈو جام پیدا ہوئے۔ آپ نے اگرچہ ایم اے کے ساتھ ساتھ ایل ایل بی کیا ہے لیکن پیشہ صحافت اختیار کیا اور بحالت موجودہ سندھی کے مشہور روزنامے ہلال پاکستان کے مدیر ہیں۔

آپ سندھی کی کئی اہم کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سندھی بولی جی تاریخ ایک مستند کتاب ہے۔ اُردو میں آپ کا سرمایۂ قلم مضامین کی حد تک محدود ہے مگر یہ مضامین کافی وقیع ہیں۔ "سندھی زبان عربوں کے عہد میں" ایک تحقیقی مضمون ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے ڈرامے کٹیل پارٹی کا ترجمہ آپ کی قلمکاری کا اچھا نمونہ ہے۔ [۳۵]

غلام احمد بدوی

(حصہ نظم سے پیوستہ) خدمت ادب میں آپ اپنے آباء کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اور سندھی اور اُردو دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں۔ سندھی میں تین کتابیں آپ کی تصنیف ہیں۔ اُردو پر آپ کو اپنے پدر مرحوم کی طرح دسترس حاصل ہے آپ کے کتنے ہی مضامین ملک کے مختلف جرائد میں شائع ہو چکے ہیں جن میں "عرب و سندھ کے تعلقات"، "میر علی نواز علوی سندھ کے اُردو شاعر"، آپ کے کافی وقیع مضامین ہیں۔ "تاریخ ادبیات پاکستان و ہند میں تالپوروں کا دور" آپ کا تحریر کردہ ہے اُردو کی اہم تصانیف میں "حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی اور ان کے معاصر اُردو

---

[۳۴] بحوالہ بیان مولوی عبدالواحد سندھی

[۳۵] بحوالہ تحریر مصنف

شعراء" "تاریخ شکارپور" اور "سندھی زبان کی ارتقائی ترقی" قابل ذکر ہیں۔[۳۵]

شہزادہ گلفام

پورا نام غلام محمد ہے۔ ۱۰ مارچ ۱۹۳۵ء کو ٹکڑ تعلقہ ٹنڈو محمد خاں میں پیدا ہوئے انسٹی ٹیوٹ آف سندھیالوجی، سندھ یونیورسٹی کے فیلو ہیں۔ سندھی کے صحافی، افسانہ نگار اور ادیب ہیں۔ اردو میں بھی لکھتے رہتے ہیں۔ اکثر آپ کے مضامین اور فیچر ہفتہ وار نگار کراچی اور دوسرے جرائد میں شائع ہوتے ہیں۔[۳۶]

امر جلیل

اصلی نام عبدالجلیل ہے۔ ۸ نومبر ۱۹۳۶ء کو سندھ میں پیدا ہوئے۔ ایم اے کر کے صحافت کو بطور پیشہ اختیار کیا۔ آجکل ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہیں۔ سندھی زبان پر آپ کو عبور حاصل ہے۔ اس زبان کے اچھے افسانہ نگار ہیں۔ قومی شاعری پر آپ کی کتاب بہت اہم ہے۔ اردو میں اکثر مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ فی الوقت "کچھ جھوٹ کچھ سچ" کے عنوان سے الفتح میں باقاعدہ لکھ رہے ہیں۔[۳۷]

ظفر حسن شاہ

ظفر حسن گوٹھ قطب شاہ میں ۱۴ اگست ۱۹۳۷ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۱ء میں سندھ یونیورسٹی سے ایم اے کر کے یونیورسٹی ہی میں لکچرر ہو گئے۔ سندھی اور اردو دونوں میں یکساں طور پر لکھتے ہیں۔ نئی قدریں اور دوسرے رسائل میں آپ کے افسانے برابر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ سندھی ادب کی اردو میں منتقلی آپ کا معمول سا بن گیا ہے۔ اردو پر آپ کو پوری قدرت حاصل ہے۔ مضامین اور افسانوں

---

[۳۶] بحوالہ خط بنام مصنف مورخہ ۱۴ ستمبر ۱۹۷۶ء

[۳۷] سندھی لیکھکن جی ڈائرکٹری صفحہ ۱۰۸ مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ آف سندھیالوجی حیدرآباد ۱۹۷۳ء

[۳۸] "سندھ کے اردو نثر نگار" مقالہ ڈاکٹر محمد منہاج الدین برائے پی ایچ ڈی

کی تعداد درجنوں میں شمار کی جاسکتی ہے مگر اردو کی کوئی باقاعدہ کتاب ابتک نہیں لکھی۔[۳۹]

مولانا سلیمان طاہر

آپ ۲۱ دسمبر ۱۹۳۷ء کو گوٹھ ابراہیم سکھر میں پیدا ہوئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد سے تبلیغ اسلام میں مصروف ہیں۔ آپ نے ایک ادارہ "محمد بن قاسم سندھی ادبی سوسائٹی" بھی قائم کیا ہے۔ آپ کے مذہبی مضامین تعلیم القرآن اور ایشیا وغیرہ میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ سندھی اور اردو دونوں میں لکھتے ہیں۔ آپ کی اردو خاصی عالمانہ ہوتی ہے۔ "اخلاق نبوی" اور "علمائے حق کا مقام" آپ کے موقر مضامین ہیں۔[۴۰]

نگہت پروین

نگہت پروین کی پیدائش ۳۰ نومبر ۱۹۳۸ء کو سکھر میں ہوئی۔ آپ کے والد الطاف حسین شاہ بخاری ایک علمی آدمی تھے جس کا اثر آپ کی تربیت پر پڑا اور آپ شروع ہی سے بچوں کے لیے مضمون اور ڈرامے لکھنے لگیں پھر آہستہ آہستہ جنگ، شمع، بیسویں صدی اور حریم وغیرہ میں آپ کے مضامین شائع ہوئے۔ عملی طور پر آپ صحافی ہیں اور فطری طور پر ادیبہ۔ مسلسل مضامین ہیں "زندگی کے سودے" آپ کی کاوش قلم کا سرمایہ ہیں اور ایک غیر مطبوعہ ناول بھی۔[۴۱]

کریم بخش نظامانی

کریم بخش نظامانی کے والد ٹنڈو سومرو کے ایک ذی عزت آدمی تھے۔ اسی

---

[۳۹] "سندھ کے اردو نثر نگار"، مقالہ ڈاکٹر محمد منہاج الدین برائے پی ایچ ڈی

[۴۰] "سندھ کے اردو نثر نگار"، مقالہ ڈاکٹر محمد منہاج الدین برائے پی ایچ ڈی

[۴۱] "سندھ کے اردو نثر نگار"، مقالہ ڈاکٹر محمد منہاج الدین برائے پی ایچ ڈی

مقام پر ۲۳ مئی ۱۹۳۶ء کو کریم بخش پیدا ہوئے۔ ابتدائے عمر میں خاکسار تحریک میں شامل ہوگئے اور قید و بند کی سختیاں جھیل کر وطن واپس آئے تو ایم اے پاس کیا اور محکمہ تعلیمات سے وابستہ ہوگئے اور ایوب خاں کے دور حکومت میں ملازمت سے برطرف ہوئے تو صحافی بن گئے۔

آپ سندھی کے ادیب بھی ہیں اور ڈرامہ نویس بھی۔ اُردو پر بھی پورا عبور رکھتے ہیں اُردو اور سندھی دونوں میں شعر بھی کہتے ہیں اور نثر بھی لکھتے ہیں۔ اُردو میں آپ نے بہت سے افسانے لکھے ہیں جن میں "عنبر سری ہاتھ"، "لاٹھی ٹوٹ گئی"، "تین کمرے" اور "ہم باپ نہ ہوتے" وغیرہ نے قبول عام حاصل کیا۔ آپ نے ایک ناول "پندرھویں صدی" بھی لکھا ہے اور اپنے سندھی ناول "کامریڈ موصوف کی ڈائری" کا اُردو ترجمہ بھی کیا ہے۔ یہ دونوں ناول زیر طبع ہیں۔ [۲۱]

یوسف شاہین

(حصہ نظم سے پیوستہ) آپ سندھی اور اُردو دونوں میں لکھتے ہیں۔ سندھی میں آپ کی تصنیف ہے "خدا انسان اور جانور"۔ اُردو میں مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ ایک مطبوعہ کتاب "انا الحق" آپ کے نظریات کی ترجمان ہے، دوسری زیر قلم ہے۔

عبدالرزاق شاہد سومرو

عبدالرزاق اپنے آبائی گاؤں بھٹہ گوٹھ سکھر میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۷ء میں سندھ یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور سکھر کے ریویریس اسکول میں ملازمت کرلی۔ اُردو اور سندھی دونوں کے ادیب و شاعر ہیں۔ اُردو میں آپ کے مضامین اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اُردو نثر کی ایک کتاب "ممتاز علمی مضامین" شائع ہو چکی ہے۔ دوسری "حیات بیدل اور ان کی اُردو شاعری" زیر طبع ہے۔ عبدالرزاق ایک روشن خیال

---

[۲۱] "سندھ کے اُردو نثر نگار"، مقالہ ڈاکٹر محمد منہاج الدین برائے پی ایچ ڈی

سندھی نوجوان ہیں اور اہلِ زبان کی طرح اردو لکھتے ہیں۔ [۴۳]

امداد حسینی

امداد علی شاہ ۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو ٹنکڈ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم بی اے آنرز، ایم اے تک ہے۔ سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ حیدر آباد کے سبجکٹ اسپشلسٹ ہیں۔ سندھی کے جانے پہچانے ادیب اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ اردو میں اکثر مضامین لکھتے ہیں اور سندھی سے اردو میں ترجمہ کرتے رہتے ہیں۔ آپ کی زبان شستہ و رواں ہوتی ہے جو اردو پر پوری قدرت کی نشاندہی کرتی ہے۔ [۴۴]

تاج بلوچ

تاج بلوچ کے والد کا نام نور احمد خاں بلوچ تھا۔ ۲۵ مئی ۱۹۴۰ء کو ضلع سکھر کے کوٹ ٹیلا نامی گاؤں میں آپ کی ولادت ہوئی۔ نصابی تعلیم بی اے تک حاصل کی۔ لکھنے لکھانے کا سلسلہ زمانہ طالب علمی ہی سے شروع ہو گیا تھا جو عملی زندگی میں شدت اختیار کر گیا۔

فی الوقت آپ متعدد ادبی انجمنوں کے روحِ رواں ہیں اور ماہنامہ برسات کے ایڈیٹر ہیں۔ سندھی کے اچھے ادیب اور شاعر ہیں۔ تیسری دنیا کے مسائل اور درد کا صحرا آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔ اردو میں سندھی منظومات کے تراجم آپ کا طرۂ امتیاز ہیں۔ اردو میں مضامین بھی لکھتے رہتے ہیں۔ "امن کی تلاش" آپ کی وقیع اردو تصنیف ہے۔ [۴۵]

۴۳۔ "سندھ کے اردو نثر نگار" مقالہ ڈاکٹر محمد منہاج الدین برائے پی ایچ ڈی

۴۴۔ سندھی لیکھکن جی ڈائرکٹری صفحہ ۳ مطبوعہ انسٹیٹیوٹ آف سندھیالوجی حیدر آباد

۴۵۔ بحوالہ بیان مصنف

پنہور سندھی

اصلی نام محمد قاسم پٹ ہے، جنوری ۱۹۴۰ء میں تعلقہ ٹنڈو محمد خاں میں پیدا ہوئے۔ پیشے کے لحاظ سے صحافی ہیں، سندھی کے اچھے ادیب ہیں، کبھی کبھی اُردو میں بھی لکھتے ہیں۔ اُردو میں ایک کتاب "ادب کے نام" ترتیب دی ہے۔[۲۶]

رانا بھگوان داس

(حصّہ نظم سے پیوستہ) آپ کا قلم ہمیشہ سے اُردو کی حمایت میں چلتا رہا ہے۔ اُردو میں ان گنت علمی و تحقیقی مضامین تحریر کر چکے ہیں۔ سوانح امیر خسرو، سوانح صوفی سرمد، مغلیہ نظم و نسق، تاریخ کعبہ، حیات سرور کائنات اور غزوات نبوی آپ کی تصانیف میں ہیں۔

عبدالرشد مینڈھو

آپ ۱۰ر جنوری ۱۹۴۵ء کو گوٹھ نزد خواجہ تعلقہ جاتی میں پیدا ہوئے۔ عربی فارسی کے فارغ التحصیل ہیں۔ انگریزی کی تعلیم انٹرمیڈیٹ حاصل کی ہے۔ تعلیمات سے وابستہ ہیں۔ سندھی کے قابلِ ذکر مصنف ہیں۔ اُردو سے کماحقہٗ واقف ہیں۔ درسیات کے بعض کام اُردو سے متعلق بھی انجام دئے ہیں جن میں "جدید عربی گرامی، سندھی اور اُردو" اور "سلیس اُردو" کی شرح شامل ہے۔[۲۷]

سردار علی شاہ ذاکر

(حصّہ نظم سے پیوستہ) اُردو نثر میں بھی آپ کا ذوق بہت ستھرا ہے۔ اکثر اہم

---

۲۶ سندھی لیکھکن جی ڈائرکٹری صفحہ ۱۴۱ مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ آف سندھیالوجی حیدر آباد ۱۹۷۴ء

۲۷ سندھی لیکھکن جی ڈائرکٹری صفحہ ۸۲ مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ آف سندھیالوجی حیدر آباد ۱۹۷۴ء

اور علمی مسائل پر مضامین لکھتے رہتے ہیں۔

علی محمد مجروح

علی محمد کے والد کا نام خیر محمد تھا۔ آپ ۱۹۵۲ء میں سندھ کے ایک گاؤں سے بھنور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم گھریلو ہے مگر اتنی کہ سندھی کے ادیب اور شاعر ہیں اور اردو میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں۔

ریڈیو اور ٹی وی کے ڈرامے آپ کا سرمایہ تحریر ہیں۔ سندھ کے مشاعروں میں آپ کی حیثیت ہمیشہ ایک مقبول شاعر کی ہوتی ہے۔ اردو میں سندھی سے ترجمہ کرنے میں ملکہ حاصل ہے۔ اردو ڈرامے سندھی ہی کی طرح لکھتے ہیں۔ [۴۵۸]

---

[۴۵۸] بحوالہ بیان مصنف

اردو پر
سندھی زبان وادب کے اثرات

سندھی سے اُردو کا جو رابطہ ہے، اُس پر ابواب ماسبق میں بحث کی جا چکی ہے اور اس کی بنیاد پر یہ نظریہ مسلم ہو جاتا ہے کہ دونوں زبانوں کی جڑیں ماضی بعید میں کسی ایک نقطہ پر جا کر مل جاتی ہیں جو حقیقتاً بہت سی زبانوں کا نقطۂ آغاز تھا۔ سندھ کے عظیم محقق علامہ آئی آئی قاضی نے خود لفظ اردو کے ماخذ کو بھی ہند جرمانی زبان میں ڈھونڈھ نکالا ہے جہاں سے وہ سنسکرت میں آیا اور سنسکرت سے ہندی اور سندھی میں منتقل ہوا[1]

ایک دو نہیں بہت سے لفظ ہیں جو دونوں زبانوں میں مشترک ہیں اور جن کا مخرج ایک ہے اور وہ معنی میں بھی ایک آہنگ رکھتے ہیں۔ ایسے الفاظ بھی ہیں جو توابع کی حیثیت سے آتے ہیں اور عموماً انہیں مہمل سمجھا جاتا ہے حالانکہ سندھی میں وہ بامعنی موضوع الفاظ ہیں اور مستقل حیثیت کے مالک ہیں چند مثالیں یہ ہیں۔

اُردو	سندھی
گورا چٹا	چٹو
بھلا چنگا	چنگو
دن وہاڑے	وہاڑو (قریب المعنیٰ)

"لیکن اُردو میں اس قبیل کے الفاظ کی موجودگی کو سندھی کا اثر قرار دینا محل نظر ہے اس لیے کہ یہ الفاظ سندھی کی طرح پنجابی میں بھی ہیں اور بہت ممکن ہے کہ دوسری زبانوں میں بھی ہوں"[2]

---

[1] خطبۂ صدارت یوم اُردو منعقدہ کراچی بتاریخ ۱۵ دسمبر ۱۹۳۸ء، مترجمہ الیاس عشقی مشمولہ ادبی رابطے لسانی رشتے صفحہ ۱۰ مطبوعہ مجلس ادب حیدر آباد ۱۹۷۶ء

[2] اُردو سندھی کے لسانی روابط از ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی صفحہ ۹۹ مطبوعہ مرکزی اُردو بورڈ لاہور ۱۹۷۰ء

اُردو پر سندھی کے اثر کا آغاز حقیقتاً اس وقت سے ہوتا ہے جب سے سندھی شاعروں نے اُردو میں طبع آزمائی شروع کی۔ اس زمرے میں میر فاضل بکھری سے قیام پاکستان تک کے تمام شاعر آتے ہیں لیکن عملی طور پر اُردو کے جو مراکز تھے وہاں سندھی شعراء کے اشعار پہنچ نہ سکے۔

مغل دور میں تو یہ صورت تھی کہ دلّی سے آنے والے زیادہ، واپس جانے والے کم تھے اور جو واپس جاتے وہ فارسی اشعار کی سوغات لے کر جاتے، اُردو کو کوئی اہمیت نہ تھی۔ کلہوڑہ اور میروں کے عہد میں بھی لگ بھگ یہی حالت رہی اور سندھی شعراء کا اُردو کلام شمالی ہند اور دکن میں منظرِ عام پر نہ آ سکا۔

انگریزوں کی پالیسی تو شروع ہی سے یہ تھی کہ سندھ باقی ہندوستان سے سیاسی، ثقافتی اور لسانی، ہر اعتبار سے کٹ جائے اس لیے سندھ کے چھوٹے موٹے شاعر تو درکنار، عظیم شاعر بھی ہندوستان کے ان حصّوں میں اس طرح معروف نہ ہو سکے جو معروف ہونے کا حق ہے اور اُردو شاعری کے بارے میں تو لوگوں کو معلوم بھی بہت کم ہو سکا ورنہ ابتداء سے لے کر متوسط دور تک سندھی شعراء نے اُردو میں جو سندھی لفظ استعمال کئے تھے، ان میں سے اکثر الفاظ کو اُردو میں جگہ ضرور مل جاتی بالخصوص ان لفظوں کو جو ہندی لفظوں کے قریب المخرج تھے۔

ان دشواریوں کے باوجود بہت سے مقامات پر زبانوں اور ثقافتوں نے ایک دوسرے کو متاثر کیا ہے۔ مثال میں کھانے کی ایک چیز "باقرخانی" ہے جو دلی اور لکھنؤ دونوں جگہ نہ جانے کب سے استعمال ہوتی رہی ہے۔ لفظ کی تحقیق اگر کسی نے کی ہوگی تو منظرِ عام پر نہیں آئی۔ عام خیال یہی کیا جاتا رہا کہ "باقرخان" نام کے کسی رئیس کی ایجاد ہوگی جو اس کے نام سے مشتق ہو کر موسوم ہوگئی لیکن میر علی شیر قانع نے اس کی حقیقت کو بے نقاب کیا ہے، وہ لکھتے ہیں۔

"میر باقر خاں امیر خانی قصبہ بالہ کنڈی کے رہنے والے تھے، بہت جواد، مجتہد اور مہمان نواز تھے، "نان باقرخانی" اور "کوزہ باقرخانی" انہیں

کی مخترعات ہیں۔"[۳]

باقرخاں کے جد اعلیٰ امیر خاں کا زمانہ گیارھویں صدی ہجری کے اوائل کا ہے اور میر علی شیر قانع کا انتقال ۱۲۰۳ھ میں ہوا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کچھ دشوار نہ ہوگا کہ بارھویں صدی ہجری کے وسط میں سندھ میں نان باقرخانی اور کوزہ باقرخانی کا رواج تھا جن میں سے ایک چیز نان باقرخانی تو دلی پہنچ گئی۔ خیال غالب ہے کہ پہنچا کوزہ بھی ہوگا مگر وہ مقبول عام نہیں ہوا۔ نان کو پسند کیا گیا اور اس کا اتنا رواج ہوا کہ دلی کی ثقافت نے جب لکھنؤ پہنچ کر اپنے قدم جمائے تو سندھ سے مستعار لی ہوئی باقرخانی بھی اس میں شامل تھی جو آج تک دسترخوان کی زینت ہے۔ اس طرح کے اور بھی کتنے ہی لفظ ہوں گے جو آہستہ آہستہ سامنے آتے جائیں گے اور ان سے لسانی اور ثقافتی ارتباط کے حقائق منکشف ہوتے رہیں گے لیکن علاقوں کے بُعد مکانی کے سبب ایسا اختلاط کم ہی ہوا ہوگا۔ زیادہ اختلاط تو مسلمانوں کی جدوجہد آزادی سے ہی شروع ہوا۔ خصوصیت کے ساتھ اس وقت سے، جب سے پاکستان بنا، مہاجروں کی سندھ میں آمد شروع ہوئی اور سندھیوں اور مہاجروں میں ہم کلام ہونے کے مواقع پیدا ہوئے۔ اور یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ

"عوامی میل جول کے بہترین مرکز کوچہ و بازار ہوتے ہیں جہاں دوسرے سودوں کے ساتھ ساتھ زبان کا لین دین بھی ہوتا ہے۔ سندھ کے بازاروں میں اردو سندھی کے جو اثرات قبول کر رہی ہے، ان کی مثالیں اگرچہ ابھی شاذ ہیں اور انھیں ہنوز قبول عام کا درجہ بھی حاصل نہیں ہوا ہے لیکن وہ دن دور نہیں جب وہ گھل مل کر جزو زبان بن جائیں گے۔ مہاجر دوکاندار خصوصاً خوانچہ فروش اور پھیری والے جب گاہکوں کو متوجہ کرنے کے لیے آواز لگاتے ہیں تو فقرہ اردو کا بولتے ہیں مگر چیزوں کے نام وہ سندھی میں لیتے ہیں مثلاً سیب کو صوف، انار کو ڈاڑھوں، امرود کو زیتون، جامن کو

---

[۳] "مقالات الشعراء" صفحہ ۲۹ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد ۱۹۵۷ء

جموں، پیاز کو بصل، لہسن کو ثوم کہہ کر آواز لگاتے ہیں ایسا نہیں کہ وہ سندھی گاہک دیکھ کر یہ الفاظ پکارتے ہوں۔ شہروں میں ان کے مخاطب زیادہ تر اُردو والے ہی ہوتے ہیں۔" ۵۴؎

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی بعض مستعمل الفاظ کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"سندھی زبان کے اثر سے اُردو میں جو الفاظ آرہے ہیں، ان میں تارو، کاک، کینجھر، مینڈھرا، پت، سومرا، تماچی، نوری، کاپڑی، مومل، رانو، بھنبھور، ساہڑا، وغیرہ الفاظ شامل ہیں۔" ۵۵؎

اس سلسلے میں ڈاکٹر اسد اللہ شاہ حسینی کا یہاں تک خیال ہے کہ

"سندھی کا اُردو پر شدت کے ساتھ اثر انداز ہونا انتہائی فطری تھا۔ ایک دوسرے سے لین دین، تعلقات، مذہبی یگانگت اور پھر تحریکِ پاکستان کے گہرے اثرات موجود تھے۔ ان حالات میں زبان کی شدت برقرار رہ بھی نہ سکتی تھی۔ عوام میں سندھی کے بہت سے الفاظ اس طرح عام ہوگئے کہ اب وہ مختلف نظر نہیں آتے اور ان کا مفہوم بہت آسانی کے ساتھ سمجھ میں آجاتا ہے۔"

"سندھی زبان کا ایک لفظ وڈیرہ اُردو اخبارات اور سیاسی تقریروں میں بے حد فراوانی کے ساتھ استعمال ہوتا ہے بلکہ یہ اب اُردو ہی کا ایک لفظ بن کر رہ گیا ہے مثلاً ادب کے وڈیرے یا سیاسی وڈیرے کہنے سے ایک واضح مطلب سامنے آتا ہے۔ اس سے مرکب لفظ وڈیرہ شاہی بھی عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔ روزمرہ کی زبان میں خاص طور سے تجارتی مراکز میں یہ استعمال ہوتا ہے۔ دیہات کے لوگوں کا شہر کے لوگوں سے لین دین ہوتا رہتا ہے۔ اس طرح سندھی اور اُردو کا ایک مکسچر ظہور

۵۴؎ اردو سندھی کے لسانی روابط از ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی صفحہ ۹۹ مطبوعہ مرکزی اُردو بورڈ لاہور سنہ ۱۹۷۰

۵۵؎ مضمون "سندھ اور اُردو" مشمولہ "پاکستان میں اُردو" صفحہ ۱۱۰ مطبوعہ یونیورسٹی بک ایجنسی پشاور سنہ ۱۹۶۵

پذیر ہوا ہے جو کہ ایک فطری امر ہے۔ راقم الحروف نے ایک بیوپاری کو ایک دیہاتی سے یہ کہتے ہوئے سُنا، وٹھنا ہے تو وٹھ نہیں تو جا۔ ظاہر ہے کہ یہ وٹھنا لینا جگہ استعمال کیا گیا ہے۔ اس طرح اور بہت سے الفاظ ہیں۔ کا باڑو یا کا باڑا کرنا وغیرہ وغیرہ۔ اناج اور سبزی کے دلالوں کے ہاں ایک لفظ ہے جو کہ خالص سندھی لفظ ہے جس کا مقصد ہے کسی جنس کی مقررہ رقم کا کچھ حصہ اس کے پہنچانے سے پہلے لے لینا۔ اس کو سندھ میں کا باڑہ کہتے ہیں۔ اس طرح کپاس کی جگہ پھٹی اور گندم کی جگہ کنک عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔"

"اخبارات سندھی کے ہوں یا اُردو کے۔ ان کا مطالعہ کرنے سے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ سندھی اخباروں میں اُردو کے اور اُردو اخباروں میں سندھی کے الفاظ بغیر کسی جھجک کے استعمال ہوتے رہتے ہیں مثلاً کسان کے بجائے ہاری زیادہ استعمال ہوتا ہے اندازہ یہ کیا جا سکتا ہے کہ آئندہ پاکستان کے مختلف علاقوں میں علاقائی زبانوں کے اثرات یا علاقائی زبانوں پر اُردو کے اثرات کی وجہ سے ایک ایسی پاکستانی زبان ظہور پذیر ہو گی جس کو کہا تو اُردو ہی جائے گا لیکن اس میں سندھی، پنجابی، پشتو اور بلوچی کے الفاظ بھی ہوں گے۔"

"سندھی کا لفظ سائیں اُردو میں مختلف معنی رکھتا ہے۔ اس کے معنی فقیر یا درویش کے ہیں لیکن سندھی میں سائیں سیدوں، پیروں اپنے سے بالا افسر یا کسی معزز شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اُردو میں اب اس لفظ کو سندھی کے مخصوص معنی میں استعمال کیا جا رہا ہے اور اس سے اب وہی مخصوص معنی لیے جاتے ہیں جو سندھ میں مروّج ہیں بلکہ اب تو اس لفظ کو اُردو اشعار میں بھی بڑی بے تکلفی سے استعمال کیا جا رہا ہے۔"

۵ ڈھونڈھنے والے پا لیتے ہیں انت سمندر کا سائیں

جس کی ملی نہیں تھاہ کسی سے، دل ہے وہ دریا سائیں ۶

پھر بھی "اُردو پر سندھی کا اثر ابھی گنے چنے چند لفظوں تک محدود ہے، ان کا استعمال بھی عام نہیں۔ کسی شاعر یا ادیب نے کہیں ایک دو مرتبہ استعمال کر دیا ہے اور وہ الفاظ بھی زیادہ تر اسماء و اعلام پر مشتمل ہیں۔ اس نوع کے چند لفظ یہ ہیں، پرین (معشوق)، پیاک (بڑا پینے والا)، کاپڑی (سنیاسی، جوگی)، پت (یقین، بھروسا) سائیں"۔

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی کا خیال ہے کہ

"ابھی اُردو کو سندھی سے بہت کچھ لینا ہے۔ آہستہ آہستہ مہاجرین کا میلان سندھی کی طرف بڑھ رہا ہے اس لیے توقع کی جا سکتی ہے کہ آئندہ اردو پر سندھی کے اثرات میں معتد بہ اضافہ ہو گا۔" ۷

یہ خیال صحیح ہے۔ اس کا اندازہ قیام پاکستان کے بعد کی اُردو شاعری سے لگایا جا سکتا ہے، بالخصوص سندھی نژاد شاعروں کے کلام سے یا سندھی نژاد نثر نگاروں کی تحریروں سے جو بلا ارادہ بعض سندھی لفظ استعمال کر جاتے ہیں اور ربط تحریر میں وہ اُردو ہی کے لفظ معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے لفظوں میں ان الفاظ کی کثرت ہے جو سندھ کی تاریخ یا ثقافت سے متعلق ہیں اور جن کا ترجمہ اُردو میں کسی ایک متبادل لفظ سے نہیں کیا جا سکتا۔ بعض لفظ ایسے بھی ہیں جو سندھ کی روایات سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کو بدلنا ثقافت کا خون کرنے کے برابر ہے لہٰذا انہیں بعینہٖ استعمال کر لیا جاتا ہے اور آہستہ آہستہ وہ قابل فہم بنتے جا رہے ہیں کچھ لفظ اپنے تلفظ کے اعتبار سے سبک اور شیریں ہیں اس لیے وہ بھی روانی میں مستعمل ہو جاتے ہیں مثلاً شیخ ایاز اُردو غزل کی مشنیہ اور غنائی شاعری میں ایک حسین اضافہ کرتے ہیں۔

---

۶ مضمون "اردو پر قدیم سندھی کا اثر" مطبوعہ سندھی ادب نمبر "نئی قدریں" حیدرآباد، جلد ۲ شمارہ ۵-۶، ۱۹۴۳ء

۷ "اردو سندھی کے لسانی روابط"، صفحہ ۹۹، ۱۰۰، مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۷۰ء

اے "پرین"! اس جہان تنہا میں - کون ہے، کس کا یار! واپس آ -

لیکن ایسا استعمال منظوم تراجم میں زیادہ ہوتا ہے جس کا اندازہ شیخ ایاز کے شعری مجموعے بوئے گل نالۂ دل اور کف گل فروش سے کیا جا سکتا ہے اور "شاہ جو رسالو" اور دوسرے تراجم سے بھی -

سندھی زبان کے اکثر لکھنے والے اُردو سے واقف ہی ہیں - اب اُردو کے ادیب و شاعر بھی سندھی کی طرف پوری توجہ کر رہے ہیں - بعض نے تو سندھی ادب پر عبور حاصل کر لیا ہے اور سندھی میں شعر کہنے کے ساتھ ساتھ سندھی کی متاع ادب کو اُردو کا قالب عطا کر رہے ہیں - ابتک جن لوگوں نے سندھی شاعروں کی منتخب تخلیقات کو اُردو میں منتقل کیا ہے، ان میں شیخ ایاز، رشید احمد لاشاری، ابن انشاء، لطف اللہ بدوی، حفیظ ہوشیار پوری، آفاق صدیقی، جمیل نقوی، ماحمر حسین، شہاب رفعت اور رئیس امروہوی وغیرہ پیش پیش ہیں - ان میں سے صرف رشید احمد لاشاری، لطف اللہ بدوی، شیخ ایاز بنیادی طور پر سندھی زبان کے لکھنے والے ہیں - ان کے علاوہ سب اُردو کے شاعر اور ادیب ہیں - شیخ ایاز نے شاہ عبداللطیف کے سارے کلام کا ترجمہ اُردو میں نظم کر دیا ہے - اس کے علاوہ بیدل، سچل اور ساگی وغیرہ کے کلام کو بھی اُردو میں منتقل کیا ہے - حفیظ ہوشیار پوری نے شاہ کے کلام کا ترجمہ بڑی کامیابی سے کیا ہے - مثلاً شاہ عبداللطیف بھٹائی کے آزاد ترجمہ کا کچھ حصہ ملاحظہ فرمایئے -

" دل میں دل کی یاد - تلخی غم میں شاد
ہو نہ سکے غمناک - عاشق زہر پیاک
مہلت درد فراق - اور دل مشتاق
گرد الم سے پاک
عاشق زہر پیاک

ترجمے میں "پیاک" کا لفظ برقرار رکھا گیا ہے جس کے معنی بہت زیادہ پینے والے کے ہیں "" اور کہیں کہیں اُردو شعرا جب علاقائی کہانیوں کو موضوع بناتے ہیں یا لوک

کہانیوں سے تلمیحات اپناتے ہیں تو ان الفاظ کا علاقائی کردار ان کے استعمال کے لیے جواز پیدا کر دیتا ہے مثلاً شیخ عبدالرزاق راز کی ایک نظم "مومل کی بیقراری" کا ترجمہ کرتے ہوئے آفاق صدیقی کو بعض سندھی الفاظ برقرار رکھنے پڑتے ہیں۔

دیکھتی ہے چودھویں کی چاندنی — "کاک" میں بیٹھی شکل اپنے چاند کی
لے چلی مجھکو "لڈولے" کی طرف — پھر وصال یار کی وارفتگی

"کاک" میں ہیں ان غریبوں کے مزار — عشق میں مارے گئے جو شہر یار
دفن ہیں اس خاک میں وہ بیقرار — مرمٹے "مومل" پہ جو پروانہ وار
کہہ رہی ہیں کچھ زبان حال سے — حسرتیں ان تربتوں کی بار بار

آفاق صدیقی ہی نے اپنی ایک نظم میں جس کا عنوان "کیچ کی راہ میں" ہے، پنوں کے فراق میں سسی کی زبانی یوں کہلوایا ہے۔

ے کہاں گیا وہ پنوں پیارا کون مجھے بتلائے — سکھیو اب "بھنبھور" میں مجھکو پل بھر چین نہ آئے
کھینچ رہی ہے میرے من کو کوئی سہانی آس — پنکھ لگیں اور اڑ کر پہنچوں پنوں کے پاس

یہ پربت، یہ کڑی دھوپ اور چٹیل میدان
الجھی الجھی کیچ کی راہیں میں برہن نادان

اس سلسلے میں سب سے زیادہ نمایاں کام جو اردو میں ہوا ہے، وہ شاہ کے رسالے کا اردو میں منظوم ترجمہ ہے جو شیخ ایاز نے کیا ہے۔

ے کچھ ان اونٹوں نے میرا دل دکھایا — کچھ ان کے سار بانوں نے ستایا
کہوں کیا دیوروں کی دشمنی کو — جنہوں نے مجھکو پنوں سے چھڑایا
گیا سورج نے خود چھپ کر اندھیرا — ہوا نے نقش پا اس کا مٹایا
قمر بھی ہو گیا روپوش آخر — پہاڑوں نے بھی میرا غم بڑھایا

ہوا دشمن مرا سارا زمانہ
مصیبت میں نہ کوئی کام آیا

ایسے ترجمے کمیاب ہیں۔ شیخ ایاز کو جہاں ترجمے میں کامیابی ہوئی ہے، وہاں ان کے اشعار پر ترجمے کا گمان نہیں ہوتا اور یہ اس کی بڑی کامیابی ہے۔ اسی طرح ایاز نے سچل سرمست اور سانگی وغیرہ کے کلام کا ترجمہ بھی کامیابی کے ساتھ کیا ہے۔" ۵ے

شعراء کے اس گروہ کی فہرست کافی طویل ہے جس میں تنویر عباسی، ایاز قادری نیاز ہمایونی، شمشیر الحیدری، جمال ابڑو، آغا سلیم، علی محمد مجروح، نسیم احمد، غلام ربانی، رشید بھٹی، عبدالحلیم جوش، اختر انصاری، الیاس عشقی، اذر نایاب، ضیاء الرحمٰن ضیا، غلام رسول بلوچ، دلشاد حسین اختر، انجم رامپوری، مولابخش بھٹو، ڈاکٹر عمر عبدالحق، مثال رضوی، افشاں انجم وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ ان سب نے سندھی کے شعری ادب اور اس کے پرتو سے متاع اردو کے نکھار کو دوبالا کیا ہے۔

منظومات کے بعد سندھی کے نثری اثاثے کا جائزہ لیا جائے تو اس کا گرانقدر حصہ اردو کا جامہ پہن چکا ہے، کچھ تو اس طرح کہ اردو میں اس کے موضوعات پر کتابیں لکھی گئیں اور کچھ تراجم کی شکل میں۔

سندھی مشاہیر کے زندگی نامے بھی اسی تعریف میں آتے ہیں جن میں شاہ لطیف بھٹائیؒ پر تو کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور مضامین کا تو شمار قطار ہی نہیں ہے۔ سخی لال شہباز قلندر، سچل سرمست اور دیگر صوفیائے کرام کے سوانح حیات بھی شائع ہو چکے ہیں اور علیحدہ علیحدہ مضامین بھی جن میں ان کی زندگیوں کے مختلف رخ پیش کئے گئے ہیں۔

سندھی ادب کی تاریخ پر بھی کتاب کی شکل میں اور مضامین کی صورت میں کافی سرمایہ اردو میں منتقل ہو چکا ہے۔ مشہور سیاسی تاریخوں کے تراجم بھی ہو چکے ہیں۔ سندھ کی ثقافت اور روایات کو بھی مختلف نہج سے اردو میں پیش کیا گیا ہے اور شعری ادب پر تو کافی کام ہو چکا ہے۔ اور مسلسل ہو رہا ہے۔ اس قسم کے کاموں میں جن کی توجہ اور مساعی کو خاص طور پر دخل رہا ہے ان میں ڈاکٹر غلام مصطفٰی خاں، پیر حسام الدین، ڈاکٹر

۵ے مضمون "سندھ اور اردو" از ڈاکٹر محمد احسن فاروقی مشمولہ "پاکستان میں اردو" صفحہ ۱۰۹ تا ۱۱۲، یونیورسٹی بک ایجنسی پشاور ۱۹۶۵ء

نبی بخش بلوچ، ڈاکٹر محمد ابراہیم خلیل، طالب المولیٰ، مولانا غلام محمد گرامی، اختر انصاری، پیر علی محمد راشدی، ڈاکٹر اسداللہ شاہ حسینی، مشتاق علی جعفری، عبدالرزاق راز، اختر رضوی شمشیر الحیدری، عبدالواحد سندھی، لطف اللہ بدوی، الیاس عشقی، آفاق صدیقی، مولا بخش بھٹو، ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی، ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی، ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، عبدالحلیم جوش وغیرہ کے نام آتے ہیں۔

پچھلے پند سال سے سندھی اردو کے مشترک ادیبوں میں ایک رجحان یہ پیدا ہو رہا ہے کہ سندھی کی بہترین تخلیقات کو اردو میں پیش کریں۔ یہ ایک نیک فال ہے۔ جمال ابڑو کی کہانی ہیرانی غلام ربانی کی طغیانی، امر جلیل کی ساجن میرا دوست، آغا سلیم کی روشنی کا سفر، نسیم احمد کھرل کی شبنم شبنم کنول کنول، بیگم عبداللہ حِنا کی مِٹھی، ممتاز مہر کی معصوم بچے، نسیم کھرل کی تنویر صبح وغیرہ کے ترجمے نظیر کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ۹ے

"سندھی زبان وادب پر اُردو کے اثرات"

اُردو پر سندھی ادب کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے یہ سوال بھی خود بخود ذہن میں اُبھرتا ہے کہ سندھی زبان وادب کو اُردو نے کس حد تک متاثر کیا ہے؛ بادی النظر میں یہ ایک علیحدہ موضوع ہے لیکن حقیقتاً اس کا تعلق بھی سندھ میں اردو کے نشو و ارتقار سے ہے اور اس کا آغاز آج سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔

"شاہ ہاشم کے متعلق مشہور ہے کہ ان کے پاس شاہ عبداللطیف بھٹائی کے والد شاہ حبیب جایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی مشہور ہے کہ وہ حیدرآباد دکن میں بھی کچھ عرصہ رہے تھے۔ وہ بات بھی اردو میں کرتے اور اشعار بھی اردو میں لکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ انہوں نے شاہ حبیب سے

۹ے ماخوذ از سندھی ادب نمبر مرتبہ اختر انصاری اکبرآبادی، ماہنامہ نئی قدریں، جلد ۲۷، شمارہ ۵، ۶، ۱۹۰۳ء

کہا کہ حبیب سے لطیف کی بو آتی ہے چنانچہ شاہ صاحب نے اپنے بیٹے کا نام شاہ لطیف رکھا۔ شاہ ہاشم مجذوب قسم کے شاعر تھے اور اپنے وقت کے بڑے شاعر شمار کئے جاتے تھے۔ چونکہ شاہ لطیف کا تعلق بھی متعلوی سادات سے تھا اسی وجہ سے مٹیاری میں اس خاندان کے لوگوں کا آنا جانا رہتا تھا اور یہ چیز متعلوی سادات کے شجروں میں پائی جاتی ہے۔" ۱۰ے

اور صرف شاہ ہاشم ہی پر موقوف نہیں، اس زمانے کے اکثر علما اور صوفیا اردو کے عالم ہوتے تھے۔ خود شاہ بھٹائی کے بارے میں بھی بتایا جاتا ہے کہ "عربی، فارسی اور ہندی زبان پر انہیں کامل عبور تھا۔ وہ ان زبانوں کے محاورات اور ضرب الامثال کو سندھی کا لباس پہنا کر کچھ اس طرح استعمال کرتے کہ انہیں قادر الکلام اور صاحب زبان ماننے میں تامل نہیں ہوتا۔ ۱۱ے

شاہ کے کلام میں اکا دکا اردو الفاظ کا تصرف سندھی پر اردو کے اثر کی دلیل ہے اور زمانہ مابعد میں تو اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ سندھ کے مشہور عالم ڈاکٹر محمد ابراہیم خلیل سندھی پر اردو کے تاثر پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"جب لسانی اعتبار سے یہ اصول ناقابل تردید ہے کہ الفاظ بھی سفر کرتے ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اردو زبان کے الفاظ سفر کر کے ہماری زبان میں نہ آتے۔ اردو زبان کا مزاج قریب قریب سندھی زبان سے ملتا جلتا ہے کیونکہ اردو زبان میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ مختلف زبانوں کے لفظوں کو سندھی زبان کی طرح اپنے گھر میں جگہ دے دیتی ہے۔ اسی وجہ سے اردو

۱۰ے مضمون "اردو پر قدیم سندھی کا اثر" از ڈاکٹر اسد اللہ شاہ حسینی، سندھی ادب نمبر صفحہ ۲۵، ماہنامہ نئی قدریں حیدر آباد جلد ۲، شمارہ ۵۔۶ ۱۹۶۳ء

۱۱ے مضمون "شاہ عبد اللطیف بھٹائی" از عبد الواحد سندھی صفحہ ۵، ماہ نو جنوری ۱۹۵۱ء

زبان میں عربی، فارسی، ترکی، ہندی اور سنسکرت کے الفاظ کہیں اصلی صورت میں اور کہیں بہ تبدیلی ہیئت پائے جاتے ہیں اور اُردو چونکہ قبل تقسیم ملک دوسری زبانوں کے مقابلے میں بین الصوبہ جاتی یا مشترک زبان کی حیثیت رکھتی تھی اس لیے اس کا اثر سندھی پر اچھا خاصا پڑا اور اُردو زبان کے بہت سے الفاظ سفر کرکے سرزمین سندھ میں آئے جن کو لوگ یا سطحی نظر رکھنے والے حضرات آج فارسی، عربی، ہندی اور سنسکرت کی طرف منسوب کرتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ایسے الفاظ اُردو ہی سے سفر کرکے سندھ میں آتے رہے ہیں۔

اس کا ثبوت یہ ہے کہ سچل سرمست اور اس سے قبل بھی عبدالحکیم عطا اور اس کا بھتیجا عظیم جو میر تقی میر اور سودا کے معاصر ہیں۔ اگر اُن کی غزلوں کا جائزہ لیا جائے اور آج عبدالحلیم جوش، منظور نقوی، مظفر حسین جوش، عبدالرزاق راز، نور شاہین اور علی محمد مجروح کے کلام پر ایک تحقیقی نظر ڈالی جائے تو یہ فرق صاف نظر آجاتا ہے کہ حقیقت کیا ہے؛ یعنی جن لفظوں کو سطحی نظر رکھنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ عرب، فارس اور ہندوستان سے سفر کرکے آئے ہیں، بالکل غلط ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ایسے تمام الفاظ اُردو زبان سے سفر کرکے سندھ میں آئے۔

شاید یہ کہا جائے کہ ہمارا بیان سندھی کے مقابلے میں اُردو زبان کے لیے زیادہ مفید ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اُردو زبان نے ولی گجراتی سے جوش ملیح آبادی تک بخط مستقیم ارتقائی منزلیں طے کی ہیں، لہٰذا اُردو کی طرح ہم کم سے کم حضرت شاہ بھٹائی سے لیکر آج کے مشاہیر شعراء تک سب کے کلام کا جائزہ لیں تو یہ سندھی زبان کی ارتقائی منزلوں کا خط مستقیم ہوگا۔ اس طرح سندھی زبان کی اصلی شاعری اور سندھی زبان کی عروضی شاعری آج بہت سے ایسے الفاظ سے پٹی پڑی

ہے جو شاہ بھٹائی کے زمانے میں سندھی زبان میں نہیں پائے جاتے تھے مگر آج بنگل کی شاعری ہو یا عروضی شاعری، افسانے ہوں یا ادبی مضامین، ان میں سے ہر ایک میں اُردو زبان کے الفاظ کثرت سے ملیں گے اور اس کے باوجود سندھی اور اُردو دو الگ الگ زبانیں ہیں اور ان دونوں کی خصوصیات بھی الگ الگ ہیں۔

اُردو زبان کا اثر سندھی کی عروضی شاعری پر یہاں تک پڑا ہے کہ اُردو زبان کی مخصوص بحریں اور ردیف قافیہ تک سندھی زبان میں منتقل ہو چکے ہیں بلکہ انتہا یہ ہے کہ غزلوں کے ساتھ ساتھ اُردو والوں کا ترنم بھی سندھی زبان میں غزلوں کے ساتھ منتقل ہو چکا ہے۔ جن لوگوں نے عبدالحلیم جوش، علی محمد مجروح اور منظور نقوی وغیرہ کو مشاعروں میں سندھی غزل ترنم سے پڑھتے دیکھا ہوگا اور ان کی مقبولیت بھی مشاعرے میں دیکھی ہوگی، وہ اس کی تصدیق کریں گے کہ اُردو غزل کا ترنم بھی سندھی غزلوں میں منتقل ہوا ہے۔" [۱۲]

الفاظ کے بعد محاوروں اور ضرب الامثال پر نظر ڈالی جائے تو بہت سی کہاوتیں ایسی ملیں گی جو سندھی میں اُردو سے مستعار لی گئیں جیسے۔

۱۔ آپ گھاتی مہا پاپی
۲۔ ایک پنتھ دو کاج
۳۔ بڑا کھاون بڑا دکھ پاون، چھوٹے کا دکھ درد
۴۔ تم بھی رانی میں بھی رانی، کون بھرے گا پانی
۵۔ ناداں بات کرے دانا قیاس کرے۔ [۱۳]

---

[۱۲] مضمون قومی زبان سے متعلق بعض حقائق "مشمولہ" ادبی رابطے لسانی رشتے" صفحہ ۶۲ مطبوعہ مجلس ادب حیدرآباد ۱۹۶۶ء

[۱۳] سندھی بولی جی تاریخ صفحہ ۱۹۵ از بھیرومل مہرچند اڈوانی مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد ۱۹۶۲ء

محاوروں کی ایک تعداد ہر دو زبان میں مشترک ہے۔ اس کے متعلق کہا نہیں جا سکتا کہ کس زبان سے کس زبان میں آئے لیکن سندھی نظم و نثر کی بعض اصناف اردو سے متاثر ضرور ہوئیں۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بیشتر مذہبی تحریکیں شمالی ہندوستان سے اٹھی تھیں اور اردو ان تحریکوں کی زبان تھی۔ دوسرا سبب یہ بھی ممکن ہے کہ عربی اور فارسی کے بعد بیشتر مذہبی کتب اردو میں تھیں جن کا مطالعہ سندھ میں کثرت سے کیا گیا لہذا اردو کا اثر ناگزیر ہو گیا۔ خاص کر تالپوروں کے زوال کے بعد انگریزی زمانے میں یہ اثرات بڑھ گئے۔

"اس دور میں فارسی کی ہر صنف شاعری میں، خصوصاً غزل، مرثیہ، مثنوی اور رباعی پر طبع آزمائی کی گئی۔ مولانا حالی کی اصلاحی تحریک کے اثرات کے پیش نظر سندھی ادب کا مزاج بھی متاثر ہوا۔ حسن علی آفندی گویا سندھ کے سرسید بن کر ابھرے اور ان کے دست راست مولانا ابوجھو نے مولانا حالی کی مسدس سے مستفیض ہو کر سندھی شاعری میں ویسے ہی نظریات سے مسلمان قوم کو جھنجھوڑ کر بیدار کرنے کی سعی کی۔ اکبر کی ظریفانہ شاعری شمس الدین بلبل پر اثر انداز ہوئی جس نے سندھی شاعری میں طنز و مزاح کی شاعری کی بنیاد ڈالی۔ اقبال سے متاثر ہو کر بیوس نے سندھی شاعری میں نئے اسلوب کی بنا رکھی۔ وہ آزادی کے متوالے تھے۔ اس زمانے میں نثری ادب کی بڑی خدمت ہوئی۔ مرزا قلیچ بیگ اس نئے ادب کے سربراہ تھے۔ نند یرام، پرمھیدرس، غلام علی، صادق علی وغیرہ نے سندھی نثر کو مالا مال کیا۔" [۱۲]

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی سندھی پر اردو اثرات کے اسباب بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

"فارسی کے زوال کے بعد مسلم ہندوستان کی ملی تنظیم اور قومی شیرازہ بندی کا

---

[۱۲] مضمون "سندھی جدید ادب" از شیخ عبدالرزاق راز مشمولہ "ادبی رابطے لسانی رشتے" مطبوعہ مجلس ادب حیدرآباد سنہ ۱۹۶۷

بار اُردو نے اٹھایا۔ دینی اور مذہبی لٹریچر کی پیداوار نے اس کو پورے ہندوستان میں مسلمانوں کی قومی زبان کا درجہ دے دیا۔

غیر منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کی جداگانہ تنظیم نے جس کا ڈول سر سید نے ڈالا تھا، اردو کی اس حیثیت کو اور نکھارا۔ سندھ اس تحریک کی طرف بڑھنے میں کسی سے پیچھے نہ تھا۔ یہ تحریک چونکہ اُردو زبان میں جاری ہوئی تھی اس لیے قدرتی طور پر سندھ میں اس زبان سے دلچسپی بڑھتی گئی۔ تحریک پاکستان، جس کی واحد نقیب اُردو تھی، اس دلچسپی میں روزافزوں اضافے کا سبب بنی۔ خود سندھ کے اندر اس دوران میں اجتماعی مقاصد کے لیے جس زبان کو استعمال کیا جاتا، وہ اُردو تھی۔ قومی کاموں میں ذریعہ اظہار خیال اُردو کو بنایا جاتا تھا جلسوں میں تقریریں اُردو میں کی جاتی تھیں۔ اُردو لٹریچر سے استفادہ عام تھا۔ مذہبی اور ملی معاملات کے لیے عربی فارسی سیکھنا ہر شخص کے بس کی بات نہ تھی لیکن اُردو بغیر سیکھے ہر شخص پڑھ اور سمجھ سکتا تھا۔ ایک سندھی دوست نے قیام پاکستان سے پہلے سندھ میں اُردو کے فروغ پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا۔ "بچپن میں ہمارے والدین ہندوؤں سے امتیاز کے لیے اُردو بلواتے تھے جس پر یہاں کے ہندو جل کر ہمیں طعنے دیتے کہ اپنی زبان (سندھی) کو چھوڑ کر پرائی زبان بولتے ہو! اور ہم انہیں جواب دیتے کہ اُردو پرائی نہیں ہماری زبان ہے۔"

بہرحال سندھ میں اُردو کتب سے استفادہ برابر جاری رہا جس کے اثرات ہمیں موجودہ سندھی تصانیف میں جابجا ملتے ہیں، تقسیم سے پہلے کی تصانیف میں بھی اور بعد کی تصانیف میں بھی

بیسویں صدی کے اوائل میں اُردو کی بہت سی کتابیں بصورت ترجمہ یا ترجمان سندھی میں منتقل کی گئیں۔

جہاں اُردو کو اس حد تک پذیرائی ہو وہاں کی مقامی بولی پر اس کی اثراندازی محتاجِ بیان نہیں۔ سندھی تصانیف میں کثرت سے ایسے لفظ ملتے ہیں کہ جہاں ان کی ٹھیٹ رنگ سندھی کی شکلیں رائج ہیں، وہاں ان کے دوش بدوش وہ اشکال بھی مروج ہیں جو اُردو کے ساتھ مخصوص ہیں"۔[۱۵]

آگے چل کر ڈاکٹر اصلاحی رقمطراز ہیں۔

"ڈھیرے ڈھیرے ایسے ادیب اور شاعر بھی منظرِ عام پر آرہے ہیں جو بیک وقت دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ دونوں کا حق ادا کرتے ہیں۔ سندھ کے وہ نامور فرزند، جن کی مادری زبان سندھی ہے مگر اُردو میں بھی لکھتے ہیں تعداد میں اتنے ہیں کہ ان کے صرف نام گنائے جا سکتے ہیں۔ ... ———— ان میں سے کئی نام ایسے ہیں کہ ان کی اُردو تخلیقات جدید اُردو ادب کی تاریخ میں اپنی جگہ محفوظ کر چکی ہیں ———"

پیر حسام الدین راشدی کی اُردو تصنیف "سندھی ادب" اُردو خواں حضرات کے لیے نئی چیز ہے۔ ڈاکٹر بلوچ کی ہر دو لغات اُردو سندھی لغت اور سندھی اُردو لغت، اپنی افادیت کے لحاظ سے ایک گرانقدر اضافہ ہے ———" [۱۶]

اِن شہادتوں سے اس حقیقت میں شبہ نہیں رہتا کہ سندھی پر اُردو کے اثرات اٹھارویں صدی سے پڑنا شروع ہو گئے تھے مگر وہ زیادہ واضح نہ تھے۔ انیسویں صدی میں قدرے اضافہ ہوا اور بیسویں صدی میں شدت آگئی۔ جس کا آغاز اُردو کے مذہبی لٹریچر سے ہوا۔ لطف اللہ بدوی نے اس پر ایک اجمالی تبصرہ کیا ہے۔

"جگتیانی کی اس تصنیف کے سترہ سال بعد سندھ کے مشہور عالم اور

---

۱۵ و ۱۶ "اُردو سندھی کے لسانی روابط" از ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی صفحہ ۹۱، ۹۲ مطبوعہ مرکزی اُردو بورڈ لاہور ۱۹۷۰ء

واعظ مولانا عبدالکریم چشتی شکارپوری نے سیرۃ پر ایک مختصر رسالہ سرور کائنات لکھا تھا، میرے خیال میں یہ رسالہ مولوی دہلی کے کسی رسول نمبر کا سندھی ترجمہ تھا۔

"خان بہادر محمد صدیق مرحوم پرنسپل ٹریننگ کالج حیدرآباد کی تصنیف کامل رہنما ہے۔ اس میں حیات طیبہ کے بجائے اسوۂ حسنہ کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ تصنیف رسالۂ اسوہ حسنہ کے ایک مضمون "امین الرحمٰن مہبط القرآن" کا سندھی ترجمہ ہے۔ رسالۂ اسوہ حسنہ ۱۹۱۴ء میں میرٹھ سے جاری ہوا تھا۔ اور سال ۱۹۱۸ء کے آخر میں بند ہوگیا۔"

"شاہ عرب حاجی حقیر ابن منگن کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب بھی بقول مصنف رسالہ "ایمان" اردو کے رسول نمبر کا ترجمہ ہے۔

پنھنجی جھاتوٹ جو سردار مخدوم امیر احمد پرنسپل اورنٹیل کالج حیدرآباد کی تصنیف ہے۔ مصنف نے کتاب کی تمہید میں یہ قرار کیا ہے کہ اس کتاب کی ترتیب میں علامہ سید سلیمان ندوی کی تصنیف "رحمت عالم" کا بڑا دخل ہے، لکھتے ہیں۔

"مولف اس بات کا کشادہ دلی سے اعتراف کرتا ہے کہ کتاب کی ترتیب اور اکثر واقعات علامہ سید سلیمان ندوی کی تصنیف رحمت عالم سے نقل کئے گئے ہیں۔ اگرچہ یہ رحمت عالم کا لفظی ترجمہ نہیں ہے اور اس میں کئی نئے بابوں کا اضافہ کیا گیا ہے پھر بھی اس کتاب کا رنگ اور ڈھنگ وہی ہے۔"

"نورٌ علی نور" سندھ کے مشہور ادیب اور شاعر دین محمد ادیب کی تصنیف ہے جو اردو کے ایک مصنف اور محقق "مولانا محمد شفیع کی تصنیف سیرۃ خاتم الانبیا کا ترجمہ ہے بلکہ سرتاپا اس کتاب کا ترجمہ ہے۔

مولانا فضل احمد غزنوی حیدرآبادی نے علامہ شبلی کی مشہور تصنیف سیرۃ النبی کی جلد اول کے کچھ حصے کا سندھی ترجمہ شائع کیا تھا لیکن

افسوس کہ یہ حصہ اول بھی ناتمام رہ گیا۔

سندھی زبان میں سیرۃ پر چند کتابیں عموماً ترجمہ ہیں" ۴۷ء

مذہبی کتب سے استفادے کی بات صرف ان ہی کتابوں تک محدود نہیں مولانا اشرف علی تھانوی اور دوسرے اکابر علماء کی کتابیں برابر سندھی میں منتقل ہو رہی ہیں اور بنظر غائر دیکھا جائے تو مذہبیات سے آگے بڑھ کر پورا سندھی ادب اور اس کا ہر شعبہ اردو سے متاثر ہو رہا ہے اور اب تو اردو کے مشہور ناول بھی سندھی میں ترجمہ ہو رہے ہیں جیسے مولوی نذیر احمد کا مراۃ العروس —— اور اردو شاعری نے تو سندھی شاعری پر اتنے گہرے اثرات مترتب کئے ہیں کہ اس کی بعض اصناف بالکل اردو جیسی معلوم ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر احسن فاروقی لکھتے ہیں۔

"اردو غزل کے کلاسیکی انداز میں مرزا قلیچ بیگ اور محمد بخش کا کلام بہت صاف ستھرا ہے اور اس روایت کو شیخ محمد ابراہیم خلیل، عبداللہ خواب، سرور علی سرور اور سرشار عقیلی نے برقرار رکھا ہے۔ آج بھی غزل جدید سندھی شاعری کی مقبول ترین صنف ہے اور غلام محمد گرامی، ایاز، شمشیر الحیدری، عبدالحلیم جوش، رشید لاشاری، علی محمد مجروح اور تنویر عباسی کی غزل جدید اردو غزل کا ساتھ دے رہی ہے۔ سندھی شاعروں نے اردو کی تمام قدیم و جدید اصناف کو اپنایا ہے اور سندھی شاعری اردو شاعری کے ساتھ چل رہی ہے۔

نثر میں افسانہ، مقالہ، مضمون اور ناول وقت کا ساتھ دے رہے ہیں اور چونکہ علاقائی زبانوں اور اردو کے لکھنے والوں کے سامنے ایک ہی سے مسائل ہیں لہٰذا ان کی تحریریں بھی زیادہ مختلف نہیں البتہ علاقائی اور خاص کر سندھی زبان کے لکھنے والوں کی تحریروں کا ماحول زیادہ تر علاقائی ہے۔ ابڑو، غلام ربانی، سراج الحق اور شیخ عبدالرزاق رازی کی

۴۷ء مضمون "سندھی میں کتب سیر" صفحہ ۲۳ ماہ نو کراچی ۱۹۶۰ء جلد ۱۲ شمارہ ۶

افسوس کہ یہ حصہ اول بھی نا تمام رہ گیا۔

سندھی زبان میں سیرۃ پر چند کتابیں عموماً ترجمہ ہیں" [۱۵]

مذہبی کتب سے استفادے کی بات صرف ان ہی کتابوں تک محدود نہیں مولانا اشرف علی تھانوی اور دوسرے اکابر علماء کی کتابیں برابر سندھی میں منتقل ہو رہی ہیں اور بنظر غائر دیکھا جائے تو مذہبیات سے آگے بڑھ کر پورا سندھی ادب اور اس کا ہر شعبہ اردو سے متاثر ہو رہا ہے اور اب تو اردو کے مشہور ناول بھی سندھی میں ترجمہ ہو رہے ہیں جیسے مولوی نذیر احمد کا مراۃ العروس —— اور اردو شاعری نے تو سندھی شاعری پر اتنے گہرے اثرات مترتب کئے ہیں کہ اس کی بعض اصناف بالکل اردو جیسی معلوم ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر احسن فاروقی لکھتے ہیں۔

"اردو غزل کے کلاسیکی انداز میں مرزا قلیچ بیگ اور محمد بخش کا کلام بہت صاف ستھرا ہے اور اس روایت کو شیخ محمد ابراہیم خلیل، عبداللہ خواب، سرور علی سرور اور سرشار عقیلی نے برقرار رکھا ہے۔ آج بھی غزل جدید سندھی شاعری کی مقبول ترین صنف ہے اور غلام محمد گرامی، ایاز، شمشیر الحیدری، عبدالحلیم جوش، رشید لاشاری، علی محمد مجروح اور تنویر عباسی کی غزل جدید اردو غزل کا ساتھ دے رہی ہے۔ سندھی شاعروں نے اردو کی تمام قدیم و جدید اصناف کو اپنایا ہے اور سندھی شاعری اردو شاعری کے ساتھ چل رہی ہے۔

نثر میں افسانہ، مقالہ، مضمون اور ناول وقت کا ساتھ دے رہے ہیں اور چونکہ علاقائی زبانوں اور اردو کے لکھنے والوں کے سامنے ایک ہی سے مسائل ہیں لہٰذا ان کی تحریریں بھی زیادہ مختلف نہیں البتہ علاقائی اور خاص کر سندھی زبان کے لکھنے والوں کی تحریروں کا ماحول زیادہ تر علاقائی ہے۔ ابڑو، غلام ربانی، سراج الحق اور شیخ عبدالرزاق راز کی

---

[۱۵] مضمون "سندھی میں کتب سیر" صفحہ ۲۳ ماہ نو کراچی ۱۹۶۰ء جلد ۱۲ شمارہ ۶

تحریریں اُردو کے لکھنے والوں سے کسی طرح مختلف نہیں ہیں یہی حال تنقید کا ہے۔ دوسری زبان سے ترجمے بھی برابر کیے جا رہے ہیں۔ چونکہ سندھی زبان کے اکثر لکھنے والے اُردو زبان سے بھی پوری طرح واقف ہیں اس لیے انہیں اُردو سے استفادے کے زیادہ مواقع حاصل ہیں۔"[شالہ]

اس طرح کا اثر سندھی ادب کے ہر شعبے میں ہوا ہے جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ نثر و نظم کوئی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ نثری ادب میں کتب سیر کو چھوڑ کر دیکھا جائے تو

"سندھی نثر میں ناول نگاری کا آغاز ڈاکٹر جانسن کے انگریزی ناول راسیلاس سے ہوا ــــــ کسی من گھڑت خیال پر کہانی لکھنے کا پہلا شرف مرزا قلیچ بیگ کو حاصل ہوا۔ انہوں نے دلارام اور زینت نام کے دو ناول تحریر کیے۔ مرزا صاحب کی قریباً دو سو ناولوں میں سے ان دو کے علاوہ باقی تمام ترجمے ہیں۔ کچھ نقادوں کے خیال میں ان دو میں سے پہلا ناول تو پہلی بار لکھا گیا ہے لیکن دوسرے ناول زینت کا پہلا حصہ اُردو ناول صحت النساء سے ماخوذ ہے۔ اس کے برعکس کچھ ناقدین کی رائے میں پہلا ناول، جس میں شاہانہ جنگوں کا ذکر ہے، اُردو سے لیا گیا ہے ــــ

گو سندھی ناول کی بنیاد کچھ مخصوص مصلحتوں پر رکھی گئی تھی لیکن جوں جوں اس کے قارئین کا دائرہ وسیع ہوتا گیا، ویسے ہی ناول کے موضوعات میں بھی وسعت آتی چلی گئی۔ ۱۸۸۵ء میں شکار پور میں مسٹر لوکرداس اور ۱۸۸۵ء میں سکھر میں ماسٹر ہری سنگھ کے کتب خانے سے بہت سے مافوق الفطرت قسم کے قصے کہانیاں چھپنے لگے جن میں انسانی معاشقوں کے ساتھ ساتھ جن، بھوت، دیو اور پری وغیرہ کا ذکر بھی آنے لگا۔ یہ ناول عموماً مقفیٰ نثری عبارت میں لکھے گئے۔ ان میں مندرجہ ذیل قابلِ ذکر

شالہ مضمون "سندھی اور اُردو" از ڈاکٹر احسن فاروقی مشمولہ "پاکستان میں اُردو" صفحہ ۱۰۹ مطبوعہ یونیورسٹی بک ایجنسی پشاور ۱۹۶۵ء

ہیں :-

ممتاز و مساز (اُردو سے) ۱۸۹۰ احمد خاں جلبانی

چار درویش (اُردو سے) ۱۹۰۹ احمد خاں جلبانی

حاتم طائی کا قصہ (اُردو سے) ۱۸۹۰ احمد خاں جلبانی

الف لیلہ کے اُردو ترجمے سے ۱۸۹۴ احمد خاں جلبانی

گل خنداں (اُردو سے) لطف اللہ اخوند ۱۹ ویں صدی کے آخر میں۔[۹۱]

ڈاکٹر داؤد پوتہ نے گل خنداں کو "فسانہ عجائب" کا ترجمہ قرار دیا ہے۔[۹۲]

ناولوں کی سی صورت حال ڈرامہ کی بھی ہے۔ انیسویں صدی کے درمیان پیشہ ور تھیٹریکل کمپنیاں مثلاً وکٹوریہ، الفریڈ، گیٹی، کھاٹاپو، والکانیر اور دیسی کمپنیاں (سندھ) آنی شروع ہو گئیں ــــ جنہوں نے ڈرامے کے لیے عوام میں بڑا شوق پیدا کیا جس کا اثر سندھ کے عوام پر ہوا جنہوں نے پہلے ہندی اُردو میں ڈرامہ کمپنیاں شروع کیں۔ اور اکثر اندر سبھا، آغا حشر اور ماسٹر رحمت کے لکھے ہوئے ڈرامے اسٹیج کرتی تھیں ــــ

سندھی ڈرامے کی ابتداء مرزا قلیچ بیگ نے کی ــــ انہوں نے ۱۸۸۰ء میں لیلیٰ مجنوں دو بہوں میں، ۱۸۸۵ء میں خورشید جو ایک گجراتی ڈرامہ سے ماخوذ تھا۔ ۱۸۹۴ء میں بکاؤلی، ۱۸۹۶ء میں تاریخی ڈرامہ نورجہاں جہانگیر اور ۱۸۹۷ء میں نادر شاہ لکھے۔

چوتھی ڈرامہ کمپنی کی لاڑکانہ میں چانڈکا امیچور ڈرامیٹک سوسائٹی کے نام سے بنیاد پڑی ــــ پہلا ڈرامہ آغا حشر کاشمیری کے اُردو ڈرامے خوبصورت بلا کا ترجمہ تھا اور ۱۹۰۷ء میں اسٹیج کیا گیا۔

۱۹۱۲ء کے قریب حیدر آباد امیچور ڈرامیٹک سوسائٹی کا آغاز ہوا جس کے

---

۹۱ ماخوذ از سندھی نثر جی تاریخ مؤلفہ منگھارام ملکانی مشمولہ سندھی ادب نمبر صفحہ ۱۴۰، نئی قدریں حیدر آباد ۱۹۶۳ء جلد ۲، شمارہ ۵-۶ بعنوان "سندھی ناول نگاری کا ابتدائی دور"

۹۲ مضمون "سندھی نثر" مشمولہ سندھی ادب نمبر صفحہ ۷، نئی قدریں حیدر آباد ۱۹۶۳ء جلد ۲، شمارہ ۵-۶

کے خاص ڈرامہ نویس نانک رام دھرمداس تھے۔ ان کا پہلا ڈرامہ "فریبی فتنہ" تھا جو اُردو سے ترجمہ تھا ـــــ اس کے بعد تیسرا ڈرامہ نیک انجام ۱۹۱۶ء میں اسٹیج کیا گیا یہ ڈرامہ اردو ڈرامہ "خواب ہستی" کا ترجمہ تھا ـــــ آخر میں ۱۹۲۳ء میں "پریم بھگتی" پیش کیا گیا جو آغا حشر کے اُردو ڈرامہ "بلوا منگل" کا ترجمہ تھا۔

قہری قہرماں اُردو ڈرامہ کا ترجمہ "اُوترا" ٹھاکر داس نے کیا تھا۔ ۱۹۲۴ء میں حیدر آباد نیشنل ڈراماٹیک سوسائٹی بنی اور پہلا ڈرامہ موہنی اسٹیج کیا۔ یہ ڈرامہ اُردو کے شریمتی ہنجری ڈرامہ سے ماخوذ تھا۔

سندھی زبان میں ڈراموں کے ترجمے کے معاملے میں مرزا قلیچ بیگ مرحوم سب سے آگے نظر آتے ہیں۔ ان کے چند ڈرامے مندرجہ ذیل ہیں۔

فیروز دل افروز اردو ڈرامہ لیل ونہار کا ترجمہ تھا (۱۹۰۵)

نیکی بدی۔ شیکسپیئر کے کسی ڈرامے سے ماخوذ آغا حشر کے خوبصورت بلا سے لیا گیا (۱۹۱۱ء) ۔ یہ ڈرامہ کشن چند بیوس نے بھی ترجمہ کیا۔

اور "حرص جو شکار" شیکسپیئر کے کنگ جان سے کے اُردو ترجمہ سے ماخوذ تھا۔ بھیرومل مہر چند نے ترجمہ کیا۔" [۱۲]

یہ تھی سندھی میں ڈرامہ کی ابتدا جس پر اُردو کی مہر ثبت ہے۔

اصناف سخن کا تجزیہ کیا جائے تو سب سے پہلا نمبر غزل کا آتا ہے جس پر سطور ماسبق میں روشنی ڈالی جا چکی ہے مگر اس کے سلسلے میں مزید اتنا کہہ دینا بے محل نہ ہوگا کہ سندھی غزل کا آغاز یقیناً فارسی کی تقلید ہوا ہوگا لیکن وہ اپنا دامن کسی طرح اُردو کی بساط شاعری سے بچا نہ سکی۔ ادوار کے لحاظ سے اس کا جائزہ لیا جائے تو اُردو کے متقدمین، متوسطین اور متاخرین سب کی شاعری کا پرتو اس میں نظر آئے گا بحالیہ اثرات کے سلسلے میں شیخ عبدالرزاق کا بیان ہے کہ

---

[۱۲] مضمون "تقسیم سے پہلے سندھی ڈرامہ" ولی رام ولبھ مشمولہ سندھی ادب نمبر صفحہ ۱۳۲ تا ۱۳۵، نئی قدریں حیدر آباد جلد ۲، شمارہ ۵۔ ۶ ۱۹۶۳ء (ماخوذ از سندھی نثر جی تاریخ)

۱۹۳۵ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی گئی۔ اس جماعت کے کارکن اُردو کے نئے لکھنے والوں سے بے حد متاثر تھے۔ سندھ میں اُردو لکھنے پڑھنے کا رواج تقسیم سے بہت پہلے عمل میں آ چکا تھا۔ سندھ کا ہر پڑھا لکھا طبقہ نئے اردو ادب سے متاثر تھا۔ افسانہ میں خصوصاً کرشن چندر، عصمت، منٹو، بیدی اور احمد عباس نوجوان ذہنوں پر چھائے ہوئے تھے۔

پرانے لوگ مولانا شرر، راشد الخیری، مولانا محمد صادق وغیرہ کے مداح تھے اور شاعری میں ذوق، ظفر، داغ اور جگر کے پیرو کار تھے۔ نوجوان طبقہ فراق، جوش، حسرت، فیض، راشد، میرا جی، اختر شیرانی سے بے حد متاثر تھا۔" [۲۲]

سندھی میں مرثیہ کی ابتدا ابیات اور دوہوں سے ہوئی۔ مخدوم عبداللہ ٹھٹوی، سید خیر شاہ، مولوی احمد اور چلن فقیر وغیرہ ابتدائی مرثیہ گو ہیں۔

"سید ثابت علی شاہ پہلا شاعر ہے جس نے مرثیے فارسی کے تتبع پر لکھے ہیں ——— ثابت علی شاہ کا زمانہ وہی ہے جب مسکین کے مرثیے ہند میں لوگوں کی زبان پر تھے۔ ثابت علی نے دو مرثیہ گو شاعروں کا ذکر اپنے کلام میں کیا ہے۔

تنهن تون بيحد مرثيا مسکين مقتل تر بما

تي پيھ جئين مرمتي سکهن لکي دفتر کيا

اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ ثابت علی شاہ نے مسکین اور مقتل کے مرثیوں سے استفادہ کیا ہے ———

ثابت علی شاہ کے بعد خیر پور میرس کے مرزا مراد علی بیگ سائل کے فرزند ارجمند مرزا فتح علی بیگ نے سندھی میں مرثیے لکھنے کا پورا حق ادا کیا۔ مرزا مراد علی

---

[۲۲] مضمون "سندھی جدید ادب" مشمولہ "ادبی رابطے لسانی رشتے" صفحہ ۱۰۱ مطبوعہ مجلس ادب حیدر آباد ۱۹۸۷ء

بیگ۔ سائل خیرپوری ثابت علی شاہ کے شاگرد رشید تھے ــــــ

سید ثابت علی شاہ کے ہم عصر یا ان کے بعد کے مرثیہ گو شاعروں میں سچل سرمست، شاہ نصیر نقشبندی اور عبدالقادر وغیرہ کے نام نامی اور اسم گرامی قابل توجہ ہیں ــــ سچل سرمست کے مراثی ثابت علی شاہ کے مراثی کی صدائے بازگشت ہیں ــــ

مرزا فتح علی بیگ، جن کا ذکر ہم اُوپر کر آئے ہیں، جب خیرپور میرس سے منتقل ہو کر حیدرآباد سندھ پہنچتے ہیں تو میر حسن علی خاں سے مرثیہ خوانی کے سلسلے میں منسلک ہو جاتے ہیں ــــ ان کے ایماء سے میر حسن علی خاں نے سندھی مرثیہ کی طرف توجہ مبذول کی اور خوب مرثیہ لکھا۔ حقیقت میں میر صاحب ہی کے دنوں میں مرثیہ نے ترقی کی اور میر صاحب نے بھی مرثیہ گوئی میں خاصی شہرت حاصل کی۔ میر موصوف کے مراثی تین طریقوں پر نظر آتے ہیں۔ ایک قسم میر صاحب کے طبعزاد مراثی ہیں۔ دوسری قسم وہ ہے جو میر صاحب نے ترجمہ کر کے پیش کی ہے۔ تیسری قسم وہ ہے جو میر صاحب نے دوسروں سے استفادہ کر کے اپنے لفظوں میں پیش کئے ہیں۔

میر حسن علی خاں کے بعد سندھی مرثیہ کو پایۂ تکمیل پر پہنچانے میں خیرپور میرس کے مرزاؤں کا بڑا ہاتھ تھا جو ہز ہائی نس میر نور محمد خاں کے زمانے میں ٹنڈو آغا میں آکر بس گئے تھے ــــ ان کے (فتح علی بیگ) کے چہیتے فرزند مرزا ایڈل بیگ نے مرثیہ کے شہسواران میر انیس اور میرزا دبیر کے مرثیوں کا عمیق مطالعہ کیا اور ان مراثی سے کافی زیادہ استفادہ کر کے سندھی مراثی کو مالا مال کر دیا۔ ان کی مرثیہ گوئی ثابت علی شاہ، سچل سرمست، محمد عالم خیرپوری اور میر حسن علی خاں وغیرہ کے مقابلے میں درجہ کمالیت کو پہنچی ہوئی ہے، مناظر قدرت کی نقاشی، جو میرزا ایڈل بیگ نے کی ہے، دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے اور بیان سے باہر ہے۔ وہی میر انیس اور میرزا دبیر کا رنگ نظر آتا ہے ــــ مرزا ایڈل بیگ کے بعد بہت سے مرثیہ گو نظر آتے ہیں مگر ایسا کوئی مرثیہ گو نہیں ہے جس کو ان کے مقابلے میں پیش

کیا جا سکے "۲۳ے

مرثیے کے علاوہ حالی کی بعض نظمیں اور اقبال کی منظومات بھی سندھی میں منتقل ہو چکی ہیں۔ سندھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے سندھ میں اردو کتابوں کے ترجمے پر ایک مقالہ لکھوایا ہے اس کی رو سے ایسی کتابوں کی تعداد سو سے تجاوز کر جاتی ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں سندھی نثر و نظم پر اردو کے اساسی اثرات مسلم ہو جاتے ہیں اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو نے سندھی سے اگر کچھ لیا ہے تو بہت کچھ دیا بھی ہے اور دونوں کے اندرونی رشتے اتنے مضبوط ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ افعال اور حروف جار کی مغائرت کو دور کر دیا جائے تو دونوں کی تعریف ایک ترازو کے دو پلڑوں کے مرادف ہوگی اور بحالت موجودہ بھی دونوں سندھ کی دو آنکھیں ہیں جن میں سے ایک نہ ہو تو اس سرزمین کا چہرہ بدنما معلوم ہوگا۔

۲۳ے مضمون "سندھی مرثیہ گوئی کی تاریخ" از ڈاکٹر شیخ محمد ابراہیم خلیل مشمولہ سندھی ادب نمبر صفحہ ۱۲۵ تا ۱۲۸ نئی قدریں حیدرآباد جلد ۲، شمارہ ۵-۶ سنہ ۱۹۶۲ء

سندھ میں اردو کا ماضی، حال اور مستقبل

سندھ میں اُردو کے تدریجی ارتقار کا واضح خاکہ دیا چکا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس طرح اُردو ہندوستان کے دوسرے حصّوں میں پیدا ہوئی اور پھیلی، بالکل اسی انداز پر سندھ میں اس کا رواج ہوا۔ ہر چند کہ اُردو اہل سندھ کی ثانوی یا ثالثی زبان تھی اور اُردو کے مراکز بھی سندھ سے دور تھے لہٰذا انہیں وہ شہرت نصیب نہ ہو سکی جو شمالی ہند یا پنجاب کے شاعروں کو میسّر آئی مگر ان کا کلام اگر عہد بعہد لاہور، دلّی اور لکھنؤ پہنچتا رہتا تو عطا ٹھٹھوی، محمود صابر، ابوتراب کامل، ثابت علی شاہ، عظیم ٹھٹھوی، سچل سرمست، فتح علی بیگ، محمد فضل ماتم، غلام محمد گدا، عبدالحسین سانگی وغیرہ کتنے ہی نام ہوتے جن سے مشہور اُردو شعرار کی فہرست میں ایک گرانقدر اضافہ ہو جاتا۔

اب اس کو اتفاق ہی کہنا چاہیئے کہ حالات نے مساعدت نہ کی اور سندھ کے اُردو شاعر گمنامی میں پڑے رہے ——— اور اُردو کی حد تک یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اس بدنصیب زبان کے حصّے میں اوّل دن سے دوستوں کا عناد اور اپنوں کی بے وفائی مُقدر ہوئی تھی۔ شروع میں اس کو فارسی کے مقابلے میں ناقابل اعتنار سمجھا جاتا رہا مگر جب اس پر قبول عامہ کی مہر لگ گئی تو مجبوراً امرار کے درباروں اور روسا کی بارگاہوں میں باریابی کی اجازت ملی اور بالآخر ہندوستان کے قومی اتحاد کا علامیہ قرار دے دیا گیا۔

ہندوستان کی سیاسی تاریخ کے موڑ پر انگریزوں نے اس کو اپنی شاطرانہ

جاہلوں کے لیے تختۂ مشق بنا لیا اور دیوناگری رسم الخط کا شاخسانہ کھڑا کر کے ترقی کی راہ رکاوٹیں پیدا کر دیں۔ سندھ میں سندھی فارسی کی جگہ لے چکی تھی۔ یہاں اُردو کے لیے قدم جمانے کا موقع ہی نہ تھا مگر جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے، مسلسل مخالفتوں کے باوجود اُردو کا کاروان آگے بڑھتا رہا۔ عوامی مزاج اس کا پشت پناہ تھا لہذا اکا دکا امراء کی سرپرستی میں رہ ہمہ گیر بن گئی اور سندھ کے صوفیاء اور اہل علم بھی وقت کے اس ناگزیر تقاضے کو نظر انداز نہ کر سکے۔ ان کی کیا ضرورتیں تھیں اور کن عوامل نے انہیں مجبور کر دیا تھا کہ اس زبان کو اپنائیں؛ اس پر موقع محل سے بحث کی جا چکی ہے۔

اُردو شاعری کا جو ذخیرہ اب تک فراہم ہو سکا ہے، وہی حقیقتاً کل سرمایہ نہیں ہے، آگے بہت کچھ سامنے آئے گا۔

نثر کا سرمایہ، البتہ، کچھ زیادہ نہیں ہے۔ اس کے اسباب بھی تھے کیونکہ انگریزی دور میں سندھ کی عام تعلیمی حالت پست تھی، علم ایک طبقے تک محدود ہو کر رہ گیا تھا، اس میں سے جس کسی نے جو کچھ لکھا وہ فارسی میں، سندھی کی طرف بھی کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی تو اُردو کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا تھا۔

کتابوں کی طرح اخبارات و رسائل کی بھی یہی کیفیت تھی۔ قلب ہندوستان سے سندھ کے رابطے اور اُردو کے تدریجی ارتقاء کے ساتھ نثر نگاری بھی منزل بمنزل آگے بڑھی اور آج ماضی کے کمزور سرے کو حال سے ملا کر دیکھا جائے تو نثر بھی ناقابل ذکر نہیں ہے۔

اس طرح سندھ میں اُردو کے رواج کی قدامت محتاج ثبوت نہیں رہتی اور ابتداء سے لے کر آج تک ہر عہد کے عوام و خواص اس سے آشنا نظر آتے ہیں

دور حاضر کا اطلاق اگر پاکستان کے آغاز سے کیا جائے تو اُردو نظم کی طرح نثر کا دامن بھی بھرا پرا نظر آئے گا، نہ صرف اس لیے کہ تقسیم ملک کے بعد مصنف و کتاب، ادیب و صحافی، ناشران و تاجران کتب، شاعر و نقاد، ہر حلقے کے لوگ ترک وطن کر کے پاکستان پہنچے اور ان کی اکثریت سندھ آ کر آباد ہوئی بلکہ اس لیے بھی کہ اس

عرصہ میں اہل سندھ میں بڑی حد تک اُردو کی مزاج دانی پیدا ہو چکی تھی۔

یوں تو بیسویں صدی عیسوی کا آغاز ہی سندھ میں اُردو کے لیے خوش آئند تھا بالخصوص مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد آزادی ایک فال نیک ثابت ہوئی اور سندھ والے تقریر و تحریر کے ذریعے اس سے مانوس ہوتے رہے پھر خود ان کے قلم نے روانی دکھائی تو سندھیوں میں اُردو کے شاعر، ادیب، صحافی کثرت سے پیدا ہو گئے۔

سطور ماسبق میں حال کے شعرا، ادبا اور اہل صحافت سب کا جائزہ لیا جا چکا ہے لیکن حقیقتاً صرف ان لوگوں کے نام گنائے گئے ہیں جو اُردو ادب میں اپنی جگہ بنا چکے ہیں انھوں نے یقیناً اپنے ذوق کی تسکین کی خاطر لکھا ہوگا تب ہی لکھنے کا حق ادا کیا ہے اور ان میں سے بیشتر کی تحریریں گراں قدر ہیں —— علاقائی ثقافت، لوک کہانیاں، لوک گیت اور وہ تمام چیزیں جو وادی مہران سے مختص ہیں، آہستہ آہستہ اُردو میں آتی جا رہی ہیں اور یہ سب ان شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کو اُردو سے اس طرح مربوط کرتی جا رہی ہیں کہ ان کے نام جزو لاینفک بن جائیں گے۔

پیر حسام الدین راشدی، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، ڈاکٹر محمد ابراہیم خلیل یا شیخ ایاز، اور بعض دوسروں نے اُردو کے خزینۂ ادب میں غیر معمولی اضافہ کیا ہے۔ اضافہ کا محرک بجز ذوق علمی کچھ ہو نہیں سکتا اور تسکین ذوق کی حدود کا تعین ممکن نہیں لہٰذا تحریری اضافے کے اس سلسلے کو لامتناہی سمجھنا چاہیئے اور سندھ کے جن معروف وغیر معروف اہل قلم نے اُردو میں لکھا ہے یا لکھنا شروع کیا ہے، مستقبل کی ہر اُمید ان سے وابستہ کرنا چاہیئے۔

سندھ کی نئی نسل بحالت موجودہ سندھی اور اُردو دونوں میں لکھ رہی ہے جو اُردو، سندھی دونوں کے لیے فال نیک ہے کیونکہ اگر کوئی ادیب یا شاعر کئی زبانوں کا ماہر ہو تو وہ جس زبان میں لکھے گا، دوسری زبانوں کے خیالات اس میں منتقل ہوں گے اور اُس زبان کا سرمایہ گرانقدر ہوتا رہے گا ——

جہاں تک سندھ میں اُردو کے مستقبل کا تعلق ہے، اس کے لیے کوئی حکم

لگانا، کسی سیاسی منجم کا کام ہے۔ میرا ادبی ذہن تو اتنا ہی سوچ سکتا ہے کہ ہماری زبان ایک عوامی سرمایہ ہے جس کا دائرہ اثر برصغیر پاک و ہند تک محدود نہیں، دنیا کے کسی حصے میں بھی چلے جائیں، اُردو سمجھنے والے ضرور ملیں گے۔ ایک ایسی زبان، جو ہندوستان گیر کے بجائے عالمگیر ہو، وہ نہ کسی واحد خطّے کی پشت پناہی سے آگے بڑھ سکتی ہے اور نہ ہی عدم تعاون سے ختم ہو سکتی ہے۔

پھر سندھ جہاں سے اس کا پیدائشی یا پیدائش سے قبل کا رشتہ ہے، وہاں اس کے مستقبل کے بارے میں شک کرنا بھی کفر ہوگا۔

بحالت موجودہ سندھ کا پاکستان کے دوسرے حصّوں سے موازنہ کیا جائے تو یقیناً سندھ پنجاب کے مقابلے میں ٹھہر نہ سکے گا لیکن صوبہ سرحد اور بلوچستان سے ہر نہج اس کو تفوق حاصل ہوگا۔

اس موازنے میں ادبی تخلیقات، شعروشاعری، جرائد ورسائل کا اجراء اور نشرواشاعت کتب کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لیا جائے تو بحث بڑی طوالانی ہوجائیگی سرسری طور پر اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ گیارھویں صدی ہجری میں جب سندھ میں عبدالحکیم عطا ٹھٹھوی، اُردو ادب کے چراغ روشن کئے ہوئے تھے تو بلوچستان اور سرحد تقریباً خاموش تھے۔ پنجاب چونکہ دلّی کے دوش بدوش چل رہا تھا، اور مرکز سلطنت سے اس کا چولی دامن کا ساتھ تھا لہٰذا اُردو کی پذیرائی وہاں دکن سے زائد نہیں تو کم بھی نہیں ہو رہی تھی۔

اور اُس وقت سے آج تک اُردو کے سلسلے میں لاہور کو اہمیت حاصل رہی ہے۔ تقسیم سے قبل بھی لاہور میں سب سے زائد رسالے چھپتے تھے اور پاکستان بننے کے بعد سے تو وہ نشرواشاعت کا گڑھ بن گیا ہے۔ لہٰذا لاہور سے تو سندھ کے کسی شہر کا مقابلہ ہو نہیں سکتا۔ کراچی کو زیر بحث لایا جائے تو کراچی میں اُردو کے ارتقاء کا سہرا

نئے سندھیوں کے سر بندھ جائے گا۔ بلا شبہ پرانے سندھی قدم قدم پر اُن کے دوش بدوش نظر آئیں گے، لیکن ان کی حیثیت ثانوی ہوگی البتہ حیدرآباد، سکھر، شکارپور اور سندھ کے دوسرے مقامات پر اُردو کا جو کام ہوا یا ہو رہا ہے، وہ قدیم سندھیوں کا کارنامہ ہے جس کو بلوچستان اور سرحد کے معیار پر پرکھا جائے تو سندھ کا پلڑا وزنی معلوم ہوگا۔

اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ پاکستان کے محولہ علاقوں میں اُردو پر توجہ نہیں دی جارہی ہے۔ کام ان علاقوں میں بھی ہوا اور فی زمانہ تو کئی بڑے شاعر و ادیب ان سرزمینوں سے ابھرے ہیں جنہوں نے اُردو ادب پر اپنی چھاپ لگادی ہے لیکن سندھ کے موجودہ دور کے مشاہیر بھی ان سے کم نہیں بلکہ بعض اعتبار سے بڑھے چڑھے ہیں۔

اس طرح ماضی کی طرح سندھ میں اُردو کا حال بھی ہر طرح اطمینان بخش ہے جو ایک روشن مستقبل کی ضمانت بن سکتا ہے۔